فقہ زندگی

آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ

دار الثقلین

فقہ زندگی

از

آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳۳-کراچی ۷۴۶۰۰-پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: فقہ زندگی

اثر: آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ

ترجمہ: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دار الثقلین

طبع اوّل: ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ، دسمبر ۲۰۰۴ء

طبع دوم: رمضان ۱۴۳۰ھ، اگست ۲۰۰۹ء

قیمت: ۱۲۰ روپے

فہرست

عرضِ ناشر ــــــــ ۹

پیش گفتار (از: احمد احمد۔ عادل القاضی) ــــــــ ۱۱

مقدمہ (از: آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ) ــــــــ ۱۹

ا: مسئلۂ تقلید کا تاریخی پس منظر ــــــــ ۲۱

مسئلۂ تقلید کا تاریخی پس منظر ــــــــ ۲۲

تقلید کی شرائط ــــــــ ۲۶

زندہ مرجع کی تقلید ــــــــ ۲۷

فقہی ارتقا میں رکاوٹ ــــــــ ۳۰

اَعلم کی تقلید ــــــــ ۳۲

تقلید میں تبعیض کا جواز ــــــــ ۳۶

مرجع کی صفات ــــــــ ۳۹

مرجع کے مقابل مقلدین کے فرائض ــــــــ ۴۰

مشہور کی مخالفت ———— ۴۳
عناوین ثانوی ———— ۴۶
جدید فقہی نظریات میں ردو بدل ———— ۴۸
استنباط کے مصادر ———— ۴۹
شرعی گنجائشیں ———— ۵۰
۲: طہارت ونجاست کے احکام ———— ۵۳
طہارت ونجاست کے احکام ———— ۵۴
جاری پانی ———— ۵۷
۳: کنبے اور گھرانے کے احکام ———— ۶۱
کنبے اور گھرانے کے احکام ———— ۶۲
والدین کی اطاعت ———— ۶۲
ولی کی رضامندی ———— ۶۵
تربیت اور آزادی ———— ۶۹
عورت کا بناؤ سنگھار ———— ۷۲
مصنوعی بالوں سے حجاب ———— ۷۳
رقص وموسیقی ———— ۷۴
خانگی تعلقات ———— ۷۵
بچے کو جسمانی سزا دینا ———— ۸۱
بیوی کو زدوکوب کرنا ———— ۸۹
بیوی کی خواہش کو پورا کرنا ———— ۹۲
بچوں کی خرید وفروخت ———— ۹۲
بیوی کو طلاق کا حق ———— ۹۴

بوڑھی عورتوں کے مسائل ———— ۹۶
عقدِ متعہ ———— ۹۶
عورت کا متعدد شوہر رکھنا ———— ۹۸
۴: ہجرت (امیگریشن) کے احکام ———— ۱۰۵
ہجرت (امیگریشن) کے احکام ———— ۱۰۶
۵: مطبوعات کے احکام ———— ۱۱۵
مطبوعات کے احکام ———— ۱۱۶
۶: بازار کے احکام ———— ۱۲۱
بازار کے احکام ———— ۱۲۲
ذبیحے اور گوشت فروخت کرنے کے احکام ———— ۱۲۷
مالکِ مکان اور کرایہ دار ———— ۱۲۸
بیمہ کمپنیاں ———— ۱۳۲
۷: سماجی وسیاسی تعلقات کے احکام ———— ۱۴۱
سماجی وسیاسی تعلقات کے احکام ———— ۱۴۲
جنسِ مخالف سے دوستی ———— ۱۴۳
اہلِ کتاب کے ساتھ تعلقات ———— ۱۴۵
تنظیموں سے ربط وتعلق ———— ۱۴۵
غیر اسلامی جماعتوں سے روابط وتعلقات ———— ۱۶۸
اسلام پرستوں کے درمیان باہمی تعاون کی بنیادیں ———— ۱۶۹
کل کے دشمن آج کے دوست ———— ۱۷۲
امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ تعلقات ———— ۱۷۸
عادل حکومت کی خصوصیات ———— ۱۸۰

حکومتی قوانین کی مخالفت اور اسکے اموال میں تصرف ——— ۱۸۲

۸: طبابت (علاج معالجے) کے احکام ——— ۱۸۵

طبابت (علاج معالجے) کے احکام ——— ۱۸٦

پوسٹ مارٹم ——— ۱۹۲

اعضا کو عطیہ کرنا ——— ۱۹۳

کلوننگ ——— ۱۹۷

۹: فن اور ہنر کے احکام ——— ۲۰۳

فن اور ہنر کے احکام ——— ۲۰۴

مجسمہ سازی اور مصوری ——— ۲۰۷

فنکاروں کا پرستار (fan) ہونا ——— ۲۰۹

فلاحی مقاصد کیلئے پروگراموں کا انعقاد ——— ۲۱۰

فنکار خواتین اور پردہ ——— ۲۱۰

طرب وغنا ——— ۲۱۳

اسلامی تاریخی واقعات پر مبنی ڈراموں کی تیاری ——— ۲۱۷

کھیل کود کے احکام ——— ۲۲۳

تقاریب اور اجتماعات کے احکام ——— ۲۲۹

سالگرہ کا جشن ——— ۲۳۴

ایامِ عید ——— ۲۳۷

۱۰: جنسی امور کے احکام ——— ۲۴۵

جنسی امور کے احکام ——— ۲۴٦

جنس کی تبدیلی ——— ۲۵۳

کنوار پن ——— ۲٦٦

ازدواجِ موقت (متعہ) ــــــــــ ۲۶۷
متعہ اور قانونی زنا ــــــــــ ۲۷۱
۱۱: ادبیات کے احکام ــــــــــ ۲۷۳
ادبیات کے احکام ــــــــــ ۲۷۴
یاس و ناامیدی پر مبنی ادب ــــــــــ ۲۷۴
شعر و شاعری ــــــــــ ۲۷۹
۱۲: انتخابات کے احکام ــــــــــ ۲۸۹
انتخابات کے احکام ــــــــــ ۲۹۰
۱۳: ورزش اور کھیل کود کے احکام ــــــــــ ۳۰۱
ورزش اور کھیل کود کے احکام ــــــــــ ۳۰۲
۱۴: شعائر کے احکام (مذہبی رسوم و اجتماعات کے احکام) ــــــــــ ۳۱۳
شعائر کے احکام (مذہبی رسوم و اجتماعات کے احکام) ــــــــــ ۳۱۴
مصائبِ اہلِ بیتؑ پر گریہ و زاری ــــــــــ ۳۱۴
امام حسینؑ کا دستر خوان ــــــــــ ۳۱۷
جلوسِ عزا ــــــــــ ۳۱۸
خطابت کا مواد اور انداز ــــــــــ ۳۱۹
زیارت ــــــــــ ۳۲۴
۱۵: عقائد سے متعلق مسائل ــــــــــ ۳۲۹
عقائد سے متعلق مسائل ــــــــــ ۳۳۰
عصمت کے بارے میں ہمارا موقف ــــــــــ ۳۳۰
عصمت پر اعتراضات کے جواب ــــــــــ ۳۳۴
حضرت فاطمہؑ کی عصمت ــــــــــ ۳۴۰

ائمہ علیہم السلام کا کردار ——— ۳۴۳
شیعیت اور مذہب جعفری ——— ۳۴۶
ضمیمہ (۱) ——— ۳۵۴
ضمیمہ (۲) ——— ۳۵۷

عرضِ ناشر

حرکت زندگی کی علامت ہے، اور اسلام دین زندگی۔ اسلام کا مقصد زندگی کو الٰہی رخ دینا اور اسے خدا کی پسند کے مطابق بنانا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں پوری انسانی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے، اسکے ہر پہلو کے لئے اصول وقوانین فراہم کئے گئے ہیں اور ان میں انسان کی تمام ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

انسانی زندگی میں ہر دم نئے مسائل، نئی پیچیدگیاں اور راورنت نئے سوالات جنم لیتے ہیں، جبکہ قرآن وسنت کی نصوص محدود ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جانب سے متحرک زندگی کی مسلسل رہنمائی کے لئے اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مجتہد آیاتِ قرآنی کے فہم وادراک اور احادیثِ معصومینؑ میں غوروفکر کے ذریعے نو پیدا شدہ مسائل کے لئے احکام کا استنباط (استخراج) کرتا ہے۔

لہٰذا مجتہد کے لئے لازم ہے کہ وہ قرآن وسنت پر عبور کے ساتھ ساتھ معاشرے کے چلن، اُس میں اٹھنے والے مسائل اور اُسکی ضروریات پر مسلسل نظر رکھے اور زندگی کے ہر

میدان میں اسلامی تعلیمات کے مطابق انسانوں کی رہنمائی کا اہتمام کرے۔

آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ کا شمار ایسے ہی مجتہدین میں ہوتا ہے۔ آپ اُس دور میں نجفِ اشرف میں شہید سید محمد باقر الصدر علیہ الرحمہ کے قریبی ساتھیوں اور اُن کے ہمراہ و ہمرکاب رہنے والوں میں سے ہیں جس دور میں شہید صدرؒ عراق میں اسلام کی اجتماعی اور سیاسی تعلیمات کی اساس پر ایک فکری اور سیاسی تحریک کی داغ بیل ڈال رہے تھے، جس کا مقصد اسلام کو مساجد و مدارس کی چہار دیواری سے نکال کر معاشرے میں رائج اور نافذ کرنا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں لبنان آجانے کے بعد آقائے فضل اللہ نے وہاں کئی جوان نسلوں کو اسلام کی انقلابی تعلیمات سے روشناس کرایا اور بعد ازآں حزب اللہ لبنان کی بنیاد رکھی۔

دورِ حاضر میں اٹھنے والے نت نئے مسائل کے بارے میں اسلامی موقف کی توضیح و تشریح اور امتِ اسلامیہ کے خلاف استعمار کی فکری، ثقافتی اور سیاسی ریشہ دوانیوں پر کڑی نگاہ اور اُن کی چارہ جوئی کے لئے اقدامات آقائے فضل اللہ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مسائل کو ایک وسیع افق (large horizon) سے دیکھتے ہیں، اس دوران بہت سے جوانب آپ کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر خاص کر جب آپ کسی ایسے مسئلے کا حل بیان کرتے ہیں جو مسلمانوں کی اجتماعیت سے تعلق رکھتا ہے، تو اس میں اسلام و مسلمین کی عظیم مصلحت اور مفاد بھی آپ کے پیش نظر ہوتا ہے۔

زیرِ نظر تالیف، جو مختلف موضوعات پر آقائے فضل اللہ کی خدمت میں پیش کئے گئے سوالات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے، اس میں آپ کی مذکورہ تمام خصوصیات موجزن نظر آتی ہیں۔ امید ہے قارئین مطالعے کے بعد اپنے تاثرات، مشوروں اور قیمتی رہنمائی سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش گفتار

از: احمد احمد۔ عادل القاضی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف طریقے اختیار کر کے مسلمانوں کو عقیدے اور شریعت سے متعلق مسائل کے بارے میں سوال کرنے اور ان کے جواب دریافت کرنے کی ترغیب دی۔ ان طریقوں کو دو اقسام' براہِ راست اور بالواسطہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا: براہِ راست طریقہ

الف: احکام بیان کرنا:۔ کبھی کبھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' خود ہی سے' بنا کسی کے سوال کئے' یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کو اِس دینی حکم یا تعلیم کی ضرورت ہے' اُسے اِن کے سامنے بیان کردیا کرتے تھے۔ درجِ ذیل روایات اِسی طرح بیان کی ہوئی ہیں: **خیر کم خیر کم لعیاله و انا خیر کم لعیالی** (تم میں افضل ترین شخص وہ ہے جو اپنے گھرانے کے ساتھ بہترین اخلاق سے پیش آتا ہو اور میں تم سب میں اپنے گھرانے سے سب سے بہتر انداز سے پیش آتا ہوں) نیز آپ کا یہ ارشاد کہ: **المسلم من سلم المسلمون من یده و لسانه** (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے

مسلمان محفوظ ہوں)

ب: سوال اٹھانا:- کبھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف موضوعات کے بارے میں مسلمانوں کے اذہان کو متوجہ کرنے کی غرض سے کوئی سوال اٹھاتے تھے۔ تاکہ ان مسائل کے بارے میں وہ سوچ بچار کریں' یا ان کا مافی الضمیر سامنے آئے۔ آنحضرتؐ نے اس قسم کے بکثرت سوال اٹھائے۔ مثلاً فرمایا کہ: اتدرون من المُفلس ؟ (کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟) یا فرمایا کہ: ای الاعمال احبُّ الیٰ اللہ؟ (کیا تمہیں معلوم ہے کہ خدا کی نظر میں کونسا عمل پسندیدہ ہے؟)

ہمیں سیرتِ نبویؐ میں سوال کرنے کی ترغیب کے اور طریقے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ احادیث ملاحظہ ہوں: ثلاثة یؤجرون: السائل' والمسؤول' والمستمع الیهما (تین افراد کو ثواب ملے گا۔ ایک سوال کرنے والے کو' دوسرا جس سے سوال کیا جائے اُسے اور تیسرا وہ جو اس گفتگو کو سنے) العلمُ صناديق مقفلة مفاتيحها الاسئلة (علم مقفل (locked) صندوق ہیں اور اُن کی کلید (key) سوال ہے)

۲: بالواسطہ طریقہ

الف: سوالوں کے جواب دینا:- مسلمان' پیغمبر اسلامؐ سے زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں جو سوال کیا کرتے تھے' اُن کے جواب دیتے ہوئے پیغمبرؐ چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی مستفید ہوں۔ لہٰذا جب کبھی کوئی آپؐ سے سوال دریافت کرتا' تو آپؐ اس انداز سے اُسکا جواب دیتے کہ دوسرے بھی سنیں اور استفادہ کریں۔

قرآنِ کریم نے ان میں سے بعض سوالات کا ذکر کیا ہے' مثلاً: یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ (یہ آپ سے محترم مہینوں میں جنگ کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۷) یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ (یہ آپ

سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۹)
وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ (یہ لوگ آپ سے ایامِ حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۲۲) یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ (یہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اُن کیلئے کیا حلال کیا گیا ہے۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۴)

اِسی قسم کے اور دوسرے سوالات جن کے قرآنِ مجید نے جواب دیئے ہیں اور ان کے ضمن میں علمی حقائق جاننے کے سلسلے میں سوال کی اہمیت کی جانب متوجہ کیا ہے۔

ب: تقریر (تائید):۔ جس کسی کام کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توثیق کی ہے' یا آنحضرتؐ نے اپنے سکوت سے اسکی تائید فرمائی ہے اور بعد میں اس میں کوئی ردو بدل بھی نہیں کیا ہے' وہ سنتِ رسولؐ میں سے ہے' اسی بنا پر میراثِ نبویؐ اس قدر وسیع ہے۔

معصوم کے فعل' قول اور تقریر (تائید) کو سنت کہا جاتا ہے۔ سنت کے یہ تینوں حصے فقہی نکتۂ نظر سے ''شریعت'' ہیں۔ البتہ ان کی تشریع کے زمانے کے بعد مسلمانوں کو آنحضرت کی حقیقی سنت کے بارے میں بحث و گفتگو اور تحقیق و چھان بین کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اِس میں بہت زیادہ کمی بیشی' تحریف اور جعل سازی ہوئی ہے۔

ابتدائی زمانے کے مسلمانوں نے اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے کو یوں ہی نہیں چھوڑا۔ بلکہ پیغمبرؐ یا اُن کے اہلِ بیتؑ سے اِس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں دریافت کیا۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ وہ انتہائی باریک اور چھوٹے چھوٹے مسائل' جو بسا اوقات شرم آمیز ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے خیال میں جن کے بارے میں سوال کرنا تک مناسب نہیں ہوتا' وہ بھی ائمۂ معصومینؑ کی احادیث وروایات میں ملتے ہیں۔

فقہ' جیسا کہ اسکی وسعت سے بھی دکھائی دیتا ہے کوئی محض ایک باب نہیں ہے' بلکہ رسالہ ہائے عملیہ میں نظر آنے والی باتوں کے برخلاف صرف دو ابواب یعنی عبادات اور معاملات تک بھی منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح نماز اور روزے کی اپنی مخصوص فقہ ہے اسی طرح سیاست بھی اپنی مخصوص فقہ رکھتی ہے' اور جس طرح شادی اور طلاق کے معاہدے فقہ کا

حصہ ہیں اسی طرح بین الاقوامی تعلقات اور اقتصادی نظام بھی فقہ میں شامل ہیں۔ اور خرید و فروخت کی مانند راہِ خدا میں جہاد بھی فقہ کے دائرے میں آتا ہے۔

کیونکہ سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شریعت خاتم الشرائع ہے' لہٰذا اسکے تقاضوں اور ضرورتوں میں سے ہے کہ یہ محکم' وسیع اور آسان ہو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت سے قبل ہی خدا نے اپنے دین کو کامل کر دیا تھا اور اپنی نعمت کو تمام کر دیا تھا اور اسلام کو اُن کی امت کے دین کے بطور پسند فرمایا تھا۔

اِس نکتے کو پیغمبر اسلامؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کے گوش گزار کیا کہ:

مامن شیء یقرّبکم من الجنة ویبعدّ کم من النار الّا وامر تکم به' ومامن شیء یقرّبکم من النار ویبعّدکم عن الجنّة الّا و نهیتکم عنه (جو چیز بھی تمہیں جنت سے نزدیک اور جہنم سے دور کرتی ہے' میں نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے اور جو چیز بھی تمہیں آتش جہنم سے نزدیک اور جنت سے دور کرتی ہے میں نے تمہیں اس کی ممانعت کی ہے)

نیز آپؐ ہی نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ: حلال محمّد حلال الیٰ یوم القیامة' وحرام محمّد حرام الیٰ یوم القیامة (حلالِ محمدؐ تا قیامت حلال ہے اور حرامِ محمدؐ تا قیامت حرام)

البتہ کبھی کبھی عناوین اوّلی پر عناوین ثانوی اثر انداز ہو کر اسکے حکم کو حلال سے حرام یا حرام سے حلال میں بدل دیتے ہیں۔ احکامِ ثانویہ انسانوں کی عمومی مصلحت کے دائرے میں وجود میں آتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ فقہا نے کہا ہے' شرع کی حدو سرحد انسان کی قدرت ہے۔ جس نکتے پر انسان کی "قدرت" ختم ہو جاتی ہے وہاں حکمِ شرع بھی متوقف ہو جاتا ہے۔ شیخ انصاریؒ نے اپنی کتاب مکاسب میں آیتِ قرآن: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (۱) سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خداوند عالم نے مضطر (ہنگامی صورتحال میں

۱۔ اگر کسی کو ہنگامی صورتحال درپیش ہو جائے اور وہ حرام کا طلبگار اور ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا نہ ہو' تو اسکے لئے کوئی گناہ نہیں ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۷۳)

مبتلا شخص) کے لئے ہر چیز کو حلال قرار دیا ہے۔

لہٰذا احکامِ اولیہ کے ثبات سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ مطلق ہیں۔ مجتہدین نئے پیدا شدہ حالات وظروف (conditions) کو سمجھتے ہوئے تشخیص دیتے ہیں کہ حکمِ اوّلی کو جاری رکھا جائے گا یا موضوع پر نیا اور تبدیل شدہ حکم لگایا جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو بابِ اجتہاد بہت جلد ہی بند ہو جاتا۔

شریعتِ اسلامی کا ایک اہم وصف اجرا کے مرحلے میں اسکا سہل اور آسان ہونا ہے۔ خدا نے اپنے پیغمبرؐ پر وحی کی ہے کہ: **مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ** (دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی وزحمت نہیں رکھی ہے۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۷۸)۔ پیغمبر گرامیؐ نے بھی اس نکتے کو ایک دوسرے انداز سے بیان فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: **جئتكم بالشريعة السهلة السمحة** (میں تمہارے لئے سہل اور آسان شریعت لے کے آیا ہوں)

البتہ شریعت کا مقصد، مومن کے اندر تقویٰ کا بیج بونا ہے۔ کسی شرعی قانون پر عمل فی نفسہ مطلوب نہیں ہے، اسے صرف اسلئے اہمیت حاصل ہے کہ وہ تقویٰ کا مقدمہ ہے۔ مثلاً **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** (تم پر روزے اسی طرح فرض کر دیئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے والوں پر فرض کئے گئے تھے، شاید تم ان کے ذریعے متقی ہو جاؤ۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۳)

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اے انسانوں! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے آنے والوں کو بھی پیدا کیا ہے، شاید تم اسی طرح پرہیز گار بن جاؤ۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱)

اگر چہ احکامِ شرعی کا استنباط واستخراج ان کے دلائل کے ذریعے کیا جاتا ہے اور فقیہ کا حکم اور فتویٰ معین بنیادوں اور اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔ لیکن تمام احکام کے علل واسباب عیاں نہیں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کبھی کسی عمل کو انجام دینے یا کسی عمل کو ترک کرنے کا حکم مقلد کے لئے باعثِ تعجب ہو۔ اگر چہ مقلد خدا کی اطاعت اور اسکے تقرب کے حصول کے

لئے اس حکمِ شرعی پر عمل پیرا ہولیکن ایسی صورتوں میں اکثر مواقع پر ابہام کم کرنے اور ان احکامات کے متعلق علم فراہم کرنے کا امکان موجود دکھائی دیتا ہے۔

ایسے ہی سوالات اور ان کے احکام کی وضاحت کے لئے ہم نے اپنی تجویز ایک ایسی ہستی کی خدمت میں پیش کی جس کے دینی مرجع ہونے سے سالہا سال قبل ہی امتِ اسلامی اُس سے رجوع کیا کرتی تھی، وہ جو فقہی مسائل پر بحث اور ان کی تدریس کے علاوہ فکر وشعور اور حرکت وعمل کے کارواں میں بھی شامل ہے، اور جس وقت اُس نے لوگوں کے اصرار پر مرجعیت کو قبول کیا، تو عام مقلدین نے بڑھ چڑھ کر اُسے پذیرائی دی۔

آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ کا بہت سے دوسرے علما ومراجعین پر امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے فقہ کو صرف معروف فقہی کتب کے متن سے حاصل نہیں کیا بلکہ اسے حقیقی زندگی، لوگوں کی ضروریات، ان کی توجہات اور ان کی مشکلات اور دکھوں (کہ وہ ان کے نزدیک زندگی بسر کرتے ہیں) سے حاصل کیا ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ دام برکاتہ کی خدمت میں ہم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ فقہی رائے بیان کرتے ہوئے صرف حلال ہے یا حرام ہے کے بیان پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ احکام (بالخصوص خلافِ مشہور احکام) کے بعض دلائل اور اصولوں کے بارے میں فقہی تعلیمات بھی قارئین کے سامنے پیش کی جائیں۔

ہمارے کام کا ابتدائی خاکہ یہ تھا کہ یہ سوالات مخصوص عناوین کی صورت میں کچھ اخبارات میں شائع کئے جاتے۔ رفتہ رفتہ مزید عناوین کا اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں ان کی تدوین کا احساس ہونے لگا۔ بہرصورت ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے زندگی کے تمام شعبوں اور میدانوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ نیز یہ ادعا بھی نہیں کرتے کہ مذکورہ عناوین کے ذیل میں پیش کئے جاسکنے والے تمام مسائل کو اس کتب میں بیان کردیا گیا ہے۔ بلکہ ہماری خواہش صرف یہ ہے کہ یہ کتاب اس قسم کی دوسری زیادہ مفصل اور مکمل کتب کی تیاری کے لئے ایک نیا باب ثابت ہو۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انسانی زندگی میں فقہی آراء ونظریات کی وضاحت کی دعوت ہوگی، مقلدین کی جانب سے بھی اوران مجتہدین کی جانب سے بھی جواس قسم کی وضاحتوں کواپنے رسالۂ عملیہ میں بیان نہیں کرتے۔

احمد احمد۔ عادل القاضی

مقدمہ

از: آیت اللہ العظمٰی سید محمد حسین فضل اللہ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سیدنا محمّد وآلہ الطیبین الطاہرین وصحبہ المنتجبین والتابعین لھم باحسان الیٰ یوم الدین، وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین.

و بعد :

عزیز افاضل جناب استاد احمد احمد اور استاد عادل القاضی نے ہمیں ایک ایسی تفصیلی گفتگو پر راغب کیا جس کے ذریعے کچھ ان شرعی مسائل پر روشنی ڈالی جائے جو روزمرہ زندگی میں لوگوں کو پیش آتے ہیں لیکن جن کا ذکر رسالہ ہائے عملیہ میں یا تو سرے سے ہوا ہی نہیں ہے یا مجمل انداز میں ہوا ہے۔ ہم نے مومنین کے لئے اس طرح کے مسائل سے فکری اور عملی شناسائی کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، بالخصوص اپنے مقلدین کی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے ان کی اس تجویز کو قبول کیا۔

اس گفتگو کے دوران ہم نے کوشش کی ہے کہ پیش کردہ سوالات کے جواب دیتے ہوئے سنّتی (tradational) انداز سے دور رہیں۔ لہٰذا کہیں تو احکامِ شریعت کے اسرار کی تحلیل اور ان کی تفصیل کے ساتھ جوابات دیئے گئے ہیں اور کہیں احکام کے دلائل کا تذکرہ

کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ کتاب ایک رخ سے فقہی اور فتوائی پہلو اور دوسرے رخ سے اسلام کے فکری پہلو کی جامع ہے۔

البتہ اگر قاری اس کتاب میں جنسی مسائل کے جوابات روایتی طور پر دیئے جانے والے جوابات سے مختلف محسوس کرتا ہے' تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے فقہا نے اس قسم کے مسائل کو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دینی تعلیمات میں جنسی مسئلہ کوئی معیوب اور بُری بات نہیں سمجھا جاتا۔

اسی طرح فقیہ کی ذمے داری ہے کہ وہ لوگوں کو پیش آنے والے اور ان کے لئے پیچیدگیاں پیدا کرنے والے مسائل کا جائزہ لے کر انہیں حل کرے۔ بالخصوص ہمارے اس دور کے تمام افراد زن و مرد' بوڑھے اور بچے' جنسی مسائل کے علمی پہلو پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ صورتحال علمائے دین اور فقہا سے تقاضا کرتی ہے کہ اس مسئلے کو علمی گہرائی کے ساتھ پیش کریں' اسے اسلامی اخلاق سے ہم آہنگ کریں' اور جہاں اس کے بارے میں آگہی دینے کی ضرورت محسوس ہو وہاں اسکا جائزہ لیں اور اسے حل کریں۔

آخر میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس کتاب میں گفتگو کی صورت میں ہم نے اپنی جن فقہی آراء کو بیان کیا ہے' وہ ہمارے فقہی فتاویٰ شمار ہوتے ہیں اور ہمارے مقلدین ان پر عمل کے ذریعے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ انشاءاللہ۔

وہ دو عزیز افاضل جنہوں نے اس گفتگو کا اہتمام کیا اور اسے جمع و ترتیب دینے کی ذمے داری قبول کی' ہم اُن کی اِن زحمتوں پر اُن کے شکر گزار ہیں اور اُن کے لئے خداوند عالم سے زیادہ سے زیادہ جزا اور اسلام و مسلمین کی مزید خدمت کی توفیق کے طلبگار ہیں۔ واللہ ولی التوفیق وھو حسبنا و نعم الوکیل.

محمد حسین فضل اللہ

ذوالحجہ ۱۴۱۷ھ

۱

مسئلہ تقلید کا تاریخی پس منظر

مسئلہ تقلید کا تاریخی پس منظر

سوال: بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ تقلید ایک نیا مسئلہ ہے' جس کا ذکر فقہی کتب میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اعمال اور معاملات کی صحیح انجامدہی کیلئے (مجتہد کی) تقلید ضروری نہیں۔ اس دعوے کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اس دعوے میں کوئی گہرائی دکھائی نہیں دیتی۔ اسلئے کہ تقلید تو فطری مسائل میں سے ہے اوراس کی ضرورت وہ تمام افراد محسوس کرتے ہیں جو میدانِ حیات میں اپنی براہ راست اور بالواسطہ ذمے داریوں کا علم نہیں رکھتے۔ ایسے افراد رہنمائی کے حصول کیلئے از خود فطری طور پر ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جو ان کو درپیش مسائل کے ماہر ہوں۔ تاکہ اگر ان سے اپنے فیصلے کی حجت اور عذر دریافت کیا جائے تو بتا سکیں۔

ہمیشہ ہی مسلمانوں کے درمیان ایسے بہت سے لوگ رہے ہیں جو اسلامی احکام کا وسیع علم نہیں رکھتے' بلکہ یہ ایک قدرتی سی بات ہے۔ اسلام جس پر مسلمان عقیدہ رکھتے ہیں اس نے قطعی طور پر انسان کو پروردگارِ عالم کے سامنے جوابدہ قرار دیا ہے اور اُسے اِس دین کی حدود میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے کا مکلّف قرار دیا ہے۔ کیونکہ اسے بارگاہِ الٰہی میں ان امور کا جواب دینا ہے جن کی انجام دہی کا خدا نے اُسے حکم دیا ہے یا جنہیں انجام دینے

سے اُسے روکا ہے۔اور جواب میں لازماً یا تو اسے اپنے اعمال کی دلیل پیش کرنا ہوگی یا کم از کم ان کا عذر اسے پیش کرنا پڑے گا۔

یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس روش کی بنیاد پر جس پر ان کی تربیت ہوئی ہے اور جس پر ان کی عادت استوار ہے اس قسم کے مسائل میں اپنے علما سے رجوع کرتے ہیں۔ حیاتِ پیغمبرؐ میں لوگ آنحضرتؐ سے رجوع کرتے تھے کیونکہ آنحضرتؐ صاحبِ رسالت اور اُس دور میں دین کے تمام امور سے آگاہ ترین فرد تھے۔ وہ تمام آیاتِ قرآنی جن میں یَسْـئَلُوْنَکَ (آپ سے پوچھتے ہیں) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' ان سے واضح ہے کہ مسلمان قدرتی طور پر اور از خود پیش آمدہ مسائل و مشکلات اور علمی ضروریات کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتے تھے۔

قرآنِ مجید' اُن افراد پر تنقید و اعتراض کرتے ہوئے' جو بغیر کسی دلیل اور حجت کے دعوتِ حق قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں' اس فطری مسئلے پر تاکید کرتا ہے کہ: فَسْـئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اگر تم نہیں جانتے' تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۴۳)

ایک دوسرے مقام پر جب قرآنِ مجید لوگوں کے ایک گروہ کے میدانِ جہاد سے دور رہنے کی ضرورت کا تذکرہ کرتا ہے تو اسکی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (تاکہ علم دین حاصل کرے اور پھر جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے عذابِ الٰہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اسی طرح ڈرنے لگیں۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۲)

اس طرح کی رہنمائی (guidance) کا عوامی زندگی پر مثبت اثر لازم ہے' کیونکہ پروردگارِ عالم چاہتا ہے کہ علما اور دینی امور کی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد' لوگوں کو متنبہ کریں' ان تک دین کا پیغام پہنچائیں' جو ان کے اذہان کو دین کے بارے میں یکسو اور مطمئن کرنے کا باعث ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے مسلمان، فقہی مسائل سے ایک حد تک آگاہ وآشنا اصحابِ رسولؐ سے دینی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ یہ معمول دورِ ائمہؑ تک جاری رہا۔ ائمۂ اطہارؑ اپنے گھروں یا مسجدوں میں خاص اس مقصد کیلئے نشست کیا کرتے تھے کہ لوگ مختلف (عقیدتی اور شرعی) میدانوں میں اپنے مسائل کے بارے میں ان سے سوال کر کے، ان کے جواب حاصل کریں۔ احکامِ شرع کے بیان پر مشتمل ہم تک پہنچنے والی ائمۂ اہلِ بیتؑ کی زیادہ تر احادیث وروایات، کسی فقہی قاعدے اور اسکی تشریح وتفصیل کو گفتگو کا محور بنانے سے زیادہ سوال وجواب کی صورت میں ہیں۔

شیعوں کا بھی یہ دستور رہا ہے کہ وہ اصحابِ ائمہؑ کی خدمت میں اپنے شرعی مسائل پیش کیا کرتے تھے، اور اس عمل نے تقلید کی بنیاد ڈالی۔ غیبتِ کبریٰ کے بعد بھی شیعوں نے علما کی طرف رجوع کرنے کی اس روش کو جاری رکھا۔ اس روش کو امامِ زمانہؑ کے اس قول سے مزید تقویت ملی کہ: **واما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها الىٰ رواة أحاديثنا فإنهم الحجة عليكم** (پیش آمدہ حوادث کے موقع پر ہماری احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو، کہ وہ تمہارے لئے حجت ہیں۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۷۔ ص ۱۴۰۔ روایت ۳۳۴۲۴)

ایک اور روایت، جس کے حجیت اور دلالت کے لحاظ سے مقبول ہونے کے باوجود بعض لوگ اس پر نزاع کھڑا کرتے ہیں، اس میں فرمایا گیا ہے کہ: **من كان من الفقهاء صائناً لنفسه، حافظاً لدينه، مخالفاً لهواه، مطيعاً لأ مر مولاه فللعوام ان يقلدوه** (فقہا کے درمیان جو شخص پرہیز گار، اپنے دین کا محافظ، اپنی نفسانی خواہشات کا مخالف اور احکامِ الٰہی کا مطیع وفرمانبردار ہو، تو لوگوں کو چاہئے کہ اس کی تقلید کریں۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۲۷۔ ص ۱۳۱۔ روایت ۳۳۴۰۱)

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ اپنے زمانے کے علما سے رجوع کیا کرتے تھے۔ لیکن جس طرح آج نظر آتا ہے کہ تمام شیعہ یا ان کا ایک بڑا گروہ کسی ایک مرجع سے رجوع کرتا ہے،

ایسی بڑی اور وسیع دینی مرجعیت کا وجود (اُس دور میں) واضح نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے کے حالات ایک شخص کے شیعوں سے اس قدر وسیع روابط کے قیام کیلئے سازگار نہ تھے، اور ان حالات نے شیعوں کے لئے اپنے تمام امور و معاملات میں، تمام علما سے رجوع کرنے کو غیر حقیقی اور غیر ممکن بنا دیا تھا۔

لہٰذا شیعہ اپنے اپنے علاقوں کے علما سے رجوع کرتے تھے اور کچھ چوٹی کے شہرت یافتہ شیعہ علما جیسے شیخ مفیدؒ اور سید مرتضیٰؒ سے، دور دراز رہنے والے شیعہ بھی استفادہ کرتے تھے اور ان کی خدمت میں اپنے سوال پیش کرتے اور ان کے جواب پاتے تھے۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ کی کتب میں ہمیں ''المسائل الطرابلسیہ'' نامی کتاب بھی نظر آتی ہے جو ''طرابلس'' میں رہنے والے شیعوں کے سوالات اور شیخ مفیدؒ کے جوابات پر مشتمل ہے، اسی طرح سید مرتضیٰ علیہ الرحمۃ کی کتب سوالات کے جوابات پر مشتمل ہیں۔ البتہ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس زمانے میں ''اعلیٰ اور ہمہ گیر مرجعیت'' نامی کوئی چیز موجود تھی، جو آئندہ ادوار میں بھی جاری رہی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مسئلۂ تقلید کی صورت یہ تھی کہ ایران سے تعلق رکھنے والے شیعہ ایرانی علما سے رجوع کرتے تھے اور عراق و لبنان کے شیعہ اپنے ممالک کے علما سے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ علما میں سے کوئی ایک عالم غیر معمولی شخصیت کا حامل ہو جاتا اور لوگ اس کی طرف رجوع کرنے لگتے، لیکن اسکے ساتھ ساتھ وہ لوگ اس بات کے پابند نہیں ہوتے تھے کہ ہر مسئلے میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ بلکہ صرف اضطراری اور اسی طرح کے حالات میں اس کی رائے دریافت کرتے تھے۔ اس بنیاد پر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اگرچہ تاریخ کے اُس دور میں شیعی مرجعیتِ اعلیٰ کا وجود نہ تھا، البتہ تقلید موجود تھی۔ کیونکہ جاہل کے عالم کی جانب رجوع کرنے کی بنیاد پر انسانی زندگی میں تقلید ایک فطری اور طبیعی بات ہے۔

تقلید کی شرائط

سوال: لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تقلید کا موضوع ایک کلی عنوان ہے، جس میں فروعات اور مرجع کی شرائط، جیسے اسکی اعلمیت، حیات، عدالت اور اسکا مرد ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ کیا ان شرائط کا ماخذ عقل ہے، یا یہ ابوابِ فقہ کے فطری ارتقا کا نتیجہ ہیں؟

جواب: آج کے دور کے برخلاف، جس میں علما مسئلۂ تقلید پر بہت زیادہ بحث و گفتگو کرتے ہیں، زمانۂ گزشتہ میں یہ موضوع کوئی خاص پیچیدگی نہیں رکھتا تھا۔ اس زمانے کے لوگ فطری انداز میں ازخود زندہ یا مردہ یا اعلمِ مطلق اور غیر اعلم کے فرق کو ملحوظ رکھے بغیر اپنے علما سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اور صرف اسی بات پر اکتفا کیا کرتے تھے کہ جس شخص کی یہ لوگ تقلید کر رہے ہیں وہ مجتہد امورِ شریعت کا عالم اور درگاہِ الٰہی میں بطورِ حجت پیش کئے جانے کے قابل ہے۔ اور کبھی وہ بقا بر تقلیدِ میت کے عنوان سے نہیں بلکہ ابتدا ہی سے مردہ عالم کی آراء سے رجوع کرتے تھے۔ تاریخی ماخذ سے پتا چلتا ہے کہ شیخ طوسیؒ کا فقہی مکتب، اس اثر کے اعتبار سے جو انہوں نے اپنے شاگردوں پر مرتب کیا تھا ان کے بعد بھی صدیوں جاری رہا۔ ظاہر ہے صرف آپ کے شاگرد ہی آپ کی اجتہادی آراء کی پابندی نہیں کرتے تھے بلکہ شیخ کی فقہی آراء کے عوامی افکار اور زندگیوں پر غلبے کی وجہ سے لوگ عملاً ان کی آراء کے پابند تھے۔

لہٰذا اس دور کے لوگوں کے حالات پر غور و خوض سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُس زمانے میں زندہ یا مردہ عالم اور اَعلم یا غیر اَعلم کی جانب رجوع کرنے کے سلسلے میں کوئی مشکل درپیش نہ تھی۔ مرجعیتِ اعلیٰ کے تصور کی بنیاد پر اعلمیت کا مسئلہ تازہ اور نئی بات ہے۔ البتہ ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ کسی فقیہ نے اعلمیت کے مسئلے پر گفتگو نہیں کی ہے۔ بلکہ جس انداز سے آج یہ مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے اس صورت سے (گزشتہ ادوار میں) اس پر بحث کا رواج نہ تھا۔

ہمارے خیال میں مسئلۂ تقلید لوگوں کیلئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ لوگ انتہائی سادہ

اور فطری طور پر اس سے سروکار رکھتے تھے۔ بالکل ''نیت'' کے مسئلے کی طرح کہ گزشتہ زمانے کے فقہا نے اس پر بحث و گفتگو نہیں کی ہے بلکہ یہ مسئلہ بعد کے فقہا جن میں شہیدِ ثانیؒ بھی شامل ہیں کی طرف سے زیرِ بحث آیا ہے۔ نیت کا مسئلہ انتہائی سادہ مسائل میں سے ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی انسان بغیر نیت کے خدا کی عبادت کرے۔ یہاں تک کہ اگر ہم انسان کو اس بات کا پابند کریں کہ وہ بغیر نیت کے خدا کی عبادت بجالائے، تو ایسا کرنا محال ہوگا۔

ہم جانتے ہیں کہ عبادت میں نیت کا مسئلہ قصدِ قربت کے مسئلے سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ لیکن بعد کے علما میں رواج پانے والے عقلانی طرز و اسلوب نے انہیں اس بات پر ابھارا کہ وہ مسائل کی عینی اور واقعی صورت دریافت کرنے سے پہلے مفروضات اور ذہنی تصورات و تخیلات کی طرف متوجہ ہونے لگے اور اس طرح فقہ و اصول میں یہ عقلی اور جدلی طرزِ عمل بہت سے سادہ فقہی عناوین کے پیچیدہ ہو جانے کا سبب بن گیا۔

زندہ مرجع کی تقلید

تقلید کیلئے مرجع کا زندہ ہونا شرط نہیں ہے، کیونکہ مردہ مجتہدؒ کی رائے پر عمل کرنے کے بارے میں عقلا کی سیرت موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور اور خطۂ ارض سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ جو کسی مسئلے کے بارے میں جاہل ہوتے ہیں، اس مسئلے کے عالم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ خواہ وہ عالم دسیوں برس پہلے وفات پا چکا ہو، یا زمانۂ حاضر کا کوئی زندہ عالم ہو۔ کیونکہ کسی بھی علم کے ماہر اور وفات پا جانے والے عالم کی طرف رجوع کرنا غیر عاقلانہ بات نہیں ہے۔ انسان کا زندہ ہونا (یعنی صرف اس حد تک ہونا کہ اسکے پیکر میں جان پائی جاتی ہے) اسکی رائے کے حجت یا عدم حجت ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

استنباط کے حجت ہونے کی شرط یہ ہے کہ استنباط کرنے والا شخص اپنے فن کا ماہر ہو، عالم و آگاہ ہو اور اظہارِ نظر کیلئے اجتہادی حیثیت کا مالک ہو۔ رہی بات یہ کہ بعد میں اسے

کوئی بیماری لاحق ہو جائے یا وہ وفات پا جائے تو یہ حوادث اسکے نظریے پر کوئی مثبت یا منفی اثر نہیں ڈالتے۔ اسی بنیاد پر لوگ بھی مردہ مجتہد کی طرف بقابر میت کی صورت میں یا ابتداء سے تقلید کر کے رجوع کرتے ہیں۔

شاید مذکورہ استدلال کے ذریعے ہم علمائے طب وغیرہ کے متعدد نسلوں پر مرتب ہونے والے اثرات کا راز جان سکیں' کہ وہ اپنے گزشتہ علما کے علم پر اعتماد رکھتے ہیں اور اسی اعتماد کی بنیاد پر صحت اور دوسرے امور میں ان کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ اس صورتحال کا مشاہدہ ہم اپنے گزشتہ علما کے یہاں بھی کر سکتے ہیں' وہ اپنے سے پہلے والے ان علما کی آراء و نظریات پر عمل کرتے تھے جو عظیم علمی شان و مقام کے حامل تھے۔

اسی بنا پر ہمیں گزشتہ ادوار میں مردہ مجتہد کی تقلید کے جواز یا عدم جواز پر علما کے درمیان کسی بڑی بحث وجدال کا سراغ نہیں ملتا۔

لہٰذا ہماری رائے میں مسئلۂ تقلید ایک فطری امر ہے' ایک محض تعبدی اور شرعی امر نہیں ہے اور اس مسئلے کی بنیاد جاہل کا عالم سے رجوع کرنا ہے۔ کیونکہ صاحبانِ عقل و دانش یہ بات مانتے ہیں کہ جو انسان علم کے کسی شعبے میں مہارت اور آگہی کا حامل ہو' اس شعبے میں اس کا کلام عقلی طور پر حجت رکھتا ہے اور اس کیلئے کسی شرعی تصدیق اور صداقت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو چیز عقلاً حجت ہو' وہ بہر صورت عذر کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے' خواہ درست ہو یا غلط۔

اسی طرح مرجع کے زندہ ہونے کی شرط کی کوئی بنیاد نہیں اور ہم نہیں سمجھتے کہ اس شرط کا نہ ہونا اس موضوع میں کوئی مشکل پیدا کرے گا۔

بعد میں آنے والے علما کی طرف سے فقہی رائے کی حجت کیلئے مرجع کے زندہ ہونے کو شرط قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس مسئلے میں پیچیدہ فلسفی راستے سے داخل ہوئے ہیں۔ جب ہم اس پر غور وخوض کرتے ہیں تو ان لوگوں پر رحم کھانے کے سوا کوئی راستہ نہیں پاتے۔ کیونکہ اس باب میں ان کا استدلال کسی صحیح علمی روش کا حامل نہیں ہے۔ اس

سلسلے میں ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خود سے سوال کرتے ہیں کہ کیا مردہ شخص صاحبِ نظر اور صاحبِ رائے ہوسکتا ہے؟ کیا کسی شخص کے وفات پا جانے سے اسکے اور اسکی رائے کے درمیان کوئی فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے؟

جبکہ اس قسم کے سوالات مسئلۂ تقلید پر کسی قسم کا اثر مرتب نہیں کرتے۔ کسی کی روح اور اسکی رائے ایک ساتھ باقی رہتی ہیں یا نہیں؟ یہ وہ مسئلہ ہے جو کسی بھی صورت میں اسکے اجتہادات سے کہ جو اسکے علم و آ گہی اور فقہی فہم و ادراک سے وابستہ ہیں تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ فقہی رائے کے اظہار کے بعد اس پر حوادث کا گزر جانا' اسکی رائے کی وقعت اور اہمیت کو ختم نہیں کر دیتا۔ کیونکہ مجتہد کی رائے اسکے اجتہاد کے وقت اسکی رائے ہے' جو محض اسکے قوائے بدن کے غیر فعال ہو جانے اور اسکی عقل و احساس کے ختم ہو جانے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر ایسا ہو تو پھر جب فقیہ سویا ہوا ہو تو اس وقت اسکی رائے کی تفسیر کیسے کریں گے؟ اسی طرح اس فقیہ کی رائے کے حجت ہونے کی تفسیر کیونکر کریں گے جو مشکل اور پریشان کن حالات میں اپنے ہوش و حواس اور حافظہ کھو بیٹھتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ بہت سے علما' جنہوں نے بے حساب مسائل پر اجتہاد کئے ہیں' کبھی کبھی اپنی اجتہادی رائے بھول جاتے ہیں اور جب اُن سے اِن کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو اپنی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ اپنی تمام آراء کو ایک وقت میں اپنے ذہن میں نہیں رکھ سکتے۔

قرآنِ کریم کہتا ہے: فَسْئَلُوْآ اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۴۳) فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ (تو ہر گروہ میں سے ایک جماعت اس کام کیلئے کیوں نہیں نکلتی کہ دین کا علم حاصل کرے اور پھر جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے عذابِ الٰہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اسی طرح ڈرنے لگیں۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۲)

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ شریعتِ الٰہی کے عالم سے سوال کرنے والے کو جو جواب ملتا ہے، وہ اس پر حجت ہوتا ہے، اور وہ اس جواب سے دوسروں کو بھی آگاہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے کی گفتگو سننے والے کیلئے بھی اس گفتگو سے اپنی زندگی میں استفادہ کرنا اور اس گفتگو کو اپنے اہل وعیال اور دوسروں کیلئے نقل کرنا فطری بات ہے۔ ہر چند عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا وہ شخص وفات پا چکا ہو۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی عاقلانہ روش میں زندہ ہونے کی شرط کی کوئی گنجائش نہیں اور فقہی روش بھی کوئی علیحدہ اور یکسر جدا روش نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں عذر و حجت کی خصوصیت کے سوا کوئی اور خصوصیت نہیں۔ اور عذر و حجت رکھنے کا مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جس پر صاحبانِ عقل و دانش زندگی کے تمام امور میں متوجہ رہتے ہیں۔

البتہ ہم ایسا نظریہ اور یہ رائے رکھنے والے پہلے شخص نہیں ہیں۔ بہت سے بزرگ اور چوٹی کے علما، جیسے کتاب "قوانین الاصول" کے مولف محقق قمی (میرزا ابوالقاسم گیلانی) بھی اس بات کے معتقد تھے کہ مردہ مجتہد کی تقلید پر باقی رہنے یا ابتداء ہی سے مردہ مجتہد کی تقلید کرنے، ہر دو صورتوں میں مردہ مجتہد کی رائے حجت ہے۔

اگر کچھ لوگ اس مسئلے کے بارے میں اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں، تو ان کیلئے ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ اجماع کا مقام ہی نہیں۔ کیونکہ علمائے ماسبق کی کتب میں اسکا بنیادی مسئلے کے بطور ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ ہمارے خیال میں اس مسئلے کو بعد کے علما نے فلسفی اسلوبِ تفکر کے زیر اثر (اسکی بغیر کسی درست بنیاد کے) فقہی اجتہاد کے دائرے میں داخل کردیا ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں مردہ مرجع کی تقلید جائز ہے۔ خواہ بقا بر میت کی صورت میں ہو، خواہ ابتداء سے اس کی تقلید کی صورت میں۔

فقہی ارتقا میں رکاوٹ

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مردہ مرجع کی تقلید پر باقی رہنے یا ابتداء ہی سے مردہ مرجع

کی تقلید کرنے کا جائز ہونا' فقہ کے ارتقا میں رکاوٹ ہوگا؟

جواب: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح کا نظریہ فقہ میں جمود اور ٹھہراؤ کا موجب ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ جب لوگ مردہ حضرات کی فقہی آراء کی جانب رجوع کریں گے تو زندہ حضرات میں اجتہاد کا محرک (motive) نہیں رہے گا کیونکہ وہ لوگوں کیلئے اپنے اجتہاد کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ کیونکہ وہ محرک جو انسان کو علم و دانش کے حصول اور تحقیق و جستجو پر ابھارتا ہے' وہ ایک فطری محرک ہے' جس کا سرچشمہ کمال کی جانب انسان کا رجحان و رغبت ہے۔ کثیر تعداد میں ایسے علما ہیں جنہوں نے نامساعد حالات' اور امکانات و وسائل کے فقدان کے باوجود علم سے رغبت کی بنا پر' یا معاشرے میں مناسب مقام کے حصول کی غرض سے یا تقربِ الٰہی کی نیت سے علم حاصل کیا ہے۔

پھر یہ کہ مردہ مجتہد کی رائے کے حجت ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسکی رائے قطعی اور حتمی ہے۔ بلکہ مسئلے کے بارے میں اظہارِ رائے کا دروازہ کھلا رہتا ہے' تاکہ لوگوں کے پاس مردہ مجتہد کی رائے کے علاوہ زندہ فقیہ کی رائے پر عمل کا امکان بھی موجود رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ چند زندہ اور علیحدہ علیحدہ فقہی آراء رکھنے والے مجتہدین میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لوگوں کا کسی ایک یا دو مجتہدین کی تقلید کرنا دوسروں سے اجتہاد کا موقع چھین نہیں لیتا۔ اس مسئلے میں بھی زندہ اور مردہ مجتہد کے درمیان فرق نہیں۔ لہٰذا نہ بابِ اجتہاد بند ہوگا اور نہ بابِ تقلید۔

ایک اور اعتبار سے دیکھیں تو ہم بہت سے ایسے امور کا سامنا کرتے ہیں جنہیں گزشتگان نے آنے والوں کیلئے اٹھا رکھا ہے۔ نیز بہت سے ایسے جدید مسائل اٹھتے ہیں جن پر گزشتگان نے بحث و گفتگو نہیں کی ہے۔ اور اس بات نے زندہ مجتہدین کی طرف رجوع کرنے کو ایک مکمل طور پر فطری اور حقیقی امر بنا دیا ہے۔

علم و دانش سابق علما کی آراء و نظریات میں منحصر اور موقوف ہو کے نہیں رہ گیا ہے'

بالکل اسی طرح جیسے زندگی کے مختلف ابعاد اور پہلو بس وہی نہیں رہ گئے ہیں جو ان کی زندگیوں میں تھے اور زندگی صرف انہی کے دائرے میں محدود ہو کے ختم نہیں ہوگئی ہے۔ ہر زمانے میں نئی فروعات، تازہ مشکلات اور نت نئے مسائل جنم لیتے ہیں، جو لوگوں کو علما سے رجوع کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شاید حضرتِ حجت علیہ السلام کی یہ روایت اسی جانب اشارہ ہو کہ: **واماالحوادث الواقعة فارجعوا فیها الیٰ رواة حدیثنا** (پیش آمدہ حوادث کے موقع پر ہماری احادیث کے راویوں سے رجوع کرو۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۷۔ ص ۱۴۰۔ روایت ۳۳۴۲۴)

قدیم زمانے میں جب نئے نئے مسائل سر اٹھاتے تھے، تو لوگ ائمہؑ یا علما سے ان کا حکم دریافت کرتے تھے۔ نو پیدا شدہ مسائل سامنے آنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا، جس میں علما کی رائے کی ضرورت رہے گی۔ لہٰذا تقلید کا مسئلہ، اپنے تاریخی سفر میں کبھی جمود اور توقف سے دوچار نہیں ہوگا۔ بلکہ اسکے سامنے جدید حالات اور نئی ضروریات موجود رہیں گی۔ یہ جواب ان لوگوں کیلئے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مردہ مجتہد کی تقلید کا جواز جدید مسائل سے آگہی کے سلسلے میں لوگوں کی ذمے داری میں تعطل پیدا کردے گا۔ البتہ ہم مردہ مجتہد کی تقلید کو لازم اور ضروری قرار نہیں دیتے۔ بلکہ اس کی فقہی آراء کے حجت ہونے اور اسکی تقلید کی اجازت کے قائل ہیں۔

اَعلم کی تقلید

اعلمیت کے مسئلے میں ہم اصولی طور پر عقلا کے معمول کو (جو مسئلۂ تقلید کی بنیاد ہے) اعلم سے رجوع کرنے میں منحصر نہیں سمجھتے۔ بلکہ لوگ اپنے تمام امور میں، اُن امور سے باخبر افراد کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ان امور کے اعلم ہی سے رجوع کرنے پر اصرار نہیں کرتے۔

رہی یہ بات کہ لوگ اختلافی مسائل میں اعلم کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو یہ صرف

اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مسئلہ ہر صورت میں حجت و دلیل کی بجائے احتیاط کا تقاضا کرتا ہو۔ ہم اس امر کا مشاہدہ لوگوں کے عام طرزِ عمل میں کرتے ہیں کہ جب کوئی مرض خطرناک حدوں کو چھونے لگتا ہے' تب وہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ماہر طبیب سے رجوع کرتے ہیں' اور بعض اوقات سب سے ماہر طبیب کے ساتھ ساتھ' ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کی تشکیل کی درخواست بھی کرتے ہیں۔ تاکہ بیماری کی تشخیص یا اسکے علاج کے سلسلے میں مددگار بننے والے ہر قسم کے احتمال کا جائزہ لیا جائے۔ لہٰذا (اضطراری حالات کے سوا) اختلافی مسائل میں اعلم کی طرف رجوع کرنا' عقلا کی سیرت اور روش کی رو سے لازم اور ضروری دکھائی نہیں دیتا۔

یہ بات تو ہم جانتے ہی ہیں کہ شرعی مسائل کے سلسلے میں ہماری ذمے داری احتیاط پر عمل کرنا نہیں ہے' جس کے تحت ہم پر ہر صورت میں واقعی اور حقیقی حکم پر عمل کرنا ضروری ہو۔ بلکہ ہماری ذمے داری ہے کہ ہمارے پاس (اپنے عمل کی) حجت یا دلیل ہو' یا حتیٰ (اسکے بارے میں) عذرِ شرعی موجود ہو۔ اور یہ امور فقیہ اور پرہیز گار مجتہد کی طرف رجوع کر کے حاصل ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک اور نظریہ بھی موجود ہے' جو کہتا ہے کہ: **فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** اور **فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ** کی دلیلیں' اختلافی مسائل میں اعلم کی طرف رجوع کرنے کی رائے کا احاطہ نہیں کرتیں۔ کیونکہ حجیت کی دلیل دو باہم متناقض اور متضاد آراء کو اپنے اندر شامل نہیں کرتی۔ اس بنیاد پر یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ فلاں نظریے پر بھی عمل کر سکتے ہیں اور اس نظریے کے بالکل برعکس نظریے پر بھی عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ پس اگر حجیت کی دلیل دو باہم متضاد نظریات کو اپنے اندر شامل نہیں کرتی' تو پھر غیر اعلم کا فتویٰ (اگر وہ اعلم کے فتوے کے مخالف ہو) حجیت کا حامل نہیں ہو گا۔ قدرے یقینی بات یہ ہے کہ (ادلّہ میں تعارض اور ٹکراؤ کے باعث سقوط کی بنا پر) معاملہ تعیین

اور تخییر (۱) کے درمیان منحصر ہو جاتا ہے۔ اور عقل فیصلہ دیتی ہے کہ جس چیز کے بارے میں تعیین کا احتمال ہو اسکی جانب رجوع کیا جائے' کیونکہ جس کا حجت ہونا مشکوک ہو اس میں اصل ''عدم حجت ہونا'' ہے۔

لیکن کچھ لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ تقلید کے دلائل اختلافی موارد کا بھی احاطہ کرتے ہیں' البتہ تخییر کے طور پر۔ جب دلیل یہ کہہ رہی ہو کہ: فَسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ یعنی اہلِ ذکر میں سے کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو' تو یہ خود ایک قسم کی تخییر ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ انسان کا احترام کرو' تو اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی بھی انسان کا احترام کر سکتے ہیں۔ یہاں پر بھی آپ آزاد ہیں' جس مجتہد کے فتوے پر چاہیں عمل کیجئے۔ کیونکہ وہ ادلّہ جو عموم اور شمول کی صورت میں پہنچی ہیں' وہ ایک ہی درجے کی نہیں ہیں بلکہ (مذکورہ بالا مثال کی مانند) اطلاقِ بدلی کی صورت میں ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ دو متناقض فتووں کو تقلید کی دلیل کے تحت شامل قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ فقہا نے بھی دلیل پر مبنی دو متضاد اور آپس میں ناسازگار آراء میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنے سے منع نہیں کیا ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اس بارے میں دلیل موجود ہے' حتیٰ اگر دوسرا مجتہد اعلم بھی ہو۔

اگر کوئی اس بات کا معتقد ہے کہ اعلم اور غیر اعلم کے درمیان اختلافِ رائے کی صورت میں عقل کہتی ہے کہ اعلم کی رائے پر عمل کیا جائے' تو اسکا جواب ہم پہلے ہی دے چکے ہیں کہ عقل انسان کو اس امر کا پابند نہیں کرتی۔ جبکہ وہ دوسرا مجتہد غیر معمولی سعی و کوشش کی بنا پر کثیر علم اور وسیع معلومات کا حامل ہو۔

ان سب باتوں سے قطع نظر' خود اعلمیت کا مسئلہ پیچیدہ اور مبہم ہے۔

در حقیقت اعلم سے کیا مراد ہے؟

۱۔ تعیین: دو یا دو سے زیادہ صورتوں میں سے کسی ایک کا ترجیحی حیثیت کا حامل ہونا۔ تخییر: دو یا دو سے زیادہ صورتوں میں سے کسی بھی ایک کو اختیار کر سکنا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اعلم وہ ہے جو استنباط میں سب سے زیادہ قوی ہو۔ پھر سوال یہ جنم لیتا ہے کہ استنباط کے معیار کیا ہیں؟

کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے خیال میں اعلم وہ شخص ہوتا ہے جو اصولی مسائل پر گہری اور دقیق نظر رکھتا ہو۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اصولی مسائل پر حد سے زیادہ توجہ بھی کبھی کبھی انسان کو فقہی مسائل کے ادراک سے دور کر دیتی ہے۔ کیونکہ فقہی مسائل میں عقلی موشگافیوں سے زیادہ ادبی ذوق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے کہ فقہ کا بنیادی تعلق کتاب و سنت کے متون سے ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اصول میں اعلم شخص حکمِ شرعی دریافت کرنے میں اس غیر اعلم شخص سے پیچھے رہ جائے جو عمومی فقہی ذوق و درک کا حامل ہو۔

رہا یہ سوال کہ اعلم کا فتویٰ حکمِ واقعی سے قریب تر ہوتا ہے۔ تو اسکے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کون ہے۔ جو حکمِ واقعی کو جانتا ہے تا کہ اسکی بنیاد پر یہ تشخیص دے کہ فلاں فتویٰ اس سے قریب تر ہے؟ اسی طرح ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک زمانے کے غیر اعلم کا فتویٰ دوسرے زمانے کے اعلم کے فتوے کے موافق ہو اور ایک دور کے اعلم کا فتویٰ کسی دوسرے دور کے غیر اعلم کے فتوے کے موافق ہو۔ تمام اعلم حضرات کا کوئی ایسا ثابت اور مستحکم فتویٰ موجود نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ حکمِ واقعی سے قریب تر ہے۔

لہٰذا ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو فقہی ذوق کا مالک ہو، جس کے ذریعے وہ کتاب و سنت کو عربی قواعد اور تعبیرات کے فنی اسالیب کی شناخت کے ساتھ معروف طریقے سے سمجھ سکے اور اسلام کی اس روح سے واقف ہو جو اسکے شرعی احکام پر سایہ فگن رہتی ہے، نیز کسی حکمِ شرعی کی قرآنی مفاہیم اور سنتِ نبویؐ کے مضامین سے مخالفت کو محسوس کر سکے۔

اس بنیاد پر ہم اعلم کی تقلید کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اگر اعلم کی تقلید لازم ہوتی غیر اعلم علما کو چاہئے تھا کہ لوگوں پر اپنے دروازے بند کر دیتے۔ کیونکہ اس طرح پھر لوگ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے اور اگر وہ رجوع کرتے تو اعلم کی موجودگی کی وجہ سے ان کے پاس شرعی حجت اور اعتبار نہیں ہوتا۔

اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ صرف خاص حالات میں اعلم کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ یہ خیال کہ لوگ اعلم اور غیر اعلم کے درمیان پائے جانے والے فرق سے ناواقفیت کی وجہ سے غیر اعلم کی طرف رجوع کرتے ہیں' اس کی بنیاد یہ ہے کہ غیر اعلم کی رائے خلافِ واقع نہیں ہوتی۔

درحقیقت جب لوگ کسی ڈاکٹر یا انجینئر سے رجوع کرتے ہیں تو اس وقت ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافِ رائے سے صرف اجمالی طور پر واقف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح جب وہ علما کی طرف جاتے ہیں تو ان کے درمیان اختلاف کو بھی اجمالی اور سرسری طور پر ہی جانتے ہیں۔ لہٰذا عقلا کا طرزِ عمل' غیر اعلم سے رجوع کرنے کی تائید کرتا ہے۔ اور اس مسئلے میں عقلا کی رائے حجت کا درجہ رکھتی ہے۔ نیز اسلامی شریعت میں بھی غیر اعلم کی جانب رجوع کرنے سے نہیں روکا گیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کوئی مشکل درپیش نہیں۔

دوسرا نکتہ جو معروضی لحاظ سے اعلم کی تقلید کے عملی پہلو میں پایا جاتا ہے' وہ امتیاز کرنے والے عوامل کے ذریعے بالکل ٹھیک اعلم کی شناخت میں موجود مشکل ہے۔ بالخصوص جبکہ ہر مجتہد کچھ ایسی خصوصیات اور امتیازات کا مالک ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے کوئی ایسا شخص تلاش نہیں کیا جا سکتا جو مطلق طور پر اعلمیت کے تمام پہلوؤں اور عناصر کا حامل ہو۔ لہٰذا وہ لوگ جو کسی ایک یا دوسرے مرجع کی مرجعیت کی تبلیغ کرتے ہیں' وہ یا تو فقہی پہلو سے متاثر ہوتے ہیں یا خود اپنی ترجیحات اور رجحانات کے تابع ہوتے ہیں' اور کبھی کبھی بعض مراجع کی تبلیغ ذاتی لگاؤ یا سیاسی و اجتماعی ثانوی عناوین کے تابع ہوتی ہے' جو اعلم کی تقلید کو ایک حد تک غیر واقعی اور غیر عملی بنا دیتی ہے۔

تقلید میں تبعیض کا جواز

جہاں تک تقلید میں تبعیض کے جواز کی بات ہے' تو صرف ہم ہی یہ نظریہ نہیں رکھتے بلکہ بعض دوسرے حضرات جو اعلم کی تقلید کے واجب ہونے کے قائل ہیں' اس بات کے بھی

معتقد ہیں کہ اگر چند مجتہدین ایک ہی مرتبے پر فائز ہوں، یعنی اعلمیت کے رتبے کے حامل ہوں اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے زیادہ اعلم نہ ہو لیکن یہ سب اجتماعی طور پر دوسروں سے اعلم ہوں، تو جس شخص پر تقلید واجب ہے اسے اختیار حاصل ہوگا کہ ان میں سے کسی کی بھی کسی مسئلے میں تقلید کرے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اس صورت میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔(۱)

اس بنیاد پر، اگر ہم غیر اعلم کی تقلید کو جائز سمجھتے ہوں، یا ہمارے سامنے کچھ ایسے علما ہوں جن میں سے کوئی دوسروں سے زیادہ اعلم نہ ہو، تو ہماری رائے یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی بھی تقلید کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی عاقلانہ روش ہے جس میں عام طور پر احتیاط کی ضرورت نہیں۔ جیسے کہ اسلامی شریعت بھی احتیاط کی راہ نہیں دکھاتی۔ بلکہ کبھی کبھی فقیہ اپنے فقہی ذوق کی مدد سے روایات میں موجود باہم متضاد احکام میں سے کسی ایک حکم کو اختیار کرتا ہے کیونکہ تخییر (یعنی مختلف آراء میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرنا) ایک فقہی اصول ہے۔ اور وہ روایات اس کے سوا کوئی اور خصوصیت نہیں رکھتیں کہ ایک ایسے شرعی مضمون کی حامل ہوتی ہیں جو مکلّف کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر تمام مسائل میں تخییر ممکن ہو تو یقینی طور پر بعض مسائل میں حجیت کے پائے جانے کے لحاظ سے ممکن ہوگی۔ لیکن اسکے باوجود کسی مکلّف کیلئے احتیاط پر عمل کرنے میں کوئی حرج اور ممانعت نہیں ہے۔

البتہ مشکل اس مقام پر پیش آتی ہے جہاں فقہا کے درمیان نزاع واختلاف پایا جاتا ہے اور وہ مشکل یہ ہے کہ: کیا ایسے شخص کیلئے احتیاط کرنا جائز ہوگا جو اجتہاد اور تقلید کے مسئلے کو ہی چھوڑ بیٹھا ہو؟۔۔ بالخصوص اس وقت جبکہ کچھ ایسے مسائل پیش آئیں جن میں احتیاط پر عمل کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہو۔

۱۔ تقلید میں تبعیض سے مراد یہ ہے کہ ایک مقلِد کچھ مسائل میں کسی ایک مرجع کی تقلید کرے اور کچھ مسائل میں کسی دوسرے مرجع کا مقلِد ہو۔

مثال کے طور پر فقہا نے اپنی فقہی مباحث میں اس مسئلے کو اٹھایا ہے کہ جہاں ممکن ہو وہاں نیت کے ساتھ یقین شرط ہے یا نہیں؟

کیا اعمال، بالخصوص عبادی اعمال کی انجام دہی کیلئے لازم ہے کہ ان کے ساتھ وجوب یا استحباب کا قصد کیا جائے؟ یا ان کے وجوب یا استحباب کا صرف احتمال ہونا کافی ہے؟ یا اگر احتیاط نے کسی عمل کو دُہرانے کا تقاضا کیا ہو جبکہ وہ اس وقت کسی کی تقلید کر سکتا ہے اور تقلید کی بنیاد پر عمل کو ایک ہی مرتبہ انجام دے سکتا ہے، یا پھر اگر وہ مجتہد ہونے کی صورت میں اجتہاد کرے، حکم کو دریافت (discover) کرے تو کیا اسکے لئے احتیاط پر عمل کرنا اور اس عمل کو دُہرانا جائز ہوگا؟

لہٰذا تقلید کے بعض فرعی مسائل شرعی اور غیر شرعی اعتبار سے متنازع ہیں۔ اس صورتحال میں انسان کیلئے ضروری ہے کہ یا تو وہ مجتہد ہو یا کسی ایسے مجتہد کی تقلید کرتا ہو جس نے اس مسئلے میں احتیاط کے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔

کچھ جگہوں پر احتیاط بھی احتیاط پر عمل کو ترک کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں احتیاط پر عمل میں حرج ہے۔

ممکن ہے وہ عام افراد جو خاطر خواہ علم نہیں رکھتے، تمام امور میں احتیاط پر عمل نہ کر سکیں۔ کیونکہ اسکے لئے اُن کا احتیاط پر عمل کے مقامات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ بنیادی طور پر ایسا احتیاط جو ہر حال میں حقیقت کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہو، (یعنی جس سے عمل کے صحیح طور پر واقع ہو جانے کا یقین پیدا ہو جائے) اُس میں کوئی مضائقہ نہیں اور وہ جائز ہے۔ لیکن یہ عملی لحاظ سے کبھی کبھی مشکل پیدا کر دیتا ہے۔

سوال: کیا ایسے شخص کی رائے پر عمل کرنا جائز ہوگا جو فقہ کے کسی ایک باب مثلاً اقتصاد کا ماہر ہو، اگرچہ یہ ماہر عام لوگوں کی نظر میں ایک عالمِ دین شمار نہ کیا جاتا ہو؟

جواب: کسی میدان میں ماہر کوئی شخص رسمی طور پر عالمِ دین یا مرجع شمار کیا جاتا ہے یا نہیں، اس

مسئلے کا رسمی پہلو اہمیت کا حامل نہیں۔ بلکہ اہم ترین بات اس کا اس رسمی علم کا حامل ہونا ہے جس کے تحت وہ اجتہاد کے درجے پر فائز ہو اور اہلِ خبرہ (فن کے ماہرین) میں شمار کیا جاتا ہو۔ یعنی ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی رائے پر عمل کر سکتے ہیں اور دوسرے بھی ان کی رائے کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔

اگر انسان مطالعے، بحث و گفتگو اور تحقیق کے ذریعے اجتہاد کے مرحلے پر پہنچ جائے، تو اسکے لئے کوئی حرج نہیں بلکہ (اگر احتیاط پر عمل نہ کرنا چاہے تو) اس پر واجب ہے کہ اپنی فقہی رائے پر عمل کرے، اور اگر دوسرے لوگ بھی اس میں ایک مُقلَّد (یعنی جس کی تقلید کی جاتی ہے) کی صفات پائیں تو جن مسائل میں تقلید کی جاتی ہے ان میں اسکی تقلید کر سکتے ہیں۔

مرجع کی صفات

سوال: جس مرجع کی تقلید جائز ہے، اسکی صفات اور شرائط کیا ہیں؟

جواب: مرجع کیلئے بنیادی شرط، اس میں اجتہاد کی قدرت کے ساتھ ساتھ فقہ کے میدان میں مسلسل محنت ہے، جو اسکی سمجھ بوجھ کو جلا بخشتی ہے۔ البتہ صرف اجتہاد اور عدالت کا پایا جانا، جو مجتہد پر انسان کے اطمینان و اعتماد کا سبب ہے، کافی نہیں ہے۔ دوسری شرائط میں اسکا مرد ہونا، آزاد ہونا اور حلال زادہ ہونا بھی شامل ہیں، جو تقلید کے حوالے سے علمی لحاظ سے موثر نہیں لیکن مرجع کی اجتماعی حیثیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ شاید ان میں سے زیادہ تر شرائط احتیاط پر مبنی ہیں۔

سوال: کیا آپ مُقلَّد (یعنی جس کی تقلید کی جائے) کیلئے مرد ہونا شرط سمجھتے ہیں؟

جواب: اگر مسئلۂ تقلید کا تعلق اس بات سے ہے کہ جاہل عالم کی پیروی کرے، تو عالم مرد اور عالم عورت میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ مرد کا عورت کی تقلید نہ کرنا ایک حد تک مسلم سمجھا جاتا

ہے۔ لیکن ہماری نظر میں اسکی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ اسکا سبب ماضی کے معاشرتی حالات ہیں، جن میں لوگ عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اسے فقہی ذمے داریاں اٹھانے کے سلسلے میں ناتواں سمجھتے تھے۔ شاید اس امر کی ایک دلیل تاریخ میں عورت کی مرجعیت کا سراغ نہ ملنا بھی ہو۔ جبکہ ان میں سے کوئی بھی عامل عالم عورت کی جانب مرد کے رجوع نہ کرنے کی اطمینان بخش دلیل نہیں ہے۔

سوال: کیا مرجع کی عدالت اور امامِ جماعت کی عدالت اور عدالت میں پیش ہونے والے گواہ کی عدالت کے درمیان کوئی فرق ہے؟

جواب: ہم ان کے درمیان کسی فرق کے قائل نہیں۔ لیکن ہم آج کل دیکھ رہے ہیں کہ جن شرائط کے لوگ امامِ جماعت کی عدالت کے بارے میں قائل ہیں، ان میں بھی شدت سے کام لیا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ شرائط فتویٰ دینے کی بنیاد قرار دی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی کوشش ہے کہ کیونکہ مرجع لوگوں کے اموال وحقوقِ شرعیہ اور عزت وناموس کے سلسلے میں ذمے دار ہوتا ہے، لہٰذا اسکے لئے زیادہ سے زیادہ سخت شرائط مقرر کی جائیں۔ ان شرائط کا تقلید اور افتا کے لحاظ سے مرجع کی مرجعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ انہیں ان اہم ذمے داریوں کے اعتبار سے ملحوظ رکھا جاتا ہے جو مراجعین پر لوگوں کے اموال، آبرو اور ان کے خون کے بارے میں عائد ہوتی ہیں۔ مندرجہ بالا ذمے داریوں کی بنیاد پر ممکن ہے لوگ امامِ زمانہؑ کے نائب کے طور پر دینی مسائل میں قیادت اور دوسرے امور میں رہنمائی کیلئے مرجع کی جانب رجوع کریں۔

مرجع کے مقابل مقلدین کے فرائض

سوال: حصولِ فتویٰ کے سوا مرجع کے مقابل مقلدین یا کلی طور پر پوری امتِ اسلامی کے اور کیا فرائض ہیں؟ کیا محض دینی امور اور فقہ سے واقفیت مرجع کو اس قسم کی ولایت بخشتی ہے یا

اسکے لئے اسمیں دوسری شرائط کا پایا جانا بھی ضروری ہے؟

جواب: مرجعیت دو طرح کی ہوتی ہے:

کبھی مرجع صرف مفتی ہوتا ہے۔ یعنی اس کا کام فقہی دلائل کے ذریعے فقہی رائے کا استنباط (استخراج) کرنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کیلئے فقہ میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی وہ احکام کے دلائل سے ان کے تمام مقدمات اور فقہی استنباط کے طریقوں کے ساتھ مکمل طور پر آشنا ہو اور ایسے فقہی ذوق کا مالک ہو جس کی مدد سے کتاب وسنت میں موجود دینی متون کی سمجھ بوجھ پر اس حد تک قادر ہو جیسے انہیں اہلِ زبان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اسے عربی زبان پر عبور کے ساتھ ساتھ، ادبی فہم کا حامل بھی ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان متون کو سمجھنے کیلئے جس فنی پہلو کی ضرورت ہے وہ لغوی پہلو سے مختلف چیز ہے، جو الفاظ کو سمجھنے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کو کھلی آنکھ سے دیکھتا ہو۔ تاکہ موضوعاتِ احکام کو حقیقی اور واقعی صورت میں درک کر سکنے کے ساتھ ساتھ موضوع کے متعلقہ حالات وشرائط کو بھی سمجھ سکے۔

مرجع کیلئے لازم ہے کہ وہ درست اور صحیح وسالم راہ سے احکامِ شرع کے استنباط کیلئے رائج افکار، درپیش مشکلات اور ان کے دینی حل کے بارے میں اسلامی معارف وعلوم سے آشنا ہو، تاکہ اسکا فقہی استنباط، اسلام کے بنیادی اصول وقواعد سے ہم آہنگ ہو، جو اسلامی مفاہیم اور اقدار کے کلی خطوط کے ترجمان ہیں۔

فتویٰ دینے والے مرجع کو زبان دانی کے حوالے سے، زبان کے ہنری اور فنی اسلوب سے شناسائی کے اعتبار سے اور استنباط کے قواعد کی سمجھ اور دلائل کی معرفت کے لحاظ سے بھی اسلامی علوم ومعارف کا حامل ہونا چاہئے۔ اسے انسانی حیات کیلئے اسلام کے پیش کئے گئے افکار، اقدار اور کلی خطوط سے آشنا ہونا چاہئے۔ یہ مرجعیت 'مرجعیتِ تقلید ہے'، جو علمی پہلو کی حامل ہے اور بعض لوگوں کے مطابق اسکی وسعت اور دامن میں ایسے امور بھی شامل ہیں جن کا مقلد محتاج ہوتا ہے اور انہیں تسلیم کرتا ہے۔

کبھی مرجعیت کا دائرہ اس قدر محدود فرض کیا جاتا ہے کہ اسے صرف رسمی طور پر دلائل کی شناخت تک منحصر کر دیا جاتا ہے اور اسکے لئے زمانے، عمومی میدانِ حیات سے ربط و تعلق اور معاشرے میں موجود بنیادی افکار سے شناسائی کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ہم مراجع تقلید کی علمی اور عملی سیرت میں اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ البتہ ہم ایسے مراجعین پر اس اعتراض کے باوجود کہ وہ عصرِ حاضر کے انسان کے تقاضوں اور حالات کے بارے میں اہتمام نہیں کرتے، ان کے انتہائی احترام کے قائل ہیں۔

دوسری قسم کی مرجعیت، رہبری یا ولایتِ فقیہ کے عنوان سے ہے۔ یہ اس وقت سامنے آتی ہے جب فقیہ اسلام کی بنیاد پر معاشرے کے اجتماعی معاملات کے ولی اور حاکم کا عہدہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور ایک ایسے حقیقت پسند فقیہ کے مقام پر فائز ہوتا ہے جو زمانے اور اسکی حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے اور جن امور و معاملات میں وہ مہارت نہیں رکھتا ان میں ماہرین سے رائے لیتا ہے اور معاشرے کی رہبری و قیادت کا ادارہ جو مختلف فیصلے کرتا ہے اُن پر نظر رکھتا ہے اور اُن کے بارے میں ضروری رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قدرتی طور پر جس مرجع کو یہ مقام حاصل ہو، اسے اجتہادی طریقے پر اسلام کے بارے میں گہرا اور وسیع علم ہونا چاہئے، تا کہ وہ معاشرے اور میدانِ حیات میں اسلام کو اسکی متحرک صورت میں داخل کر سکے۔ نیز اسے تمام متغیرات، خصوصیات، گہرائیوں اور باریکیوں کے ساتھ حقائق سے آشنا ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات مشکل ہی سے قبول کی جاسکتی ہے کہ کوئی حاکم معاشرے کی خصوصیات اور حالات و ظروف سے آگاہ ہوئے بغیر اسکی رہبری پر قادر ہو۔ چنانچہ اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان، اسکی ماہیت و حقیقت اور اسکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جانتا ہو۔ البتہ اس مقام پر صرف علمی پہلو پر اکتفا نہیں کیا جانا چاہئے۔

اس بنیاد پر ہم معتقد ہیں کہ صرف وہ مرجع مرجعیت کی دونوں اقسام، یعنی مرجعیتِ فتویٰ اور مرجعیتِ رہبری کا حامل ہوسکتا ہے جو اجتہاد کو ثابت کرنے اور تقویت پہنچانے

والے وسیع اور گہرے علم و دانش کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اس حد تک سیاسی اور سماجی معلومات سے بہرہ ور ہو کہ ذاتی طور پر اپنے معاشرے کے اور دنیا کے مسائل و مشکلات کی گتھیاں سلجھا سکے اور جن امور میں ماہرین کی رائے کی ضرورت ہو ان امور میں ان کی رائے کا حصول اس کیلئے ممکن ہو۔

اس صلاحیت و قابلیت کے حامل متعدد مراجعین ہونے کی صورت میں بعض اوقات رائے عامہ سے رجوع کرنا ضروری ہو جاتا ہے یہ عمل شوریٰ کے اصول سے بھی موافق ہے۔ رائے عامہ کا اظہار واضح کرتا ہے کہ جو انسان اس عہدے پر فائز ہے اسے لوگوں کی تائید اور اعتماد حاصل ہے۔

مرجعیت کے معاملے میں بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ کیونکہ مجتہد مرجعیت کی صلاحیت رکھتا ہے اور جب لوگ کسی مجتہد کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں تو وہ مرجع ہو جاتا ہے۔

اسی معمول پر ایسا مجتہد جس میں رہبری اور قیادت کے عناصر اور شرائط پائی جائیں (نظریۂ ولایتِ فقیہ کی رو سے) وہ ولیٔ فقیہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جبکہ لوگ اسکا انتخاب کریں اسکی تائید کریں۔ اس صورت میں وہ شخص فقہی مفہوم میں ''ولیٔ مسلمین'' ہو جاتا ہے۔

یہ شرط حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ قدرتی بات ہے کہ جس شخص کو اپنی قیادت اور قیادت و مرجعیت کی صلاحیت کے بارے میں عوامی اعتماد حاصل ہو وہ درحقیقت اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط نہیں کرتا۔

مشہور کی مخالفت

سوال: بعض افاضل کے بقول آپ مشہور کے مخالف ہیں۔ مشہور کے کیا معنی ہیں؟ معین اصول کے تحت کیا مشہور کی مخالفت معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے؟

جواب: مشہور فقہا کی وہ اکثریت ہے جن کی کسی ایک فتوے کے بارے میں یکساں رائے ہو۔ یہ اتفاقِ رائے متاخرین کے یہاں بھی نظر آتا ہے جسے ''مشہورِ متاخرین'' کہاجاتا ہے۔

اصولیوں کے درمیان معروف ہے کہ کسی فتوے کی شہرت بذاتہ حجت نہیں ہوتی۔ یعنی وہ کسی ایسے حکم کے استدلال کی بنیاد نہیں بن سکتی جو کتاب وسنت سے شرعی دلیل نہ رکھتا ہو۔ لیکن ان کے علم پر اعتماد' ان کے فقہی مقام ومنزلت کے احترام اور ان کے گرد خاص حالات وعوامل کے حصار نے نفسیاتی لحاظ سے ان کی مخالفت کو ممنوع اور مردود کردیا ہے۔ اس حدتک کہ گویا قولِ مشہور کا مخالف فقاہت کی راہِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس قولِ مشہور کیلئے کوئی فقہی بنیاد نہیں ہے۔ کیونکہ فقہائے مشہور کا احترام (جس کا لازمہ ان کے اجتہادی فہم وادراک پر غور وتامل اور علمی تنقید ہے) اور ان کی آراء (جنہیں تاریخی اور فقہی تقدس کی بنا پر بلا بحث وگفتگو قبول کرلیا گیا ہے) کو بلاچوں وچرا مان لینا دو علیحدہ باتیں ہیں۔

ہم معتقد ہیں کہ فقہائے مشہور کی آراء کی مخالفت میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے کیونکہ ان کا معروف علمی مقام ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ان حضرات کے پاس اپنے فتاویٰ کیلئے لازماً مضبوط دلائل ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں اس نکتے پر بھی متوجہ رہنا چاہئے کہ مشہور فقہا نے بھی (مشہور فتاویٰ کے سوا) بہت سے فتاویٰ میں ایک دوسرے کی مخالفت کی ہے اور ایک دوسرے کی آراء پر تنقید کی ہے۔ پس پھر ہمیں کیوں مشہور فتاویٰ میں ان کی مخالفت کا حق نہ ہو۔ جبکہ ان کے دلائل ہمارے سامنے ہیں اور ان دلیلوں میں کمزور وضعیف ہر قسم کی دلیلیں شامل ہیں۔ یہ فقہا بھی خطاؤں سے معصوم نہ تھے اور ان کی فقہی آراء پر بھی علمِ فقہ کا اختتام نہیں ہو گیا ہے۔

سوال: آپ کے بعض جدید فتاویٰ کی نظیر کچھ سابقہ علما' فقہا اور مراجعین کے فتاویٰ میں نظر آتی ہے۔ کیا آپ ان میں سے کچھ مثالوں کی وضاحت کرسکیں گے؟

جواب: تمام انسانوں (حتیٰ کفار) کے طاہر ہونے کے بارے میں ہمارا نظریہ شہید سید محمد باقر الصدرؒ کے نظریے سے موافق ہے۔ البتہ انہوں نے اپنے فتوے میں کفار (کی

پاکیزگی) کے بارے میں احتیاط کو ترجیح دی ہے۔

ابتدأ مردہ مجتہد کی تقلید کے بارے میں ہماری رائے محقق قمی (صاحبِ قوانین) اور دیگر فقہا کی رائے سے ہم آہنگ ہے' جو اسے اصولی تقاضا تو سمجھتے ہیں لیکن اس (کے جواز) کے بارے میں فتویٰ دینے کی جرات نہیں رکھتے۔

جوئے میں استعمال ہونے والے آلات و وسائل سے (بغیر بازی لگائے) کھیلنے کے جائز ہونے کے بارے میں ہماری رائے معاصر فقیہ سید احمد خوانساری (صاحبِ جامع المدارک) کی رائے کے موافق ہے۔

عورت کی خودلذتی (استمنا) کے جائز ہونے کے بارے میں ہم ان تمام فقہا کی رائے سے متفق ہیں جو اس عمل کی حرمت (اسکے حرام ہونے) کو منی کے اخراج سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ آیت اللہ ابوالقاسم الخوئی نے کتاب منیۃ المسائل (ص ۱۲۹) میں عورت کی خودلذتی کے حرام ہونے کے بارے میں کیئے گئے سوال کے جواب میں اس بات کی وضاحت کی ہے۔ آپ کا جواب یہ ہے کہ: عورت کی خودلذتی (استمنا) اگر منی نکلنے کا باعث بنے تو یہ عمل حرام ہے۔ البتہ اس جانب توجہ رہے کہ بعض ماہر اطباء (doctors) کا کہنا ہے کہ عورت میں سرے سے منی ہوتی ہی نہیں ہے (۱)۔ یہ امر ہمارے لئے لازم کرتا ہے کہ ہم عورت کی منی کے بارے میں بیان کی جانے والی احادیث کی تفسیر و تاویل کریں' یا یہ کہ اس مسئلے کو ماہرین کے سپرد کر دیں' تا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے بیان کریں۔ اور اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ عورت میں بھی منی ہوتی ہے' تو اس صورت میں عورت اور مرد کے حکم میں اشتراک کی بنیاد پر اس عمل کی حرمت کا نظریہ قابلِ قبول ہے۔

داڑھی کاٹنے کے جواز کے بارے میں ہماری رائے مرحوم شیخ عباس رمیثی (نجفِ اشرف کے عالم دین جو اپنے علم و فقاہت میں مشہور تھے) اور اپنے استاد آقائے خوئیؒ سے

۱- کتاب کے آخر میں شامل ضمیمے کو دیکھئے۔

ہم آہنگ ہے۔(۱) البتہ آقائے خوئیؒ نے اس کی حرمت کا فتویٰ نہیں دیا اور اس کی حلیت کا فتویٰ دینے سے بھی وحشت زدہ تھے۔ اس عمل کی حرمت پر دلیل نہ رکھنے کی وجہ سے انہوں نے اس کے بارے میں احتیاطِ واجب کا فتویٰ دیا۔ بعض معاصر علما نے بھی اس عمل کو ترک کرنے میں احتیاط کو مناسب سمجھا ہے اور اس کے حرام ہونے کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔

اسی طرح ہمارے اور فتاویٰ بھی ہیں جن میں ہماری رائے بعض معاصر (۲) فقہا کی رائے سے ہم آہنگ ہے۔

سوال: غیر رائج اور غیر مشہور فقہی آراء و نظریات کے خلاف ظاہر ہونے والا ردِ عمل کیا مشہور فقہی آراء کے عادی ہو جانے یا ان سے لگاؤ کا نتیجہ ہے؟ کیا یہ ردِ عمل بجا ہے؟ یا اس سے صرف (غیر مشہور آراء کا اظہار کرنے والے) افراد کو بدنام کرنا مقصود ہوتا ہے؟

جواب؟ ہمارے خیال میں اکثر منفی ردِ عمل طویل مدت سے رائج ان مشہور نظریات سے بعض لوگوں کے لگاؤ اور ان کا عادی ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ نیز اس طرح کے ردِ عمل کے پیچھے بعض اوقات خاص اغراض و مقاصد بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ تیسرا عامل یہ ہے کہ ایسے ردِ عمل کا اظہار کرنے والے لوگوں کو فقہ میں آنے والے تغیر و تبدل اور اس کے تاریخی مراحل کا علم بھی نہیں ہوتا۔

عناوین ثانوی

سوال: علمِ اصول کے مطابق عنوانِ ثانوی عنوان اولی پر حاکم ہے۔ جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ عام طور پر مقلدین، احکام و فتاویٰ میں صرف عنوانِ اولی پر عمل کرتے ہیں۔ کیا آپ مصادیق اور مثالوں کے ذریعے اس اعتراض کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

۱۔ منہاج الصالحین از سید علی سیستانی ج ۲۔ ص ۱۳۔ م ۴۳

۲۔ حوالۂ سابق۔ ج ۲۔ ص ۱۸۔ م ۴۶

جواب: حکمِ اولی وہ حکم ہے جو موضوع کے ذاتی عنوان پر اسکے طبیعی وجود کے اعتبار سے ثابت ہوتا ہے، جیسے شراب کا حرام ہونا اور پانی کا مباح ہونا۔ جبکہ حکمِ ثانوی، وہ حکم ہے جو خارجی یا عارضی عنوان کے اطلاق کے لحاظ سے ایک موضوع سے تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ جیسے وہ احکام جو جبر، سختی و دشواری اور دوسروں کو ضرر پہنچنے کی صورت میں موضوعات پر منطبق کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے عناوین بعض اوقات حکمِ اولی کو بدل دیتے ہیں۔ مثلاً مجبوری و لاچاری کی حالت میں شراب نوش کر لینا (جبکہ انسان کی جان بچنا شراب پینے پر موقوف ہو) نہ صرف جائز ہو جاتا ہے بلکہ واجب ہے۔ اسی طرح اگر پانی کا پینا انسان کی موت کا باعث نظر آئے تو اسے پینا حرام ہے۔

بہت سے مباح اور جائز امور اس صورت میں حرام ہو جاتے ہیں جب ان سے کسی مومن شخص، یا مذہب کی توہین ہوتی ہو، یا ان سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ ان امور کی کچھ مثالیں بعض ان اعمال میں نظر آتی ہیں جو عزاداری کے مراسم میں داخل ہو گئے ہیں۔ جیسے قمہ زنی، زنجیر زنی اگرچہ عنوانِ اولی کے تحت حلال ہیں۔ کیونکہ بعض فقہا کسی کا اس حد تک اپنے آپ کو نقصان پہنچانا حرام نہیں سمجھتے جو اسکی ہلاکت کا باعث نہ ہو، لہٰذا ان کی رائے کی بنیاد پر یہ اعمال عنوانِ اولی کے تحت تو حلال ہیں، لیکن اگر ان سے مذہبِ شیعہ کی توہین ہوتی ہو اور دوسروں کے اس مذہب کا مذاق اڑانے کا باعث ہوتے ہوں، اور اغیار اسے شیعوں کی دقیانوسیت قرار دیتے ہوں اور اسی طرح ان کے مستحب ہونے یا واجب ہونے پر بھی کوئی خاص دلیل موجود نہ ہو، تو ممکن ہے عنوانِ ثانوی کے تحت یہ اعمال حرام ہوں۔

حکمِ ثانوی اپنے مقام پر ویسے ہی حکمِ خدا ہے جیسے حکمِ اولی اپنے مقام پر حکمِ الٰہی ہے۔ اور ہم پر ہر جگہ حکمِ خدا کی پیروی لازم ہے۔ شرعی دلائل کے اطلاق کے لحاظ سے حکمِ ثانوی کے مقام کی تشخیص میں کافی غور و خوض اور توجہ کی ضرورت ہے۔

جدید فقہی نظریات میں ردوبدل

سوال: آپ کے وہ فتوے جو مشہور کی رائے کے برخلاف ہیں، کیا وہ آپ کی حتمی اور آخری رائے ہیں؟ یا یہ کہ اگر مستقبل میں کچھ نئے مسائل سامنے آئے یا ان کے بارے میں مزید غور وخوض ہوا تو ان فتاویٰ پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور ان میں تبدیلی کی گنجائش ہے؟

جواب: اس بات کا امکان موجود ہے کہ کوئی مجتہد (کتاب وسنت کی مانند) ادلہ شرعی کی سمجھ بوجھ کی بنیاد پر جو فتویٰ صادر کرے، وہ فقہی نتائج کے تغیر کی صورت میں تبدیل ہو جائے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ اسے علم ہو جائے کہ اس نے اجتہاد میں غلطی کی ہے، یا (گزشتہ) دلائل سے متضاد اور متصادم دلائل اسکے سامنے آ جائیں۔ کیونکہ فقیہ کا کام خدا اور اسکے رسول کی طرف سے صادر ہونے والے واقعی اور حقیقی حکم کی تلاش ہے۔ لہٰذا وہ حکمِ شرعی کے بارے میں مسلسل جستجو اور اپنے اجتہادات پر پیہم نظر ثانی میں مشغول رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہمیں نظر آتا ہے کہ بعض گزشتہ فقہا نے اپنی ہی مختلف کتب میں ایک دوسرے سے مختلف فقہی آراء بیان کی ہیں۔ شہیدِ اوّلؒ کے علاوہ، معاصر فقہا میں بھی آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیمؒ کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اہلِ کتاب کے موضوع پر ان کی نجاست کے فتوے کو بدل کر ان کی طہارت کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح اُن کا فتویٰ تھا کہ صرف خانۂ کعبہ اور مقامِ ابراہیمؑ کی درمیانی جگہ مطاف (طواف کی جگہ) ہے۔ پھر اس فتوے سے دستبردار ہو کر انہوں نے جہاں تک گنجائش ہو اس دائرے میں طواف کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا۔

مراجعین کی بہت سی اجتہادی آراء میں اسی طرح کا ردوبدل، تغیر وتبدیلی ہوئی ہے۔ کیونکہ مرجع معصوم نہیں ہوتا۔ بعض اوقات نصوص کو سمجھنے میں اس سے غلطی ہو جاتی ہے اور کبھی قواعد کو ان کے مصادیق پر اطلاق کرنے میں وہ غلطی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات تحقیق اور غور وفکر کے دوران کچھ مخالف دلیلیں اسکی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا، وہ فتاویٰ جن میں اس طرح کی مشکلات پائی جاتی ہیں، ان پر نظر ثانی مجتہد کی فقہی

شجاعت اور ان کے بارے میں اپنی غلطی کا اعتراف اس کے حوصلے کی علامت ہیں۔

ہمارے لئے بھی اسی طرح کے مسائل پیش آئے ہیں۔ مثلاً ہم مہینے کی پہلی تاریخ ثابت ہونے کیلئے چاند کے آسمان پر پیدا ہو جانے کو کافی سمجھتے تھے۔ لیکن مزید غور و خوض اور افق پر رویتِ ہلال کے امکان پر کچھ اور دلائل حاصل ہو جانے کے بعد ہم اپنے اس نظریے سے دستبردار ہو گئے اور اس بارے میں ہمارا نیا فتویٰ ہمارے استاد آیت اللہ العظمیٰ (ابوالقاسم) خوئیؒ کے فتوے کے موافق ہے۔ جو چاند نکلنے اور اسکے نظر آنے کے امکان کو پہلی تاریخ کا چاند ثابت ہونے کی راہ قرار دیتے ہیں۔ اگر ایسے ماہرین جن کا قول یقین اور اطمینان پیدا کر دے، ان دو شرائط کی شہادت دیں، تو پہلی تاریخ کا چاند ثابت ہے، حتیٰ اگر عام لوگوں نے چاند نہ بھی دیکھا ہو۔

استنباط کے مصادر

سوال: آپ قرآنِ مجید کو استنباط کا اوّلین مصدر سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں سنت کو اس حد تک سند قرار دیتے ہیں جہاں تک وہ کتابِ خدا کے موافق ہو۔ کیا آپ سے پہلے کچھ دوسرے مراجع اور مجتہدین بھی یہ نظریہ رکھتے تھے؟ علاوہ ازایں اس روش کے مثبت پہلو کیا ہیں؟

جواب: تمام مجتہدین جس طرح قرآنِ کریم سے رجوع کرتے ہیں اسی طرح سنت سے بھی رجوع کرتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کوئی روایت قرآن کے مخالف ہو، تو اسے رد کر دینا چاہئے۔ البتہ ان میں سے بعض لوگوں سے ہمارا اختلاف قرآنِ کریم سے استدلال کرنے کے طریقے پر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آیاتِ قرآنی جیسے: فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌۢ بِإِحْسَانٍ (یا نیکی کے ساتھ روک لیا جائے گا یا حسنِ سلوک کے ساتھ آزاد کر دیا جائے گا۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۲۹) اور آیۂ کریمہ: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (اور عورتوں کو بھی دستور کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر فوقیت حاصل

ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۲۸) اور اسی طرح آیہ کریمہ: **يَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا** (یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور بہت سے فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ فائدے سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۹) اور دوسری متعدد آیات بعض شرعی فتاویٰ کی بنیاد ہیں۔ لیکن دوسرے فقہا ہماری اس رائے کے قائل نہیں۔ اسی طرح ہمارا نظریہ ہے کہ احکام کے استنباط میں قرآنِ مجید کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ لہٰذا جب وسعت و تنگی کے اعتبار سے سنت میں اختلاف دکھائی دے، تو لازماً سنت کو قرآنِ مجید کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ دوسرے فقہا کی روش سے ہماری روش کا امتیاز یہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم سے استدلال کرتے ہیں۔ بلکہ ہم بھی اپنے اجتہادات میں فقہا کے اسی معمول کی پیروی کرتے ہیں اور قرآنِ کریم اور سنت سے استدلال کرتے ہیں۔ ہم نے اجتہاد کی یہ روش اُنہی سے سیکھی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ ایک مجتہد کا استنتاج (نتیجہ اخذ کرنا) دوسرے مجتہد کے استنتاج سے مختلف یا مخالف ہو۔ کیونکہ ایسے بہت سے امور ہیں جنہیں گزشتگان نے آئندہ آنے والوں کیلئے چھوڑ رکھا ہے۔

شرعی گنجائشیں

سوال: کیا احکام کو آسان بنانا، یا شرعی رخصتوں پر عمل، فقہی لحاظ سے معیوب بات نہیں ہے؟ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے لئے شریعت میں سہولت و آسانی (سماحت) کے مفہوم کی وضاحت فرمائیں؟

جواب: دین کی عمومی پالیسی کے بارے میں گفتگو کرنے والی آیاتِ قرآنی کا مطالعہ اور اُن کا تجزیہ و تحلیل، ہم پر واضح کرتا ہے کہ ان آیات میں نہایت وضاحت کے ساتھ، صاف الفاظ میں دین کے آسان ہونے اور اس کے سخت نہ ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں

شریعت میں حرج (سخت مشقت) کی نفی کی گئی ہے۔ مثلاً یہ آیت کہ: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور دین میں تمہارے لئے کوئی زحمت نہیں قرار دی ہے۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۷۸) اور: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (خدا تمہارے بارے میں آسانی چاہتا ہے، تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۵) یا اللہ رب العزت کا یہ قول کہ: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (جو لوگ رسولِ نبی امی کا اتباع کرتے ہیں اور جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۷)

اگر سنت پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو مذکورہ آیات سے ہم آہنگ احادیث نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہ معتبر حدیثِ رسولؐ: اتیتکم بالشريعة السهلة السمحة (میں تمہارے لئے آسان اور غیر مشکل شریعت لے کر آیا ہوں۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۸۔ ص ۱۱۶۔ روایت ۱۰۲۰۹) اسی طرح آسانی اور سہولت پر مبنی فقہی قواعد بھی دکھائی دیتے ہیں جیسے اصالة الطهارة (ہر شے کو بنیادی طور پر پاک سمجھنا) کے مطابق: كل شيء طاهر حتیٰ تعلم انه قذر (ہر چیز اس وقت تک پاک ہے جب تک اسکی ناپاکی کا علم نہ ہو۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۔ ص ۱۴۲۔ روایت ۳۵۱) اسی طرح اصالة الحل (ہر شے کو بنیادی طور پر حلال سمجھنا) جو کہتی ہے کہ: كل شيء حلال حتیٰ تعرف الحرام فيه بعينه فتدعه (ہر چیز حلال ہے، جب تک واضح طور پر اسکے حرام ہونے کا علم نہ ہو جائے، ایسی صورت میں اس سے اجتناب کرو) اور قاعدة الصحة (صحیح ہونے کا قاعدہ) جس کے مطابق: كل شيء صحيح من معاملة اوغيرها مما يتصف بالصحة و الفساد حتیٰ يثبت فساده

(معاملات یا غیر معاملات میں سے کوئی بھی چیز جو صحیح یا غیر صحیح ہو سکتی ہے' اس وقت تک درست اور صحیح ہے جب تک اس کا غیر صحیح ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ وسائل الشیعہ۔ج ۸۔ص ۲۳۷۔روایت ۱۰۵۲۴) اسی طرح قاعدۃ الفراغ والتجاوز (کسی عمل سے فارغ ہو جانا' یا اسے انجام دے چکنا) لہٰذا حدیث میں آیا ہے کہ: اذا خرجت من شیء ثم دخلت فی غیرہ فشکک لیس بشیء (جب کسی عمل کو انجام دینے کے بعد دوسرے عمل کی انجامدہی میں مشغول ہو جاؤ' تو پہلے عمل کی صحیح انجامدہی کے بارے میں ہونے والے شک کا کوئی اعتبار نہ کرو) اور لا شک لکثیر الشک (کثرت سے شک کرنے والے کا شک بے اعتبار ہے)۔ نیز احکامِ شک جو انسان کو شک کی سختی اور مشقت سے نجات کیلئے عملی راہِ حل تلاش کرنے پر ابھارتے ہیں اور اسی طرح وہ تمام مباحات جن کا اسلام نے اعلان کیا ہے: اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ (آج تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۵) کے بارے میں بھی روایات موجود ہیں۔

لہٰذا پتا چلتا ہے کہ آسانی اور شرعی رخصتیں دین اسلام کا بنیادی اصول ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رخصت کو فقہی ذہنیت بنا لیا جائے' اور اس کی بنیاد پر مصادرِ اجتہاد (قرآن و سنت) سے سند حاصل کئے بغیر' اور ان سے استدلال کئے بغیر آسان آسان احکام صادر کئے جائیں۔ بلکہ لازم ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ میں غور و خوض کیا جائے' اور ان ادلہ کی رو سے جواز یا حرمت کا فتویٰ دیا جائے۔

ہم نے بعض مقامات پر رخصت اور جواز کے جو فتوے دیئے ہیں' ان تمام کیلئے ہمارے پاس فقہی شرعی دلائل موجود ہیں اور احکامِ شرعی میں ہم نے صرف رخصت اور جواز ہی کے عنوان کو پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ کیونکہ تنہا یہ عنوان حکمِ شرعی کی دلیل نہیں بن سکتا۔

ہم بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنے صادر کردہ اس قسم کے آسان فتووں کے بارے میں گفتگو اور مکالمے کیلئے تیار ہیں۔ اور ہر قسم کی ایسی علمی تنقید کا استقبال کریں گے جو استدلالی انداز کی حامل ہو' اور جس میں شور و غوغا اور الزام تراشی نہ ہو۔

۲

طہارت ونجاست کے احکام

طہارت ونجاست کے احکام

سوال: آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کھانے پینے کی نجس ہو جانے والی چیزیں بچے کو کھلانا جائز سمجھتے ہیں؟ کیا فقہا میں سے کسی اور نے بھی ایسا فتویٰ دیا ہے؟ آپ کے پاس اس عمل کے جواز پر کونسی شرعی دلیلیں ہیں جن پر آپ نے بھروسہ کیا ہے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظریہ رکھنے والا میں واحد شخص نہیں ہوں، بہت سے علمائے بزرگ مثلاً آقائے خوئیؒ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے اور انہوں نے نابالغ بچے کو کھانے پینے کی نجس یا نجس ہو جانے والی اشیا کھلانا پلانا جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ وہ اسکی صحت کے لئے مضر نہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ نجس غذاؤں کا کھانا ہر جگہ صرف اس لئے حرام قرار نہیں دیا گیا کہ ایسی غذائیں انسانی صحت کیلئے مضر ہوتی ہیں۔ شاید اس حکم میں دوسرے اسباب بھی پیش نظر ہوں۔ بہت سی ایسی چیزیں جن کا حرام ہونا قطعی طور پر ثابت ہے، وہ انسان کی جسمانی صحت کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچاتیں۔ مثلاً ایسا بھیڑ جسے ذبح کرتے وقت اس کی چاروں رگیں تو کاٹ دی جائیں لیکن خدا کا نام نہ لیا گیا ہو، یا اسے قبلہ رخ نہ رکھا گیا ہو، ایسی صورت میں اس کا گوشت کھانا حرام ہے، لیکن یہ گوشت (اگر کھا لیا جائے تو) انسان کی جسمانی

صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہی صورت اس وقت ہے جب بچے کا دودھ یا اسکا کھانا، خود اسکے ہاتھ سے نجس ہو جائے۔

اسے کیوں حرام قرار دیا گیا؟ اس کا رمز و راز ہمارے علم میں نہیں اور ان حرام نجاستوں کی ترکیب میں ہمیں زیاں اور ضرر کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔ وہ حالات جن میں ہم حرمت کا سبب بننے والی خصوصیات سے واقف نہ ہوں، اور اس حرمت کا راز خود شریعت میں پوشیدہ ہو، اُن میں ہمارے عمل کی بنیاد خداوند عالم کے اوامر و نواہی کی اطاعت ہونی چاہئے۔ خداوندِ عالم بالغ ہونے سے پہلے بچے کے کسی عمل کا حساب نہیں لے گا، لہٰذا جس عمل کا انجام دینا بالغ شخص پر حرام ہے (حدیث کی رو سے) اسکی انجام دہی بچے پر حرام نہیں۔ البتہ اسکے باوجود بعض احتیاطوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، جو کچھ یوں ہیں:

اوّل یہ کہ: ماہرین کی نظر میں ایسی (نجس ہو جانے والی) غذا بچے کی صحت و سلامتی کیلئے ضرر رساں نہ ہو۔

دوّم یہ کہ: بچہ ایسی غذا کا اس طرح عادی نہ بن جائے کہ بالغ ہونے کے بعد اس کا ترک کرنا اس کیلئے مشکل ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ خود بچے کو اس بات کا پتا نہ چلے کہ یہ غذا نجس ہے، اور نجاسات کے کھانے پینے کے حرام ہونے کا احساس اس کے اندر ایک نفسیاتی ہچکچاہٹ کی حیثیت سے باقی رہے۔

بالفاظِ دیگر یہ کہ، جو چیز کسی نقصان کا سبب نہ بنے اور اسے (نامعلوم اسرار) کی وجہ سے بالغ پر حرام کیا گیا ہے، اسے بچے کو اس شرط پر کھلایا جا سکتا ہے کہ وہ بچے کی ایسی عادت نہ بن جائے، جس سے بالغ ہونے کے بعد اسکا چھٹکارا حاصل کرنا دشوار ہو۔

البتہ بالغ انسان کو کھانے پینے کی نجس چیزیں پیش کرنا حرام ہے۔ کیونکہ انسان کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کیلئے ایسے عمل کے ارتکاب کا سبب بنے کہ اگر وہ اس کی جانب متوجہ ہوتے اور اسے جانتے تو ان پر اس عمل کا ارتکاب حرام ہوتا۔

لیکن اگر آپ کسی ایسے شخص کو دیکھیں جو کوئی ایسی غذا کھانے میں مصروف ہے جس

کی نجاست کا اسے علم نہیں ہے' یا اس کے حرام ہونے سے وہ واقف نہیں ہے' تو آپ پر اسے اس عمل سے روکنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اسکے پاس اپنے جہل کا عذر موجود ہے۔

سوال: اگر کسی انسان کو اس بات کا علم ہو کہ ایک ہوٹل میں گاہکوں کو حرام غذا' مثلاً نجس کھانا یا غیر اسلامی طریقے سے ذبح شدہ گوشت فراہم کیا جاتا ہے' تو کیا اس پر واجب ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے آگاہ کرے؟

جواب: اس موضوع کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ: وہ شخص جو لوگوں کو حرام یا نجس غذا کھلاتا ہے' مسئلے کو صحیح طور پر نہ جاننے کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اسکی فراہم کردہ غذا پاک ہے۔ اس صورت میں انہیں مطلع کرنا واجب نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ: لوگوں کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اس ہوٹل میں حرام یا نجس غذا فراہم کی جارہی ہو۔ اس صورت میں ہوٹل کے مالک کو اس ناجائز عمل سے روکنے اور لوگوں کو دھوکا دینے اور حرام اور نجس غذا کو حلال اور پاک غذا کے طور پر پیش کرنے والے اس ہوٹل کے خلاف اقدام کیلئے' لوگوں کو اس سے مطلع کرنا چاہئے' اور انہیں خبردار کرنا چاہئے کہ وہ وہاں نہ جائیں۔

یہ عمل ہوٹل کے مالک کیلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حیثیت رکھتا ہے' لوگوں کیلئے نہیں۔ کیونکہ لوگوں کو تو پتا ہی نہ تھا (کہ وہ کسی منکر کے مرتکب ہورہے ہیں) لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ کسی غلط عمل کے مرتکب ہوئے بھی نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ایک مستحب عمل کے طور پر انہیں اس معاملے سے آگاہ کیا جائے اور اس عمل سے روکا جائے۔

سوال: اگر انسان کسی ایسے گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے بارے میں شک کرے، جو کسی ہوٹل میں پکایا گیا ہو، یا اس کے دوست نے اس کیلیئے تیار کیا ہو، تو اس صورت میں اس پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟

جواب: اگر اس ہوٹل کا مالک یا اس کا دوست مسلمان ہوں اور یہ بات معلوم نہ ہو کہ گوشت کافر کے ہاتھوں ذبح کیا ہوا ہے، اور وہ لوگ بھی گوشت کے بارے میں اس سے زیادہ نہ جانتے ہوں، تو ایسی صورت میں وہ گوشت حلال قرار دیا جائے گا۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ یہ گوشت اس سے پہلے کافر کے پاس تھا اور اس بات کا امکان دکھائی نہ دے کہ اس کا مسلمان میزبان اس گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں مطمئن ہے، تو ایسی صورت میں یہ گوشت حرام قرار دیا جائے گا۔

جاری پانی

سوال: ہم جانتے ہیں کہ گھروں اور کارخانوں سے خارج ہونے والے پانی میں موجود نجاست کی مقدار مجموعی طور پر دوسری جگہوں سے آنے والے پانی سے کم ہوتی ہے۔ اس پانی کا رنگ اور ذائقہ بھی نجاست کی وجہ سے تبدیل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ٹھہرے رہنے، تعفن اور جراثیم کی وجہ سے بدلتا ہے۔ اس کے رنگ میں آنے والی یہ تبدیلی بھی نجاست کا رنگ نہیں ہوتی بلکہ وہ کوئی دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے، جس کا مشاہدہ ہم اکثر صورتوں میں بالخصوص بڑے شہروں میں کرتے ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر ہم کیوں ندی نالوں میں بہنے والے پانی کو نجس قرار دیں؟

جواب: اِس قسم کے پانیوں کی نجاست کا حکم ان کے نجاست سے مل جانے کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے پانی کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں آبِ قلیل کی طرح نجس ہیں، اور اُن پر آبِ کُر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

کُر پانی صرف نجاست ملنے سے نجس نہیں ہوتا۔ ہاں، اگر اس کا رنگ، اس کی بو اور

ذائقہ بھی بدل جائے تب نجس ہوتا ہے۔البتہ گٹر کے پانی کے متعلق تو پتا ہی ہے کہ وہ نجس ہے۔اسکی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ پانی متنجس آب قلیل کا حکم رکھتے ہیں یا اس وجہ سے کہ نجاست کی بنا پر ان کا رنگ، بو اور ذائقہ بدل چکا ہے۔لہٰذا انہیں نجس قرار دیا جاتا ہے۔

البتہ اگر گٹر کے پانی میں موجود نجاست کے عناصر کو ختم کرنا ممکن ہو، تو اس صورت میں صفائی کے بعد یہ پانی پھر سے آبِ مطلق بن جائے گا اور اسے پاک پانی (جاری یا کُر پانی) سے ملا کے پاک کیا جاسکتا ہے۔

سوال: ایسا خشک انگور (کشمش یا منقّی) جسے پکایا جارہا ہو، وہ کب نجس ہوگا، یا اپنے ساتھ پکنے والی غذاؤں کو نجس کرے گا؟

جواب: ہماری رائے میں انگور کا عرق دو تہائی حصے کے بخارات میں تبدیل ہونے سے پہلے بھی نجس نہیں ہوتا۔البتہ پاک ہونے کے باوجود اس کا کھانا حرام ہے۔لیکن اگر کشمش یا منقّی کو پانی میں ابالا جائے، تو ہماری نظر میں اسکا کھانا حرام نہیں ہے۔کیونکہ حرمت کا تعلق انگور کے عرق کے ساتھ ہے اور جس پانی میں کشمش کو ابالا جاتا ہے وہ انگور کا عرق نہیں ہے۔اور کیونکہ یہ پانی ابلنے کے دوران ختم ہوجاتا ہے، اسلئے ایسی غذا کا کھانا حرام نہیں ہے۔

سوال: لوگوں کے درمیان مشہور ہے کہ (نجس) زیتون کو اس کے اندر موجود تیل کی تہہ کی وجہ سے پاک نہیں کیا جاسکتا۔اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: زیتون خواہ سیاہ ہو یا سبز، اسے پاک کیا جاسکتا ہے۔ایسے لوگ جو زیتون کے پاک ہونے کو خارج از امکان سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ زیتون کے اندر تیل ہوتا ہے اور جس طرح پانی کے سوا دوسری سیال اشیا نجس ہونے کی صورت میں پاک نہیں ہوسکتیں، اسی طرح یہ تیل بھی پاک نہیں ہوسکتا۔لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ زیتون کے اندر تیل نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر چربی سی ہوتی ہے جسے کشید کرنے کی صورت میں اس کے اندر سے تیل نکلتا

ہے' بالکل اسی طرح جیسے دوسری نباتات سے تیل حاصل کیا جاتا ہے۔
سوال: کیا شرعی طور پر ذبح شدہ جانور کے اندر باقی رہ جانے والے خون کا کھانا جائز ہے؟
جواب: نہیں' ایسے خون کا کھانا جائز نہیں' اگرچہ یہ خون نجس نہیں ہوتا۔

سوال: اگر تلے ہوئے مرغی کے انڈے میں کچھ خون نظر آئے تو کیا اس خون کو علیحدہ کرنے کے بعد باقی انڈہ کھانا جائز ہوگا؟
جواب: اگر خون کسی چیز میں لپٹا ہوا ہو' اور انڈے کی زردی' سفیدی اور کھانے کی کسی چیز تک نہ پہنچا ہو تو غذا پاک ہے اور اسکا کھانا جائز ہے۔

سوال: اگر پانی یا تیل میں کوئی ایسا کیڑا نظر آئے' جو عام طور پر نجس جگہوں پر رہتا ہے' تو کیا اس پانی یا تیل کو نجس قرار دیا جائے گا؟
جواب: ایسے پانی یا تیل کو پاک سمجھا جائے گا اور اسکے اندر کسی نجاست کی موجودگی کا صرف شک ہونا لائق اعتبار نہیں۔ حیوان کا جسم صرف نجاست سے چھو جانے کی وجہ سے نجس نہیں ہوتا اور اگر نجس ہو بھی جائے' تو عین نجاست کے ختم ہو جانے سے پاک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں کیڑے کے بدن سے عین نجاست کے چپکے ہونے کے متعلق معلوم نہ ہو' تو ہم اس کے نجس ہونے کا فیصلہ صادر نہیں کر سکتے۔

سوال: ایسی جگہوں پر کام کرنے' یا وہاں کھانے پینے کا حکم کیا ہے جہاں شراب اور حرام غذائی اشیا کی خرید و فروخت ہوتی ہے؟
جواب: بنیادی طور پر تو ایسی جگہوں پر کام کرنا' یا وہاں کھانا پینا جائز ہے۔ لیکن اگر ایسے مراکز سے خریداری نہ کرنا' اور ایسے مقامات پر کام نہ کرنا' نہی عن المنکر کا ذریعہ ہو' یا مومنین کا ایسے مراکز سے ربط و تعلق' منکرات کو جاری رکھنے کے سلسلے میں ان کے مالکوں کی حوصلہ افزائی کا

سبب ہو، تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب سے یہ عمل جائز نہیں۔

سوال: جو چیز نجس ہو جاتی ہے کیا اس میں دوسری چیزوں کو نجس کرنے کی خاصیت بھی پیدا ہو جاتی ہے؟

جواب: اگر نجس ہونے والی چیز پانی کے سوا کچھ اور ہو تو وہ دوسری چیزوں کو نجس نہیں کرتی۔ نجس ہونے والی چیز بھی اگر عین نجاست سے براہِ راست چھو جانے کی وجہ سے نجس ہوئی ہو، تو احتیاط یہ ہے کہ وہ نجس کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن اگر عین نجاست سے چھو جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی دوسری نجس چیز سے چھو جانے کی وجہ سے نجس ہوئی ہو، تو دوسری اشیا کو نجس کرنے کا سبب نہیں بنتی۔ لیکن وہ پانی جو عین نجاست سے نہیں بلکہ کسی بھی نجس شے سے مل جانے کی وجہ سے نجس ہوا ہو، وہ دوسری چیزوں کو بھی نجس کر سکتا ہے۔ البتہ اسکے ذریعے نجس ہونے والا تیسرا پانی احتیاطاً نجس کرنے والا ہوتا ہے۔

۳

کنبے اور گھرانے کے احکام

کنبے اور گھرانے کے احکام

والدین کی اطاعت

سوال: کن صورتوں میں والدین کی اطاعت واجب ہے؟

جواب: آیاتِ قرآنی کے مطالعے کے دوران، ہم نے ان میں والدین کی اطاعت کا کوئی عنوان نہیں دیکھا۔ یعنی بچے کیلئے والدین کے حکم و فرمان کی حیثیت، خدا، پیغمبر اور اولی الامر کے حکم و فرمان کی سی نہیں ہے، جو شرعی حیثیت سے واجب الاطاعت ہے۔

اسلام نے والدین کے حکم و فرمان کو بچوں کیلئے ایسا شرعی عنوان قرار نہیں دیا ہے جس کی پابندی ان پر لازم ہو۔ بلکہ اللہ رب العزت نے بچوں کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر لفظ ''احسان'' استعمال ہوا ہے اور کلامِ الٰہی میں احسان کے نمونوں اور مثالوں کو بھی واضح کیا گیا ہے:

''وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْھَرْھُمَا وَ قُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا. وَ اخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا.''

''اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اسکے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ اور اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں، تو خبردار ان سے اف بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان سے ہمیشہ شریفانہ طریقے سے گفتگو کرتے رہنا۔ اور ان کیلئے خاکساری کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکا دینا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ پروردگار! ان دونوں پر اسی طرح رحمت نازل فرما جس طرح انہوں نے بچپنے میں مجھے پالا ہے۔''

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۳، ۲۴)

ان دو آیات سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خداوند عالم چاہتا ہے کہ ہم اپنے والدین کے ساتھ اس انداز سے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں کہ نہ اُن سے کسی طرح کی تلخ کلامی کریں، نہ بدسلوکی کے مرتکب ہوں۔ بلکہ اُن کے ساتھ کشادہ روئی، مہربانی اور خاکساری کا برتاؤ کریں۔ اور بچپنے میں انہوں نے ہماری جو خدمتیں کی ہیں، ہمارے لئے جو زحمتیں برداشت کی ہیں، انہیں ہمیشہ یاد رکھیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں کہیں بھی والدین کی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا ہے، البتہ اسکے برعکس قرآنِ کریم میں مشرک والدین کی اطاعت نہ کرنے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے:

'' وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔''

''اور اگر تمہارے ماں باپ اس بات پر زور دیں کہ کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں ہے، تو خبردار، ان کی اطاعت نہ کرنا لیکن دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا اور اس کے راستے کو اختیار کرنا

جو میری طرف متوجہ ہو۔'' (سورۂ لقمان ۳۱ - آیت ۱۵)

یہ آیت کہہ رہی ہے کہ اگر تمہارے والدین تمہیں سیدھے راستے سے بھٹکانا چاہیں اور تمہیں شرک کی طرف لے جانا چاہیں، تو ان کی اطاعت نہ کرنا۔

ہمارے خیال میں خدا کے ساتھ شرک کا جو ذکر اس آیۂ کریمہ میں کیا گیا ہے وہ ان انحرافات اور گمراہیوں کے ایک نمونے کے طور پر ہے جن کی طرف والدین اپنی اولاد کو لے جا سکتے ہیں۔ ان انحرافات میں کفر، حرام کاموں کا ارتکاب اور بچوں کی مصلحت کے خلاف امور شامل ہیں، حتیٰ بچوں کو ان سرگرمیوں سے روکنا بھی شامل ہے جو اُن کی معنوی، روحانی فکری اور دینی تقویت کا موجب ہوتی ہیں، جیسے مسجدوں میں جانے اور دینی اور علمی اجتماعات میں شرکت سے بچوں کو منع کرنا۔

حتیٰ والدین کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے بچے کو جہاد میں شرکت سے روکیں، اگر جہاد واجبِ کفائی ہو جائے اور بچے پر واجب ہو جائے۔

یعنی آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ خدا کی نافرمانی کر کے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کریں۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس آیت سے یہ مفہوم بھی حاصل نہیں ہوتا کہ جن امور میں خدا کی نافرمانی نہیں ہوتی، ان میں والدین کے اطاعت کی جانی چاہیے۔ بلکہ آیت کہتی ہے کہ: اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور اچھا برتاؤ کرو۔ لہٰذا اگر والدین اپنے بچے کو کسی ایسے کام کی ترغیب دیں جس میں اسکی مصلحت نہ ہو، مثلاً کہیں کہ فلاں لڑکی سے شادی کرو، یا اپنی بیوی کو طلاق دو، یا تعلیم کیلئے فلاں شعبے کا انتخاب کرو (جس کی طرف بچہ راغب نہ ہو) یا فلاں پیشہ اختیار کرو (جس کیلئے بچہ تیار نہ ہو) تو ایسے امور میں والدین کے حکم کی اطاعت واجب نہیں، خواہ یہ (کہنا نہ ماننا) والدین کیلئے باعثِ اذیت و آزار ہی کیوں نہ ہو۔

ولی کی رضامندی

لیکن کنواری لڑکی کی شادی کے مسئلے میں، اگر بالفرض باپ کی اجازت ضروری ہے، (حالانکہ ہم اسے ضروری نہیں سمجھتے) تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ والد کی اطاعت واجب ہے۔ بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ کنواری لڑکی کی شادی کی شرعی حیثیت ولی (باپ یا دادا) کی رضامندی سے مشروط ہے۔ یہ شرط بھی ممکن ہے اس لئے ہو کہ لڑکی کو دھوکا کھانے اور اسے گمراہی میں مبتلا ہونے سے بچایا جائے۔

سوال: میرے والد مجھے ایک لڑکی سے شادی کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں۔ اگر میں ان کی اطاعت نہ کروں تو ممکن ہے میرے اور ان کے تعلقات خراب ہو جائیں۔ اس بارے میں میرا شرعی فریضہ کیا ہے؟

جواب: اگر آپ نے خود کو تکلیف پہنچا کر اپنے والد کی اطاعت کی تو خدا سے اس کی جزا پائیں گے، لیکن اِس مسئلے میں اُن کی اطاعت آپ پر واجب نہیں ہے۔

سوال: اگر میرے والد، میرے سفر پر جانے کے مخالف ہوں، تو کیا میرا یہ سفر، سفرِ معصیت ہو گا؟

جواب: اگر اس سفر میں آپ کی کوئی مصلحت ہو (مثلاً یہ سفر حصولِ علم کیلئے ہو) اور سفر کے دوران آپ کی جان کو کوئی خطرہ بھی لاحق نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ آپ سے ہمدردی اور آپ کی خیر خواہی میں آپ کو اس سفر سے روک رہے ہوں، تو آپ کا یہ سفر سفرِ معصیت نہیں ہوگا۔

سوال: کیا میں اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر ان کے مال میں تصرف کا حق رکھتا ہوں؟

جواب: جب تک والدین کی رضامندی کا علم نہ ہو، اُس وقت تک آپ کیلئے ان کے اموال

میں تصرف جائز نہیں۔ لیکن اگر تصرف کے بعد ان کی رضا مندی کا علم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن معاملات میں تصرف' مثلاً خرید و فروخت وغیرہ' تو اس صورت میں تصرف سے پہلے ان دونوں کی اجازت ضروری ہے۔

سوال: اگر میرے والد بخیل ہوں' تو کیا میں اپنے ضروری لوازمات کی خریداری کیلئے ان کے مال میں سے' ان کی اجازت کے بغیر کچھ رقم لے سکتا ہوں؟

جواب: اگر ایسے اخراجات ہوں جن کی ادائیگی ان پر واجب ہو اور جو آپ کیلئے ضروری ہوں' تو حاکمِ شرع کی اجازت سے آپ کیلئے ایسا کرنا جائز ہوگا۔

سوال: کیا اپنے والد کے ساتھ سودی لین دین جائز ہے؟

جواب: احتیاطِ واجب یہ ہے کہ اس عمل سے گریز کیا جائے' کیونکہ اس عمل کے جواز پر دلالت کرنے والی روایات ضعیف ہیں اور اس مسئلے کے بارے میں جس اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ بھی تعبدی نہیں ہے۔

سوال: اگر میرے والد کسی مسئلے میں اپنی مخالفت کرنے کی وجہ سے' مجھے وراثت سے محروم کر دیں' تو کیا ان کا یہ عمل شرعی اعتبار کا حامل ہوگا؟

جواب: وراثت سے محروم رہنے کی عام طور پر یہ دو صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ: باپ اپنی زندگی اور صحت و سلامتی کے زمانے میں' کسی مال کو اپنی کسی اولاد یا فلاحی ادارے کی قطعی ملکیت میں دے دے۔ ایسی صورت میں کوئی وراثت باقی ہی نہیں رہتی کہ کوئی اس سے محروم رہے۔

اگر منتقلی کی کچھ کارروائی اسکے مرض الموت کے زمانے میں انجام پائی ہو' تو اس کے بارے میں دو نظریات ہیں۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ وہ اپنے اموال کے ایک تہائی حصے کے سوا

بقیہ مال پر (اسے فروخت کرنے یا بخشنے کے) تصرف کا حق نہیں رکھتا۔

لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ مریض شخص، اپنے مرض الموت کے زمانے میں بھی اسی طرح اپنے مال میں تصرف کرسکتا ہے، جس طرح وہ اپنی صحت وسلامتی کے زمانے میں تصرف کرتا تھا۔ اور اسکا تصرف کرنا صحیح بھی ہے۔ اور اسے اس سلسلے میں ورثاء کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اس حالت میں اگر وہ کسی کو وراثت سے محروم کردے تو اسے بھی شرعی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ شرعی اصول یہ ہے کہ: **الناس مسلّطون علی اموالھم** (لوگ اپنے اموال پر تسلط کا حق رکھتے ہیں)۔ لہٰذا وہ بھی اپنی حیات میں اپنے اموال پر تسلط کا حق رکھتا ہے، اور جیسے چاہے اپنے اموال پر تصرف کرسکتا ہے، جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے محروم کردے۔

لیکن اگر بالفرض باپ وصیت کرے کہ اسکی موت کے بعد اسکے ترکے میں رہ جانے والے مال کو اسکے گھرانے کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ افراد کے حوالے کیا جائے اور ایک کو وراثت سے محروم رکھا جائے، تو اسکی یہ وصیت اسکے ترکے کے صرف ایک تہائی پر لاگو ہوگی، بقیہ دو تہائی حصے پر لاگو نہیں ہوگی۔ کیونکہ ایک تہائی سے زیادہ مال کے بارے میں وصیت ورثاء کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر ورثاء اجازت نہ دیں تو وراثت میں سے ہر ایک کا حصہ دیا جائے۔

سوال: کیا دوسروں کے سامنے اپنے گھرانے کے مسائل اور پوشیدہ معاملات کا تذکرہ کرنا غیبت شمار ہوتا ہے؟

جواب: قدرتی بات ہے کہ اگر والدین نے اس پر کوئی ظلم نہ کیا ہو، تو یہ عمل نہ صرف غیبت ہے بلکہ بہت زیادہ گناہ کا باعث بننے والی غیبت ہے۔ کیونکہ جن والدین نے اسے پالا پوسا ہے، یہ اُن کے اسرار فاش ہونے کا موجب ہے۔ یہ عمل والدین کی بے عزتی اور انہیں دوسروں کی نظروں میں گرانے کا سبب ہے۔

البتہ اگر والدین اپنے بچے پر ظلم وستم روا رکھتے ہوں۔ مثلاً اسے مارتے پیٹتے ہوں' اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہوں' تو ایسی صورت میں بچے کو دوسروں کے سامنے اپنا دردِ دل بیان کرنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں ہے کہ: لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (اللہ مظلوم کے سوا کسی کی طرف سے بھی علی الاعلان برا کہنے کو پسند نہیں کرتا۔ سورۂ نساء۴- آیت ۱۴۸)

لیکن احتیاط یہ ہے کہ انسان ایسے مسائل کا ذکر صرف اُن افراد کے سامنے کرے جو اس پر ماں باپ کی طرف سے کئے جانے والے مظالم کا خاتمہ کر سکتے ہوں۔ لیکن مشکلات پیش آنے کی صورت میں انسان جس نفسیاتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے صرف اس سے چھٹکارے کیلئے یہ پیٹھ پیچھے گفتگو شرعاً جائز نہیں۔ بھائی بہنوں کی غیبت کا حکم بھی یہی ہے۔

سوال: میں اپنے والد کے تجارتی ادارے میں کام کرتا ہوں۔ کیا مجھے بھی وہاں کام کرنے والے دوسرے کارکنوں کے برابر اجرت طلب کرنے کا حق حاصل ہے؟

جواب: آپ بھی اجرت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو اتنا مال ملے جس سے آپ کے اخراجات پورے ہو جائیں تو پھر والد پر آپ کا خرچ اٹھانا واجب نہیں ہوگا۔ بالفاظِ دیگر جب تک آپ اپنے والد کے محتاج ہیں' اس وقت تک آپ کی ضروریات پوری کرنا ان پر واجب ہے۔ آپ کے والد کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ کے جو اخراجات برداشت کر رہے ہیں ان کے عوض آپ کو اپنے پاس کام کرنے پر مجبور کریں۔ البتہ آپ اپنے والد سے بات چیت کے ذریعے اس خرچ کی مقدار معین کر سکتے ہیں جو اجرت کی صورت میں ان سے وصول کرتے ہیں۔ اور مثلاً اس میں اضافہ کرا سکتے ہیں۔ والد کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں آپ پر دباؤ ڈالیں اور آپ کو اپنے پاس کام کرنے پر مجبور کریں۔ آپ چاہیں تو دوسری جگہ کام کر سکتے ہیں۔

بہرصورت کوئی باپ اِس بات کو جواز بنا کر اپنی عاقل' بالغ اولاد کو اپنے پاس کام

کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ اُس کے کام کرنے کے عوض اسکا خرچہ برداشت کرتا ہے۔ کیونکہ کام کے عوض خرچے کی ادائیگی ایک طرح کا لین دین ہے' جو حساب و کتاب اور معاہدے کا محتاج ہے۔ لیکن اگر بچہ چھوٹا (نابالغ) اور باپ کی زیرِ پرستی ہو' تو باپ بچے کی مصلحت (اور مفاد) کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے پاس کام کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ کام بچے کی مصلحت اور مفاد میں نہ ہو تو پھر باپ کا یہ عمل جائز نہیں۔

سوال: کیا والدین کا اپنے بچے کے راز جاننے کیلئے اسکی الماری اور درازوں کی تلاشی لینا جائز ہے؟

جواب: ماں' باپ' بہن' بھائی اور بیوی کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان الماریوں اور درازوں کی تلاشی لیں جن میں انسان اپنی ذاتی اور نجی اشیا محفوظ رکھتا ہے۔
بالفاظِ دیگر ہر شخص کے خفیہ معاملات دوسروں کیلئے علاقۂ ممنوعہ ہیں (سوائے اس صورت میں کہ جن معاملات کو وہ خفیہ رکھ رہا ہے ان سے اسکی گمراہی کا خطرہ ہو) اگرچہ یہ دوسرے لوگ اسکے انتہائی قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں' اور وہ خود غلطی ہی پر کیوں نہ ہو۔ چنانچہ کسی کے ذاتی خطوط کھول کر پڑھنا جائز نہیں۔ سوائے اس صورت میں جب اس بات کا خطرہ پایا جائے کہ اس قسم کے روابط کی وجہ سے اسکا دین یا اسکا اخلاق برباد ہو جائے گا۔

تربیت اور آزادی

سوال: میرے والد' میری تربیت کے بہانے' میرے تمام ذاتی معاملات' حتیٰ میرے لباس کی خریداری' میرے بالوں کے اسٹائل' میری کتابوں اور گھر میں میری واپسی کے اوقات تک میں مداخلت کرتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے میری پوری شخصیت کو مجھ سے چھین لیا ہے' کیا انہیں یہ حق حاصل ہے؟

جواب: بنیادی طور پر تو انہیں یہ حق حاصل نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے کو نصیحت کر سکتے ہیں اور

جہاں مصلحت ہو وہاں اس پر کچھ دباؤ بھی ڈال سکتے ہیں۔ البتہ اس حد تک کہ اسکی شخصیت کچل نہ جائے اور اسکی انسانیت چھن نہ جائے۔

میں ہمیشہ بزرگوں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی نوجوانی اور جوانی کے زمانے کو یاد کیا کریں۔ جب آپ کے والد آپ پر زیادتی کیا کرتے تھے' آپ کی انسانیت پر قابض ہو جاتے تھے' آپ کی شخصیت اور جذبات کو کچلتے تھے اُس وقت آپ کے کیا احساسات ہوتے تھے؟ اپنے بچوں سے ویسے ہی پیش آیئے جیسے آپ چاہتے تھے کہ آپ کے بزرگ آپ سے پیش آئیں۔ البتہ اگر آپ کے بچے کو کوئی غیر معمولی خطرہ درپیش ہو تب آپ دخل اندازی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ عمل بھی اس طرح انجام دینا چاہئے کہ آپ کے بچے کو مطمئن کر دے اور اس پر اس انداز سے دباؤ ڈالیں جو اس کی شخصیت کو مجروح نہ کرے اور اس کی پریشانی میں مزید اضافے کا باعث نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے آپ اپنے طرزِ عمل سے کسی ایک پہلو کی تو اصلاح کر دیں لیکن کسی دوسرے اہم ترین پہلو کو خراب کر دیں۔

ہماری رائے میں' بزرگوں کا بچوں کے ساتھ طرزِ عمل میں سختی کو اپنا اصول بنا لینا' جس طرح شرعی اشکال سے خالی نہیں اسی طرح ایک غیر عملی اور غیر حقیقی طریقہ بھی ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ بچے کو دوغلا پن اختیار کرنے کی جانب لے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے والد کے ساتھ منافقانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور اپنے دل میں اس سے کینہ اور عداوت رکھتا ہے۔ اور ممکن ہے مستقبل میں کسی وقت وہ پھٹ پڑے' اور اسکا والد اس میں جس مضبوط شخصیت کی بنیاد رکھنے کا آرزومند ہے' وہ بنیاد اسکی نگاہوں کے سامنے مسمار ہو جائے۔

تمام بزرگوں سے میری استدعا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے طرزِ عمل کی اصلاح اور انہیں خطرات کے منہ سے نکالنے کیلئے نرم طریقے اختیار کریں۔ جو اِن کے ذہن کو مطمئن کریں اور اطاعت کیلئے ان میں ضروری رغبت پیدا کریں۔

حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ باپ اپنے بچے کی اصلاح کی خاطر اختیار کئے گئے طرزِ عمل میں فکری اور جذباتی پہلو سے بھی استفادہ کرے اور بچے کی مادّی ضروریات اور اس کیلئے

پرکشش چیزوں کی فراہمی سے بھی کام لے۔لیکن اگر بچے کے دین اوراخلاق کوکوئی شدید خطرہ لاحق ہواوراچھاانداز اور منفی نتائج کا سبب نہ بننے والا کوئی سخت طریقہ ہی نجات کاواحد راستہ رہ جائے،تو باپ کیلئے جائز ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان سے بچے کی اصلاح کیلئے اقدام کرے۔اسی طرح اپنے بچوں کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی اس کا یہی فریضہ ہے۔

میں اس بات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ بچے اپنے بزرگوں کے مقابل آزادیٔ مطلق کے حامل ہوں، اوران کے خلاف شورش اور سرکشی کریں۔لیکن بزرگوں سے یہ کہنا پسند کرتا ہوں کہ سخت گیری، نرمی اورتربیت ان مسائل میں سے ہیں جن میں مقصود ومراد ایک عملی نتیجے کا حصول ہوتا ہے۔جبکہ سختی اور جبر ہمیں نامطلوب اور منفی نتیجے تک پہنچا دیتا ہے۔ بعض لوگوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ کام کے آغاز کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن ہم کام کے نتیجے اورانجام کے بارے میں سوچتے ہیں۔

ایک روایت میں رسولِ کریمؐ سے نقل ہوا ہے کہ ایک جوان نے آپؐ سے نصیحت کی درخواست کی۔آپؐ نے اس سے تین مرتبہ پوچھا کہ:اگر میں تمہیں نصیحت کروں تو کیا تم میری نصیحت پرعمل کرو گے؟ تینوں مرتبہ جوان نے مثبت جواب دیا۔یہ جواب سننے کے بعد آنحضرتؐ نے اس سے فرمایا: میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جب کسی کام کاارادہ کرو، تواسکے انجام کے بارے میں غوروفکر کرو۔اگرتمہیں راہِ راست کی طرف لے جارہا ہوتو اقدام کرو اوراگرگمراہی کا موجب نظرآرہا ہوتواس سے پرہیز کرو۔(وسائل الشیعہ۔ج۱۵۔ص۲۸۱۔ روایت۲۰۵۱۶)

ہم مسئلے پراسکی شکل وصورت اوراسکے ظاہری پہلو کو پیش نظر رکھ کرنہیں سوچتے، بلکہ اس کے مواداوراسکے مضمون کی بنیادپراس پرغوروفکرکرتے ہیں۔بعض لوگوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ صرف ظاہری شکل وصورت کومحفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ایسے لوگ کیونکہ نتیجے کواہمیت نہیں دیتے اس لئے اس سے غفلت برتتے ہیں

اوراس انداز سے عمل کرتے ہیں کہ گویاان کے اعمال قطعی اور یقینی نتائج کے حامل ہیں۔

اس مقام پر ہم بزرگوں کو جس نکتے کی جانب متوجہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بعض طرزِعمل بچوں میں ایسی پیچیدگیوں کا سبب بنتے ہیں جو انہیں زندگی میں ناکام ونامراد اور پچھڑا ہوا بنادیتی ہیں اوران کی نفسیاتی حالت اور دوسروں سے تعلقات میں منفی اثرات مرتب کرتی ہیں اور دوسروں کے سامنے ان کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے کا سبب بنتی ہیں۔

لہٰذا بزرگوں کو چاہئے کہ بچپنے ہی سے اپنے بچے کی تربیت کا آغاز اس نکتے سے کریں کہ یہ (بچہ) صرف ایک ماڈی پیکرنہیں ہے' جسے وہ اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں بلکہ یہ روح' عقل' فکراوراحساس وشعور کا بھی مالک ہے۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ اپنے بچے کے ساتھ طرزِعمل کا انتخاب کرتے ہوئے اِن تمام امور کو بھی ملحوظ رکھیں۔

عورت کا بناؤ سنگھار

سوال: کیا عورت کیلئے ایسے کنگن یا انگوٹھی پہننا جائز ہے جو دوسروں کو اس کی جانب متوجہ نہ کرتے ہوں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے قول: **وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** (اوراپنی زینت کا اظہار نہ کریں' علاوہ اس کے جوخود بخود ظاہر ہے۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۱) سے استفادہ ہوتا ہے کہ بدن کے ظاہر ہونے والے اعضا پر زیور پہننا جائز ہے۔ یعنی انگوٹھی اوراسی کی مانند دوسرے زیورات پہننا جائز ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ زینتیں دوسروں مین ہیجان کا باعث نہ بنیں۔

سوال: عورت کیلئے عطر (perfume) کے استعمال کا حکم کیا ہے؟

جواب: عورت کیلئے خوشبو لگا کر گھر سے نکلنا جائز ہے۔ وہ اس حد تک خوشبو استعمال کرسکتی ہے جو دوسروں کیلئے ہیجان انگیز نہ ہو' اور جن کے دلوں میں بیماری ہے' ان کی نفسانی

خواہشات کو نہ بھڑکائے۔ یعنی دوسروں کے ناپاک احساسات کو اپنی جانب مبذول نہ کرے۔ اگر ایسا ہو تو خوشبو لگانا مکروہ بلکہ بعض اوقات حرام ہے۔

سوال: بناؤ سنگھار (make-up) کی غرض سے چمکنے والے ستاروں کا لگانا کیسا ہے؟
جواب: اگر تبرج (خودنمائی) کی علامت اور ہیجان انگیز ہو تو جائز نہیں۔

سوال: کیا عورت کا پیر کو چھپانے کیلئے باریک موزے پہننا کافی ہے؟
جواب: اگر موزہ اس قدر باریک ہو کہ پیر صاف نظر آئے، تو پوشش یعنی پوشیدگی کا عنوان صادق نہیں آتا۔ مزید یہ کہ ممکن ہے ہیجان انگیز ہونے کی باعث حرام بھی ہو۔

سوال: کیا عورت کیلئے نامحرم مردوں کی موجودگی میں مجالسِ عزا میں لحن کے ساتھ اشعار پڑھنا اور قرانِ کریم کی تلاوت کرنا جائز ہے؟
جواب: اگر آواز موضوع یا محفل کے ماحول کے لحاظ سے اس قدر ہیجان انگیز نہ ہو جو بیمار دلوں میں نفسانی خواہش پیدا کر دے، تو جائز ہے۔

مصنوعی بالوں سے حجاب

سوال: اگر مصنوعی بال اصل بالوں کو چھپالیں، تو کیا اس پر بالوں کو چھپانے کا شرعی حکم صادق آئے گا؟

جواب: مصنوعی بال دو عنوان کے حامل ہیں۔ ایک عنوان حقیقی بالوں کو چھپانا ہے۔ اس لحاظ سے کوئی حرمت نہیں رکھتے۔ کیونکہ حقیقی بالوں کو چھپانا، جو شرع کا تقاضا ہے، وہ مصنوعی بالوں سے بھی پورا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے عنوان کا تعلق خود آرائی، بناؤ سنگھار، اور دوسروں کے ہیجان میں مبتلا ہونے سے ہے۔ مصنوعی بالوں کا یہ استعمال قطعاً حرام ہے۔ اس صورت میں

عورت، عملی اور مادّی لحاظ سے پردہ کرنے کے باوجود، معنوی لحاظ سے بے پردہ ہے۔ جبکہ دراصل فزیکل اور ظاہری پردے کو معنوی پردے کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔

مصنوعی بالوں کا استعمال ان مسلمان خواتین کی مشکل کا شرعی حل ہوسکتا ہے جن کو رسمی نظام یا غیر رسمی حالات بے حجابی پر مجبور کرتے ہیں۔ جیسا کہ کافر اور ظالم ممالک میں ہوتا ہے جہاں مسلمان طالبات تعلیمی اداروں سے اخراج کے ڈر سے یا قید و بند وغیرہ کے خوف سے حجاب ترک کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہیں۔ اور یہ حالات حصولِ علم اور دوسرے اہم امور سے ان کی محرومی کا باعث بن جاتے ہیں اور ان کیلئے شدید مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔

ان حالات میں ایسی خواتین کیلئے مصنوعی بالوں سے استفادہ کرنا جائز ہے۔ اس طرح وہ اپنے حقیقی بالوں کو کھلا رکھنے سے بچاتے ہوئے (کیونکہ ان کا کھلا رکھنا قطعاً حرام ہے) اپنے اوپر پڑنے والے دباؤ اور جبر سے نجات حاصل کریں۔ شدید سختی (حرج) کو دور کرنے کی غرض سے ایسی زینت کو ظاہر کرنا جائز ہے۔

رقص و موسیقی

سوال: عورتوں اور مردوں کیلئے رقص و موسیقی کا کیا حکم ہے؟ کیا عورت اپنے شوہر کیلئے رقص کر سکتی ہے؟

جواب: رقص کے بارے میں ہماری رائے، آقائی خوئیؒ کی رائے (۱) کے موافق ہے۔ جس کے مطابق مردوں کا خود مردوں کے درمیان رقص کرنا اور عورتوں کا (مردوں کے سامنے نہیں) خود عورتوں کی محفل میں رقص کرنا حرام نہیں۔ البتہ یہ رقص ایسا ہیجان انگیز نہ ہو کہ دوسری عورتوں کو گمراہی کی طرف لے جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس صورت میں یہ رقص جائز

۱۔ ''المسائل الشرعیہ'' استفتاتِ السید خوئی۔ ج ۲۔ ص ۳۱۔ سوال ۴۳: کیا شادی بیاہ جیسے مراسم میں مردوں کا ناچنا اور تالیاں بجانا جائز ہے؟ کیا یہی عمل عورتوں کیلئے جائز ہے؟ جواب: ان اعمال میں فی نفسہ اس صورت میں کوئی مضائقہ نہیں جب یہ اعمال کسی حرام عمل کے ہمراہ نہ ہوں، جیسے مردوں اور عورتوں کا اختلاط اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

نہیں۔ عورتوں اور مردوں کا ایک ساتھ رقص کرنا جائز نہیں۔ نامحرم مرد کے سامنے عورت کا رقص کرنا بھی جائز نہیں۔ لیکن عورت کا اپنے شوہر کیلیئے رقص کرنا، چاہے ہیجان انگیز ہو، تب بھی جائز ہے۔

ہاں، حرام موسیقی وہ ہے جو نفسانی خواہش کو بھڑکا دے اور شہوت کو ابھار دے۔ فقہا اس حالت کو "اہل فسق کے لحن کے ساتھ تناسب رکھنے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ہلکی پھلکی موسیقی جو اعصاب کو آرام بخشے اور صحیح معنی و مفہوم کے ساتھ ہو، جائز ہے۔ اسی طرح رزمیہ موسیقی بھی جائز ہے۔

سوال: اس کلاسیکی موسیقی کا حکم کیا ہے جو رقص کے ماحول سے مناسبت رکھتی ہے؟
جواب: اگر یہ موسیقی ہیجان انگیز اور جنسی جذبات بھڑکانے والی فضا سے مناسبت نہ رکھتی ہو، تو حرام نہیں۔ فقہا جو یہ فرماتے ہیں کہ اہلِ فسق سے متناسب الحان حرام ہے، اس سے مراد وہ الحان (آہنگ) ہے جو فسق پر منتہی ہو اور فسق کی فضا اور ماحول سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس قسم کا الحان اپنی نغمگی اور دھن کے لحاظ سے ہیجان انگیز ہوتا ہے، اور حرام ہے۔ جیسا کہ اگر غنا کے ہمراہ بھی ہو، تو حرام ہے۔

خانگی تعلقات

سوال: کیا میاں بیوی کو شادی سے پہلے کے حالات اور تعلقات اپنے شریکِ حیات سے چھپانے کا حق حاصل ہے؟
جواب: اگر ان لوگوں نے یہ شرط رکھی ہو کہ وہ اپنی شادی سے پہلے کے واقعات اور تعلقات کو بیان کریں گے تو یہ شرط پوری کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر یہ شرط نہیں رکھی ہو تو ان میں سے کسی کو بھی شرعی لحاظ سے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کی گزشتہ زندگی کے متعلق جاننے کی کوشش کرے۔ اگرچہ دونوں فریقوں پر لازم ہے کہ باہمی اعتماد کی بنیادوں کو مضبوط کریں

اوران امور کے بارے میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں جوان بنیادوں کی مضبوطی اوران کی مشترکہ زندگی کے استحکام کیلئے موثر ہوں۔

سوال: میں ایک بالغ لڑکی ہوں' ابھی میرے والد زندہ ہیں' حتیٰ اگر وہ زندہ نہ ہوں تب بھی کیا میرے بڑے بھائی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھ پر اپنے فیصلے مسلط کرے اور مجھے روک ٹوک کرے؟

جواب: بھائی کو اپنی بہن پر کوئی شرعی حق حاصل نہیں' سوائے اس شرعی حق کے جو ایک مومن دوسرے مومن پر رکھتا ہے کہ اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے' اسے وعظ ونصیحت اور ہدایت ورہنمائی کرے۔اسی طرح باپ بھی اپنی بالغ اور باشعور (Mature) لڑکی پر کسی قسم کا شرعی تسلط نہیں رکھتا۔ سوائے اس حق اور فریضے کے جو ہر مومن' دوسرے مومن کے بارے میں رکھتا ہے' اور جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور نصیحت ووعظ وارشاد ہے۔لہٰذا وہ حق جس کا بڑا بھائی (یا باپ) ادعا کرتے ہیں اگر وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دائرے سے باہر ہو' تو اسے کسی قسم کا شرعی اعتبار حاصل نہیں۔

سوال: میں نے ایک بے پردہ لڑکی کو حجاب کا قائل کیا' اور اسکا پابند کیا۔لیکن اب جب میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میرے گھر والے اس بہانے سے کہ اسکا پردہ مجھے دھوکا دینے کیلئے ہے' اس شادی کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جبکہ میرا خیال ہے کہ اس نے پردے کو دل سے قبول کیا ہے' اور اس پر یقین رکھتی ہے۔اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اس جوان کو میری نصیحت ہے کہ اس مسئلے پر کافی غور وخوض سے کام لے۔ کیونکہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں جذبات واحساسات حقیقت پر غالب نہ آ گئے ہوں۔ ممکن ہے اس لڑکی نے بھی آپ سے شادی کی خاطر اپنے آپ کو آپ کی خواہش کے مطابق ڈھال لیا ہو اور شادی کے بعد جب مقصد پورا ہو جائے تو حجاب چھوڑ دے اور آپ کو دباؤ

میں لے لے۔

لہٰذا ہم اس جوان سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ لازماً اپنے گھر والوں کی بات پر عمل کرے لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر غیر جذباتی ہو کر غور و فکر کرے۔ تاکہ مثبت نتیجے تک پہنچ کر اپنے اہلِ خانہ کو مطمئن کر سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے جس کا اظہار اسکے گھر والے کر رہے ہیں۔

سوال: میں ایک لڑکی ہوں، اور گھر کے اندر ایسا مختصر لباس پہنتی ہوں جس سے میری پنڈلیاں اور سینہ تقریباً کھلا نظر آتا ہے۔ گھر میں میرے جوان بھائی بھی ہیں، کیا میرا یہ عمل خلافِ شرع ہے؟

جواب: یہ عمل تو خلافِ شرع نہیں، لیکن اگر آپ محسوس کریں کہ آپ کا اس طرح رہنا گھر میں گمراہ کن ماحول پیدا کر رہا ہے۔ بالخصوص ان غیر اخلاقی فلموں کے ہوتے ہوئے جو ممکن ہے آپ کے بھائی بھی دیکھتے ہوں اور ان میں ہیجان پیدا ہوتا ہو۔ لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ اپنے گھر سے گمراہ کن اور تحریک انگیز عوامل کو دور رکھیں۔

افسوس کی بات ہے کہ (بعض) معاشروں میں معاملہ یہاں تک جا پہنچا ہے کہ ویڈیوز اور فلموں کے اثرات کی وجہ سے اخلاقی گمراہی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ لوگ اپنے محرموں کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنے لگے ہیں۔ (بیروت میں) امورِ شرعیہ کے ہمارے دفتر میں باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن کے درمیان وحشیانہ صورت میں اور جبر و تشدد کے ساتھ ناجائز تعلقات کے قیام کے معاملات پیش ہوتے ہیں۔ یہ باتیں معاشرے کیلئے خطرے کی گھنٹی کی حیثیت رکھتی ہیں، اور معاشرے کا فرض ہے کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ ان گمراہیوں اور انحرافات کے خلاف جنگ کرے، اور ان کے انسداد کے ذرائع تلاش کرے۔ انسداد اور روک تھام کے ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ یہ ہے کہ جوان لڑکیاں اپنے گھر میں بھی ہیجان انگیز لباس پہننے اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے پرہیز کریں۔

سوال: عورت اپنے محرم افراد کے سامنے کس حد تک اپنا جسم کھلا رکھنے کی مجاز ہے؟
جواب: عورت اپنی شرمگاہ اور جسم کے ہیجان انگیز حصوں کے سوا اپنے بدن کے تمام حصوں کو محرم افراد کے سامنے کھلا رکھنے کی مجاز ہے۔ عورت کیلئے اپنے باپ، بھائی اور چچا، ماموں کے سامنے اپنا سینہ کھلا رکھنا حرام نہیں ہے۔ لیکن کیونکہ یہ عضو ہیجان انگیز ہے اور عام طور پر اسے ایک جنسی عضو کی مانند سمجھا جاتا ہے لہٰذا عورت کیلئے ضروری ہے کہ وہ اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھے۔

سوال: میرے والد زیر جامہ (underwear) پہن کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ کیا اس عمل میں شرعاً کوئی مضائقہ ہے؟
جواب: اس حالت میں آپ کا انہیں دیکھنا حرام نہیں ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ باپ اس حالت میں اپنی لڑکیوں کے سامنے نہ آئے۔ اسی طرح بھائی کو بھی چاہئے کہ اس حالت میں اپنی بہنوں کا سامنا نہ کرے۔ کیونکہ بسا اوقات یہ حالت گمراہی کا سبب بن جاتی ہے اور اس صورت میں حرمت کا عنوانِ ثانوی اس پر لاگو ہو جاتا ہے۔

سوال: میرے والد شراب نوشی کرتے ہیں اور والدہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کیلئے جام تیار کریں۔ کیا میری والدہ یہ کام کر کے کسی شرعی گناہ کی مرتکب ہوتی ہیں؟ کیا میری والدہ اس کام کی انجام دہی سے انکار کر سکتی ہیں؟
جواب: اگر آپ کی والدہ کو اس بات کا خوف ہو کہ انکار کی صورت میں انہیں طلاق دے دی جائے گی، یا زدوکوب کیا جائے گا، یا اُن سے ناقابلِ برداشت بدسلوکی کی جائے گی، تو اُن کیلئے (اپنے شوہر کی) یہ بات ماننا جائز ہے۔
لیکن اگر مذکورہ باتوں کا خوف نہ ہو، تو واجب ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خواہش ماننے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ اولاً تو یہ عمل حرام ہے، اور ثانیاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

اعتبار سے اس کا انکار کرنا واجب ہے۔

سوال: ہمارے والد، ہمارے سامنے اظہارِ محبت کے طور پر ہماری والدہ کے رخسار چومتے ہیں، انہیں اپنی بانہوں میں لیتے ہیں۔ کیا اس عمل میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے؟
جواب: اگر اس عمل میں جنسی معنی و مفہوم نہ پایا جاتا ہو، یعنی عرف کے اعتبار سے یہ عمل اپنے بیٹے یا بیٹی کے رخسار کو بوسہ دینے کی مانند معمول کی اور عام سی بات ہو، تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر بالفرض عرف اسے ایک جنسی اور ہیجان انگیز تصرف سمجھے تو باپ کیلئے مناسب ہے کہ وہ اپنی اولاد کے سامنے اس عمل سے اجتناب کرے۔

سوال: کیا چھوٹے بچوں کو برہنا چھوڑ دینا جائز ہے؟
جواب: اگر یہ مسئلہ ایک منکرِ شرعی شمار کیا جائے تو واجب ہے کہ مائیں اس عمل سے پرہیز کریں۔ لیکن مذکورہ فرض میں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ عمل بذاتہ حرام نہیں۔

سوال: کیا عورت کا اپنے شوہر کے دوستوں کا اپنے گھر میں استقبال کرنا جائز ہے؟
جواب: اس بارے میں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی اخلاق عورت اور اُس کے شوہر کے دوستوں کے درمیان اِس قسم کے میل جول کی ممانعت کرتا ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی یہ عمل ایک قسم کی گمراہی کا باعث ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج ہمیں بہت سی ازدواجی اور اخلاقی مشکلات میں دکھائی دیتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب ایسے گھروں میں شادی کی عمر رکھنے والی یا دوسروں کیلئے کشش رکھنے والی جوان لڑکیاں موجود ہوں۔

ہم کہتے ہیں کہ اسلام بنیادی طور پر اجنبی عورتوں اور مردوں کے ایک دوسرے سے دور رہنے کا قائل ہے۔ اختلاط اور آزادانہ میل جول صرف اس صورت میں جائز ہے جب منفی نتائج برآمد نہ ہونے کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ اور فی زمانہ ایسا اطمینان کم ہی حاصل

ہوتا ہے۔ ہم اپنی اس گفتگو سے معاشرے میں موجود مردوں اور عورتوں کے درمیان بداعتمادی پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس حقیقت اور واقعیت کا ذکر کررہے ہیں جس کے پیش نظر ایسے مواقع پر احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

سوال: کیا گھریلو تقریبات میں عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رکھنا واجب ہے؟

جواب: اسلامی تعلیمات (نامحرم) عورتوں اور مردوں کے درمیان دوری کا تقاضا کرتی ہیں۔ کیونکہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس طرح کا اختلاط جو حتیٰ دیندار عورتوں اور مردوں میں بھی ایک سماجی رسم بن گیا ہے کبھی کبھی ازدواجی زندگی میں مشکلات و مسائل پیدا کردیتا ہے۔

ممکن ہے مرد اپنے دوست کی بیوی میں ایسی صفات دیکھ کر جو خود اسکی اپنی بیوی میں نہ ہوں اسکی طرف راغب ہو جائے۔ بالخصوص اگر فضا اس قدر دوستانہ ہو کہ تمام رکاوٹیں اور حجاب ہٹ جائیں اور لوگ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے بات چیت کا ایسا رابطہ برقرار رکھیں جیسا اپنی شریکِ حیات سے گفتگو کرتے ہیں۔

لہٰذا ہماری رائے ہے کہ ایسے ماحول اور ایسی رسم کیلئے جس کی ابھی بنیاد پڑ رہی ہے اجتماعی تقریبات میں عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کیلئے اخلاقی ضابطے معین کئے جانے چاہئیں۔

سوال: میرے والد عمر رسیدہ ہیں اور کام کرنے کے قابل نہیں، میں اپنے گھر کی واحد کفیل ہوں۔ ایک شخص نے مجھے شادی کی پیشکش کی ہے۔ کیا میرے لئے جائز ہوگا کہ میں کام کروں اور اپنی زندگی گزاروں اور اپنے گھرانے کو اس کے حال پر چھوڑ دوں؟

جواب: آپ کیلئے شادی کرنا جائز ہے۔ بالخصوص اگر آپ کو شادی کی ضرورت ہو۔ اس بات کے پیش نظر کہ آپ کے اخراجات اٹھانا شوہر کی ذمے داری ہوگی، اگر آپ کے

گھرانے کے اخراجات پورے کرنے والا کوئی نہ ہو اور آپ ان کے اخراجات اٹھا سکتی ہوں' تو اگر والدین کی کفالت کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو تو صرف ان کی کفالت آپ پر واجب ہے۔ اور اگر ایسا نہ کرسکیں تو آپ پر واجب نہیں۔ بہرصورت آپ کے شادی کرنے میں کسی قسم کا گناہ نہیں۔

سوال: کیا لڑکوں پر اپنے والدین کی کفالت کرنا واجب ہے؟
جواب: جس طرح ضرورت مند اور خالی ہاتھ بچوں کے اخراجات پورے کرنا والدین پر واجب ہے' اسی طرح قطعی طور پر ضرورت مند والدین کے اخراجات پورے کرنا بچوں پر واجب ہے۔ اس مسئلے میں لڑکے اور لڑکی' چھوٹے اور بڑے بچے کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ سب ہی پر واجب ہے۔

بچے کو جسمانی سزا دینا

سوال: تربیت و تادیب کیلئے کس صورت میں بچے کی پٹائی کی اجازت دی گئی ہے؟ اور اگر والدین اس حد سے تجاوز کریں اور شدت سے کام لیں تو ان پر کیا واجب ہوگا؟
جواب: اسلام' بچے کو والدین کے پاس ایک امانت سمجھتا ہے۔ اس نے اگر باپ کو بچے پر ولایت کا حق دیا ہے' تو اِس ولایت کے معنی بچے پر باپ کا مطلق تسلط نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ باپ جس طرح چاہے اپنے سلیقے اور مزاج کے مطابق بچے سے سلوک روا رکھے۔ بلکہ اس پر لازم ہے کہ بچے کی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر عمل کرے۔ اسے حق نہیں کہ اس کے ساتھ اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانے والا یا مفسدہ آمیز سلوک کرے۔

باپ پر واجب ہے کہ اپنے بچے کی تربیت کرے اور وہ تمام وسائل و ذرائع کام میں لائے جو بچے کے دیندار ہونے' اسکے علم و دانش اور اخلاقِ صالحہ سے آراستہ ہونے اور دوسروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کے سلسلے میں موثر ہوں۔

جب تک تربیت کے دوسرے ذرائع موجود ہوں، باپ کو بچے پر سختی اور جبر سے کام لینے کا حق حاصل نہیں۔ لیکن اگر تربیت کیلئے بچے کی پٹائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو تربیت کے ایک طریقے کے عنوان سے وہ اسے مار سکتا ہے۔ یعنی پٹائی بچے پر نفسیاتی اور جسمانی دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ہو۔ اس عمل کے دوران بھی حد سے تجاوز اور بے رحمی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہئے۔

شرع مقدس نے بچے کی پٹائی کیلئے بھی ایک حد مقرر کی ہے۔ اور وہ حد یہ ہے کہ اس قدر نہ مارا جائے کہ بدن سرخ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو باپ گناہگار ہوگا اور اس پر دیت کی ادائیگی بھی واجب ہوگی۔

لیکن اگر کسی مقام پر بچے کو کوئی بڑا خطرہ درپیش ہو اور سخت پٹائی کے سوا اُسے اس سے روکنے کا کوئی اور راستہ موجود نہ ہو، تو اس خطرے سے اُسے محفوظ رکھنے کی غرض سے باپ کیلئے اسے سختی سے مارنا جائز ہے۔ البتہ ان حالات میں باپ کو نہایت سوچ بچار سے کام لینا چاہئے اور یہ اطمینان حاصل کر لینا چاہئے کہ معاملہ اس خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس پر لازم ہے کہ اپنے بچے کو غیر معمولی تنبیہ کرے۔ باپ کو محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ اس پر مبہم رہ جائے اور اچھی نیت رکھنے کا باوجود وہ خطا کا شکار ہو جائے اور حلال سمجھتے ہوئے حرام کا مرتکب ہو بیٹھے۔

سوال: کیا مرد یہ دلیل دے کر کہ اسکی بیوی بچوں کو مار کوٹ کر ان کی اچھی تربیت نہیں کر رہی، اُسے اِس عمل سے روک سکتا ہے؟

جواب: عورت کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اسکے بچوں کی تادیب (تنبیہ) کیلئے انہیں زدوکوب کرے۔ لیکن تادیب اور تربیت کی غرض کے بغیر (بچوں کو) مارنا ماں اور باپ دونوں کیلئے حرام ہے۔ اور تادیب و تربیت کی غرض سے مارنے کیلئے بھی بچے کے باپ یا اسکے شرعی ولی کی اجازت ضروری ہے۔

سوال: کیا اسکول کے پرنسپل یا اساتذہ، اپنے طالبِ علموں کی تربیت کیلئے انہیں مار پیٹ سکتے ہیں؟

جواب: اگر بچے کے باپ یا اسکے شرعی ولی نے استاد (teacher) کو اس بات کی اجازت دی ہو (تو استاد ایسا کر سکتا ہے)۔ اور وہ اس طرح کہ وہ جانتے ہوں کہ بعض حالات میں بچے کو کسی عمل سے باز رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا استاد کیلئے جائز ہے کہ اگر تمام درست اور اچھے طریقے (اگر یہاں یہ تعبیر صحیح ہو تو) استعمال کرنے کے بعد بھی معاملہ اس حد تک جا پہنچے کہ مارنا ضروری ہو جائے تو شرعی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ عمل انجام دیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا بالغ اور سمجھدار (mature) لڑکی، اپنے گھر والوں کی مخالفت کی صورت میں اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کیلئے گھر چھوڑ کر جا سکتی ہے؟

جواب: ہر چند بعض فتاویٰ، لڑکی کی شادی کے سلسلے میں باپ کی اجازت کو ضروری نہیں سمجھتے، پھر بھی مشرقی لڑکیوں کو میری نصیحت یہ ہے کہ وہ اپنے گھرانے، بالخصوص اپنے والد کی رضامندی کے بغیر شادی نہ کریں۔ کیونکہ اس قسم کی شادی مستقبل میں اسکی اور اسکے شوہر کی زندگی کو پیچیدگیوں سے دوچار کر دے گی اور بہت سی خاندانی اور ازدواجی مشکلات کا باعث ہو گی اور ازدواجی زندگی کو عدم استحکام اور بے اطمینانی کی طرف لے جائے گی۔ جبکہ شادی کا مقصد جسمانی اور اجتماعی سکون واطمینان ہے۔

لیکن اگر والدین لڑکی پر جبر کریں اور اسے اپنے کفو اور ہم پلہ شخص سے شادی کی اجازت نہ دیں اور ان کا مقصد یہ ہو کہ لڑکی تاحیات ان کی خدمت کرتی رہے۔ یا والدین نے اپنی پسند سے کسی شخص کو اُس کیلئے منتخب کیا ہو اور لڑکی کو اِس کی پسند اور خواہش کے برخلاف اُس شخص کے ساتھ شادی پر مجبور کریں، یا پھر وہ دقیانوسی رسم و رواج کے اسیر ہوں (جیسے کہ بعض معاشروں میں صرف چچازاد یا خالہ زاد بہن بھائی کے درمیان ہی شادیاں کی جاتی ہیں) اور اپنے لڑکے یا لڑکی کی مصلحت کو مدِنظر نہ رکھیں اور ان کیلئے زندگی کو اس قدر

سخت کردیں کہ ان کے پاس اس گھٹن زدہ ماحول اور خاندان کے چنگل سے نکلنے کے سوا کوئی اور راستہ باقی نہ رہے۔ اور واحد راہِ حل گھر والوں کی اجازت کے بغیر شادی رہ جائے، تو ایسی صورت میں اس قسم کی شادی میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہاں زیر بحث موضوع کی مناسبت سے، گھر کے بڑوں کو میری نصیحت ہے کہ انہیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ والدین کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی حیثیت گھر کے مال واسباب کی سی نہیں ہے اور نہ ہی وہ احساس سے عاری کوئی شے ہیں۔ بلکہ ان کی بھی آرزوئیں اور خواہشات ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے جوانی میں ان کے والدین کی بھی تمنائیں اور خواہشات ہوا کرتی تھیں۔ والدین سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے اُس وقت کے احساسات کو یاد کریں جب اُن کے ماں باپ اُن پر سختی کرتے تھے۔ اور پھر ایسی ہی آرزوئیں رکھنے والے اپنے جوان لڑکے یا لڑکی کے احساسات پر انہیں منطبق کریں۔

والدین کو چاہئے کہ اپنے بچوں کی خواہشات کے حصول کے سلسلے اُن کی مدد کریں تاکہ وہ ایک فطری اور اطمینان وسکون سے بھرپور زندگی بسر کریں۔ شادی باپ کو تو کرنی نہیں جو اسکی بہو میں اسکے مزاج کے مطابق صفات پائی جائیں۔ اسی طرح ماں کو تو شادی نہیں کرنی کہ داماد میں پائی جانے والی صفات اس کی پسند کے مطابق ہوں۔ جوان (لڑکا یا لڑکی) شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پس اُس کے شریکِ حیات کو اُس کی پسند اور مزاج کے مطابق ہونا چاہئے۔ کیونکہ اسے زندگی بسر کرنی ہے اور اسی کو زندگی کی گاڑی کھینچنی ہے۔

لہٰذا لڑکے یا لڑکی پر شریکِ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں کسی بھی قسم کا سخت دباؤ ڈالنا، شفقت ومحبت سے عاری ایک غیر انسانی عمل ہے۔ والدین پر ان کے بچوں کا (خواہ یہ بچے لڑکے ہوں یا لڑکیاں) حق یہ ہے کہ وہ ان کی رائے کو سنیں، اس پر بحث وگفتگو کریں اور جس چیز کو ان کی مصلحت سمجھیں اس کے بارے میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ اور اگر اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں مطمئن نہ کرسکیں اور ان کا لڑکا یا لڑکی یہ سمجھے کہ جس

چیز کا انتخاب اس نے کیا ہے وہی بہتر ہے' تو ایسے حالات میں والدین کو چاہئے کہ اپنے ان بچوں کو تجربے کا موقع دیں' تا کہ وہ مستقبل کی ذمے داری خود اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔

اس تجربے کے دوران بھی والدین کو چاہئے کہ اپنے بچوں پر نظر رکھیں۔ کیونکہ اس موقع پر انہیں تنہا چھوڑنا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض والدین اپنے بچوں سے کہتے ہیں کہ: اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہمارا تم سے کوئی ناطہ نہیں رہے گا' ہم تمہاری کسی بات کے ذمے دار نہیں ہوں گے۔

ہمیں اپنے بچوں کو تجربات پر ابھارنا چاہئے' خواہ ہماری رائے نہ ماننے کی وجہ سے ان کا یہ تجربہ ناکامی سے دوچار ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ناکامی کی صورت میں بھی ہمیں ان کی مدد کرنی چاہئے۔ تا کہ کم سے کم نقصان کے ساتھ وہ اس صورتحال سے باہر نکل آئیں۔ یہی زندگی کا دستور ہے۔

ہم والدین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس نکتے کو سمجھ لیں کہ ان کے بچے اپنی ولادت کے ابتدائی دنوں میں ان کے وجود کا ایک حصہ تھے لیکن اب بڑے ہونے کے بعد ان کے وجود کا حصہ نہیں رہے ہیں۔ وہ ایک دوسری انسانی شخصیت اور علیحدہ افکار و خیالات' آرزوئیں اور تمنائیں رکھنے والے انسان ہیں۔ اور والدین کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ ان پہلوؤں میں ان پر ظلم روا رکھیں۔

سوال: میں اپنے والد کے خلاف شریعت اعمال کی وجہ سے اپنے گھر میں رہنے کی سکت نہیں رکھتا۔ کیا میں اپنے حالات سے واقف اپنے کسی عزیز یا دوست کے گھر منتقل ہو سکتا ہوں؟

جواب: ہم محض والدین میں سے کسی کے گمراہ ہونے کی وجہ سے ان کے بچوں کے ان سے علیحدہ ہونے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ عمل اس حسنِ معاشرت کے منافی ہے جسے کافر' فاسق اور گمراہ والدین تک سے روا رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ رب العزت فرماتا ہے: وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (اور اگر تمہارے ماں باپ اس بات پر زور دیں کہ کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ، جس کا تمہیں علم نہیں ہے، تو خبردار ان کی اطاعت نہ کرنا، لیکن دنیا میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۵)

آیت میں مشرک والدین کا تذکرہ ہے، اس حساب سے دیکھیں تو گمراہ مسلمان والد کے مقابل آپ کا فریضہ کیا ہونا چاہیے؟

خداوندِ عالم بچوں سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے کافر، گمراہ اور فاسق والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں، ان کے ساتھ زندگی بسر کریں، ان کے ساتھ نرمی برتیں اور محبت کے ساتھ اپنے شانوں کو ان کے سامنے جھکائے رکھیں، ان کے راہِ راست پر آنے کیلیئے دعا اور کوشش کریں اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کریں۔

لیکن اگر گمراہ یا کافر ماں یا باپ کے ساتھ بچے کا رہنا، بچے پر منفی اثرات مرتب کرنے اور اسکے گمراہی میں مبتلا ہونے کا باعث ہو اور اس گمراہی سے بچنے کا کوئی راستہ بھی نہ ہو، اس ماحول میں وہ دینی فرائض کی پابندی نہ کر سکے، تو ایسی صورتحال میں بعض اوقات گھر چھوڑنا جائز ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی والدین سے دوری اختیار کرنا واجب بھی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں اُسے چاہیئے کہ کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں بغیر کسی دباؤ اور خطرے کے اپنے دینی فرائض پر عمل کر سکے۔

سوال: بچہ کس وقت ممیّز ہوتا ہے اور ایک ممیّز بچے کو جو حدود و قیود ملحوظ رکھنا چاہئیں وہ کیا ہیں؟

جواب: ممیّز بچہ وہ ہے جو شعور و آگہی اور جسمانی صلاحیت کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکا ہو جہاں وہ انسان کی شخصیت میں موجود جنسی پہلو کو محسوس کرنے لگے اور جنسِ مخالف کو چھو کر یا اسے دیکھ کر اس سے متاثر ہونے لگے اور اس میں جنسی خواہش پیدا ہو۔

شاید ممیّز بچے کی قریب قریب یہی تعریف ہو۔ ممیّز بچے کے بارے میں اثباتی پہلو رکھنے والے بعض احکام کا ذکر بھی ہوا ہے۔ مثلاً اسکی شرعی عبادات، بقول علما کے نماز، روزہ اور

حج کی مانند اسکی عبادات درست ہیں۔ نیز اگر اس کے بعض معاملات معمول کی صورت سے انجام پائیں تو مستقل طور پر معتبر ہیں۔

اس کے بعض احکام سلبی پہلو کے حامل بھی ہیں۔ مثلاً اس کا دیکھنا اور چھونا۔ کیونکہ ان کا تعلق بلوغ سے متعلق قوانین سے ہے۔ اور دلائل کی رو سے جب تک بچہ بالغ نہ ہو جائے اس پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔ لہٰذا ممیّز بچے کا نامحرم عورت کو بغیر حجاب کے دیکھنا اور اس سے مصافحہ کرنا جائز ہے۔ اس بارے میں موجود عام دلائل اس حکم کی بنیاد ہیں۔ لیکن بعض فقہا کی رائے ہے کہ شرع کے مزاج کا تقاضا ہے کہ انسان کو ہر اس جگہ سے دور رکھا جائے جو اس کے گمراہ ہونے اور اس کی نفسانی خواہشات بھڑکانے کا موجب ہو' چاہے یہ انسان ابھی کمسن ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ بعض فقہا کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ بڑوں سے زیادہ بچوں کیلئے حساس ہے۔ کیونکہ اس کا بے حجاب عورت کو دیکھنا' یا اس کو چھونا بعض اوقات اس کے جنسی احساسات کو ایک پیچیدہ شکل میں بھڑکاتا ہے اور اس کی زندگی پر برے اثرات مرتب کرتا ہے۔

اس مسئلے میں بعض فقہا کی رائے اس آیت سے ماخوذ ہے: اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (اور وہ بچے جو عورتوں کی پردے کی بات سے واقف نہ ہوں۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۱)۔ اس آیت کے زیر اثر فقہا اِس مسئلے میں ان بچوں کے بارے میں احتیاط کے قائل ہیں جو خواتین کے پردے کی بات (یہ مونث کی جنس سے آگہی کے بارے میں کنایہ ہے) سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی اسی احتیاط کی جانب مائل ہیں۔ اگرچہ اس بارے میں ہم نے فتویٰ نہیں دیا ہے۔

سوال: بعض لوگوں کی رائے ہے کہ گھر کی صفائی ستھرائی' بچوں کی تربیت اور کھانا پکانا عقدِ ازدواج کی ضمنی شرط ہے' جس کی عورت کو پابندی کرنی چاہئے اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عورت اپنے شوہر کے صرف ایک خاص حق کے بارے میں مکلّف ہے۔ اس بارے میں

آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: یہ معاملہ، جیسا کہ ہمارے استاد آقائے خوئیؒ تاکید فرماتے تھے (عقدِ نکاح کی) ضمنی شرط نہیں ہے۔ کیونکہ عام دستور ہے کہ عورت انتہائی خوشی، رغبت اور بغیر کسی صلے کی تمنا کے یہ کام انجام دیتی ہے۔ کیونکہ عورت یہ محسوس نہیں کرتی کہ اس کا یہ کام کرنا اُس مزدور کے کام کی مانند ہے جو معاہدے کی بنیاد پر اپنے مالک کیلئے کام کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت یہ تمام کام اخلاقی طور پر اپنے شوہر کی خدمت اور ایثار کے جذبے کے تحت انجام دیتی ہے۔ اسی طرح جیسے شوہر بھی اپنی زوجہ کیلئے بہت سی ایسی خدمات انجام دیتا ہے جو اس کے شرعی فرائض میں شامل نہیں ہیں۔

ہاں، اگر خاص قرائن یا عقد سے پہلے رکھی جانے والی شرائط اور اس بارے میں ہونے والے مذاکرات اس بنیاد پر ہوں، اور عقد بھی ان دونوں کے اتفاق کی بنیاد پر ہو، یا لوگوں میں عرفِ خاص بھی اس پر دلالت کرے، یعنی صیغۂ عقد سے اس مفہوم کی پابندی بھی سمجھ میں آتی ہو، تب یہ بات درست ہے۔ مثلاً جب عورت کہے کہ زوّجتک نفسی یا اسکا وکیل یہ کہے کہ زوجتک موکلتی تو یہ کہنا ایسا ہو جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ بشرطیکہ (عورت) ان تمام کاموں کی پابندی کرے گی جو ایک عورت گھر میں انجام دیتی ہے۔

جس آیت میں عورت کو دودھ پلائی کے معاوضے کی ادائیگی واجب قرار دی گئی ہے، وہ کہتی ہے کہ: فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَکُمۡ فَاٰتُوۡھُنَّ اُجُوۡرَھُنَّ ۚ وَ اۡتَمِرُوۡا بَیۡنَکُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ (اور اگر وہ تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو، اور اس مسئلے کو آپس میں احسن طریقے سے طے کرو۔ سورۂ طلاق ۶۵۔ آیت ۶)۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچے کو دودھ پلانا اسلام میں عقدِ ازدواج کی ضمنی شرط نہیں ہے، جس کی پابندی عورت کیلئے ضروری ہو۔ اگر یہ ضمنی شرط ہوتی تو عورت کو دودھ پلانے سے گریز کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

اس کے باوجود ماں کے اپنے بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ تاریخ میں عام طور پر رائج مسائل میں سے ہے، جو تمام ہی معاشروں میں ماں اور بچے کے تعلق کے مابین موجود رہا

ہے۔لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ عورت کی طرف سے انجام دیئے جانے والے یہ اعمال عقدِ نکاح کی ضمنی شرط نہیں ہیں۔ کیونکہ در حقیقت جو بات رائج ہے وہ یہ ہے کہ عورت کسی معاہدے کی پابندی کی خاطر نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی پابندی قبول کرتی ہے۔(۱)

بیوی کو زدوکوب کرنا

سوال: اگر عورت کو اس کا شوہر ناحق زدوکوب کر رہا ہو، تو کیا وہ بھی جواب میں اپنے شوہر کو مار سکتی ہے؟ کن مقامات پر شوہر اپنی بیوی کو زدوکوب کر سکتا ہے؟

جواب: اگر کوئی عورت پر ظلم کرے، تو عورت کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے، خواہ یہ ظلم کرنے والا اس کا شوہر ہو یا کوئی اجنبی شخص۔ کیونکہ اپنے دفاع کا حق شرعی لحاظ سے جائز اور ثابت ہے۔لہٰذا اگر کسی بیوی کا شوہر اسے ناحق زدوکوب کر رہا ہو، تو شرعی لحاظ سے بیوی کو بھی اسے ویسا ہی جواب دینے کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ ہم عائلی زندگی کی بقا اور حفاظت کی خاطر عورتوں کو اس عمل کی سفارش نہیں کرتے، ماسوا اس کے کہ حالات اس ردِ عمل کا تقاضا کریں۔ مثلاً جب وہ اپنی جان خطرے میں محسوس کرے، تو اس پر اپنی جان کی حفاظت لازم ہے۔

اب رہی شوہر کے اپنی بیوی کو زدوکوب کرنے کی بات، تو سوائے ایک موقع اور مقام کے مرد کو اپنی بیوی کو زدوکوب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور وہ موقع وہ ہے جب بیوی اپنے شوہر کو اس کے جنسی حق سے محروم رکھے۔ اس صورت میں بھی اگر شوہر کا بیوی کو نصیحت کرنا، اس سے دوری اختیار کرنا اور اسی طرح کے دوسرے ذرائع، موثر ثابت نہ ہوں، تب شوہر اپنی بیوی کو زدوکوب کر سکتا ہے۔ جیسا کہ خداوندِ عالم نے قرآنِ کریم میں فرمایا ہے:

۱۔یعنی ہمارے معاشروں میں پائی جانے والی حقیقت یہ ہے کہ ماں جب اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اُس کا یہ عمل اس مزدور کے کام کی مانند نہیں ہوتا جو اس کی اجرت چاہتا ہے۔ بلکہ وہ یہ کام بلا معاوضہ انجام دیتی ہے۔

وَ الّٰتِی تَخَافُوْنَ نُشُوزَھُنَّ فَعِظُوھُنَّ وَ اھْجُرُوھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوھُنَّ (اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمہیں خطرہ ہے انہیں موعظ کرو' انہیں خواب گاہ میں الگ کردو' اور (پھر بھی اثر نہ ہو تو انہیں) زدوکوب کرو۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۳۴)

البتہ زدوکوب بھی صرف اتنا کیا جائے جو دیت کا موجب نہ ہو۔ یعنی نہ تو بدن پر نیل پڑے' نہ خون نکلے اور نہ ہی کوئی ہڈی ٹوٹے۔ یہ زدوکوب کرنا بھی بے رحمی کے ساتھ نہ ہو' بلکہ ہلکی اور تادیبی مار ہو جو عورت کی نافرمانی کا علاج ہے۔ جسمانی سزا کا یہ طریقہ نفسیاتی' ذہنی اور فکری علاج سے مایوس ہونے کے بعد اختیار کرنا چاہیئے۔

اس طرح کے حکم کی بنیاد شاید یہ ہو کہ اس سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے مرد کا بنیادی ترین ازدواجی حق (جنسی لذت کا حصول) ضائع ہوتا ہے۔ یہی جنسی لذت ہے جو میاں' بیوی کو گمراہی سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس قسم کے معاملات میں حاکم شرع سے رجوع نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی عدالت میں اسکی شکایت کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ قاضی عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ جنسی روابط پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ یہ عمل دوستانہ اور محبت اور الفت سے معمور فضا میں انجام پاتا ہے۔ پس کیونکہ شوہر کی حق تلفی ہوتی ہے' لہٰذا وہ اس طرح اپنی بیوی کو آمادہ کرسکتا ہے۔

سوال: کیا آپ یہ بات محسوس نہیں کرتے کہ ازدواجی تعلقات کی ماہیت زبردستی اور زدوکوب کرنے سے مطابقت نہیں رکھتی؟

جواب: یہاں ایک اہم مسئلہ پایا جاتا ہے' اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت بیماری' کسی سخت مشکل' ناتوانی اور اسی قسم کے دوسرے اسباب کی وجہ سے مباشرت سے گریز کررہی ہو' تو صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی حرام کی مرتکب نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اگر وہ معمول کی حالت میں ہو' اور اس کے شوہر کو شدید خواہش ہو اور عورت اسے تناؤ اور پریشانی میں مبتلا رکھنا چاہتی ہو' تو اس نے اپنے عہد و پیمان سے خیانت کی ہے اور قدرتی طور پر یہ امر مرد کی گمراہی اور ازدواجی فضا کی

خرابی پر منتہی ہوگا۔(ایسے حالات میں) عورت کو زدوکوب کرنے کی اجازت دو برائیوں (علیحدگی یا سزا) میں سے چھوٹی برائی ہے۔لہٰذا وہ عورت جسے اپنی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے اور اپنے شوہر کی خواہشات، تمایلات اور کیفیات کو جانتی ہے، وہ اپنے شوہر کو اس مقام تک نہیں پہنچنے دیتی جہاں وہ اُسے زدوکوب کرے اور اُس کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ کیونکہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو اچھے انداز سے چلانا جانتی ہے۔ایسی عورت اگر کبھی اپنے شوہر کو کسی چیز سے روکنا چاہتی ہے تو ایسی محبت اور حسنِ رفتار کے ساتھ اسے روکتی ہے کہ اس کی زندگی اور شخصیت کو نقصان نہ پہنچے۔

یہ مسئلہ عام اور طبیعی حالات سے تعلق نہیں رکھتا کہ اس کے ازدواجی تعلقات کے ساتھ ناسازگار ہونے کی بابت گفتگو کی جائے، ایسے تعلقات جن کیلئے جسمانی، جذباتی اور روحانی ہم آہنگی اور پیار و محبت پر مبنی مخلصانہ اور دوستانہ فضا ضروری ہے۔

عورت کو زدوکوب کرنا، ایک طبیعی اور عام حالت نہیں ہوتی بلکہ ایک غیر معمولی صورتحال ہے، اور وہ بھی ایک ایسی پیچیدہ مشکل کے علاج کیلئے جس کا نتیجہ ممکن ہے ازدواجی زندگی کے خاتمے کی صورت میں برآمد ہو۔

اس مشکل کے حل کے چند راستے ہیں:

ایک راستہ یہ ہے کہ عورت کو طلاق دے دی جائے۔ یہ عمل خود اِس کیلئے، اِس کے بچوں کیلئے اور اِس کے شوہر کیلئے بھی مشکلات پیدا کرنے کا باعث ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ مرد اپنی اس خواہش کی تسکین کیلئے گھر سے باہر کوئی صورت تلاش کرے۔ یہ راستہ ازدواجی بندھن اور عائلی زندگی کی سلامتی پر منفی اثرات مرتب کرے گا۔

تیسرا راستہ یہ ہے کہ شوہر اس صورتحال کو برداشت کرے اور نفسیاتی دباؤ کی حالت میں زندگی بسر کرے۔ظاہر ہے یہ راستہ بھی منفی نتائج پر ختم ہوگا۔

لہٰذا فکری اور نفسیاتی تفاہم پر مبنی وعظ و نصیحت کے طریقے سے ناامید ہو جانے کے بعد ہی مار پیٹ اور زدوکوب کرنے کی نوبت آتی ہے۔صلح و آشتی پر مبنی ان راستوں کے بعد

زدوکوب کرنا ہی وہ واحد راستہ رہ جاتا ہے جو خاندان کو تباہی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

بیوی کی خواہش کو پورا کرنا

سوال: کیا مرد پر اپنی بیوی کے جنسی تقاضوں کا مثبت جواب دینا واجب ہے، جبکہ وہ اس عمل پر راغب نہ ہو؟

جواب: عام اور مشہور فتویٰ یہ ہے کہ مرد پر واجب ہے کہ وہ ہر چار مہینے میں ایک بار اپنی بیوی کی جنسی خواہش پوری کرے۔ کچھ فقہا نے احتیاطِ واجب کے طور پر (۱) فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت کے ارتکابِ حرام کا خوف ہو، تو احتیاطِ واجب یہ ہے کہ مرد اس کی خواہش کو پورا کرے۔ بعض فقہا نے اس صورت میں بھی اسکے واجب نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

لیکن ہماری فقہی رائے یہ ہے کہ عام حالت میں اگر مرد اس عمل کو انجام دے سکتا ہو تو رغبت نہ ہونے کے باوجود بھی اس پر واجب ہے کہ اپنی بیوی کی جنسی خواہش پوری کرے۔ ہماری یہ رائے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ: وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اور عورتوں کیلئے ویسے ہی حقوق بھی ہیں جیسی (ان پر) ذمے داریاں ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۲۸)۔ جنسی لذت کے حصول کا حق مرد کو بھی حاصل ہے اور عورت کو بھی۔ البتہ اپنے اس فتوے میں ہمیں اپنا کوئی متفق نظر نہیں آیا۔

بچوں کی خرید و فروخت

سوال: دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے گھرانے بھی پائے جاتے ہیں جو فقر و غربت کی وجہ

۱۔ احتیاطِ واجب اس مقام پر ہوتا ہے جہاں مجتہد کے پاس کسی مسئلے کی حرمت کیلئے مکمل دلیلیں موجود نہ ہوں لیکن اس مسئلے پر عمل یا ترکِ عمل کی شہرت ہو اور مجتہد کے پاس شہرت کے خلاف کوئی دلیل نہ ہو۔ مثلاً کہتے ہیں کہ احتیاطِ واجب یہ ہے کہ (اگر کہیں انعقاد ہوتا ہو تو) نمازِ جمعہ میں شرکت کی جائے۔ یا احتیاطِ واجب یہ ہے کہ انسان داڑھی نہ مونڈے۔ احتیاطِ واجب کا فتویٰ دینے والے مجتہد کا مقلد اس مسئلے میں دوسرے مجتہد کی جانب رجوع اور اسکی رائے پر عمل کر سکتا ہے۔

سے اپنے بچوں کو بیچ دیتے ہیں۔ کیا یہ خرید و فروخت جائز ہے؟ بالخصوص اگر کوئی ان بچوں کو اپنی خدمت کیلئے خریدے؟ اگر جائز ہے' تو کیا یہ لڑکا اور لڑکی' غلام یا کنیز سمجھے جائیں گے؟

جواب: یہ لین دین حرام اور باطل ہے۔ کیونکہ ماں یا باپ کو اپنے بچے دوسروں کو بیچنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ بالخصوص جب انہیں خریدنے والے کفار ہوں اور وہ بچوں کو کافر بنا دیں۔ اگر خریدار مسلمان ہوں' تب بھی ماں یا باپ کو یہ حق حاصل نہیں۔ اسی طرح آزاد بچے کو بیچا نہیں جا سکتا' جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اور وہ اسلام میں غلامی کے قانونی ہونے کی بات کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس تصور کے برخلاف ہمارے یہاں غلام فروشی کا کوئی بازار نہیں پایا جاتا۔ غلامی کے اسباب و محرکات ہوتے ہیں۔ انسان کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو یا اپنی اولاد کو بیچ ڈالے۔ کیونکہ آزاد انسان آزاد ہی رہتا ہے۔ لہٰذا ایسے بچے اسی طرح آزاد رہیں گے غلام نہیں بنیں گے۔ نیز وہ اپنے خریدار کی اولاد بھی نہیں بنیں گے۔ اسلام ایسے بچوں کو اولاد شمار نہیں کرتا: وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ (اور نہ تمہاری منہ بولی اولاد کو اولاد قرار دیا ہے۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴)۔ لہٰذا اپنی اولاد کو بیچنا جائز نہیں ہے اور اِس قسم کا لین دین بھی باطل ہے۔ اِس لین دین میں جو مال یا معاوضہ وصول کیا جائے گا وہ بھی حرام ہوگا۔

البتہ اِس سلسلے میں بعض خصوصی شرائط (Conditions) بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر والدین اپنے بچے کی تعلیم و تربیت اور اس کی دیکھ بھال کیلئے مالی استطاعت نہ رکھتے ہوں اور وہ یہ بات جانتے ہوں کہ کچھ لوگوں کو پرورش کیلئے ایک بچے کی ضرورت ہے' اور وہ اسکی حفاظت' نگہداشت اور نشو و نما کر سکتے ہیں' اسکے ساتھ ساتھ وہ بچے کا نسب بھی محفوظ رکھیں گے اور مستقبل میں اس کے دین و ایمان کو بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا' تو ایسی صورت میں والدین کیلئے اپنا بچہ ایسے لوگوں کے سپرد کرنا جائز ہے۔ اور کیونکہ انہوں نے اپنے بچے کو تربیت کیلئے ان کے حوالے کیا ہے' اس لئے اس کے عوض ان کا کچھ رقم وصول کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے درمیان بچے کی خرید و فروخت انجام پائی

ہے۔نیز مذکورہ رقم بھی بچے کی قیمت نہیں ہے۔

البتہ اگر اس لین دین کا مقصد اپنی اولاد کو کفر، گمراہی اور بربادی کے ماحول سے نکالنا اور نجات دلانا ہو اور اس عمل سے نقصانات جنم نہ لیں اور کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہ ہو تو یہ عمل جائز ہے، لیکن خرید وفروخت کرنا باطل ہے۔

اس کے باوجود اگر مذکورہ عالی نیت اور بلند مقصد کا حصول (اگر چہ ظاہری طور پر ہی سہی) خرید وفروخت ظاہر کرنے سے وابستہ ہو، تو بچوں کو ان حالات اور ماحول سے نجات دلانے کیلئے اسے خرید وفروخت کی شکل دینا جائز ہے۔البتہ بچے کا نسب اسی طرح محفوظ رہنا چاہئے اور اس کا نسب کسی اور کو منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔اسی طرح بچے کی آزادی بھی محفوظ رہنی چاہئے، وہ نہ غلام بنایا جائے اور نہ ہی اس سے خدمت لی جائے۔

بیوی کو طلاق کا حق

سوال: کیا عورت، عقدِ نکاح کے موقع پر یہ شرط عائد کرسکتی ہے کہ اسے حقِ طلاق حاصل ہو گا؟ اس صورت میں اگر مرد اس شرط کو ملحوظ نہ رکھے، یا اسے باطل سمجھے، تو کیا عقدِ نکاح بھی باطل ہو گا؟

جواب: اس شرط کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ یہ شرط عائد کی جائے کہ طلاق کا حق عورت کے پاس ہو گا۔لیکن یہ شرط عائد کرنا باطل ہے۔ کیونکہ اللہ رب العزت نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے اور یہ شرط عائد کرنا کہ طلاق کا حق عورت کے ہاتھ میں ہوگا، قرآنی حکم کی مخالفت ہے۔ ہر وہ شرط جو حکمِ قرآن کے خلاف ہو، باطل ہے، اسکی کوئی حیثیت نہیں۔

اس شرط کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہ شرط رکھی جائے کہ عورت اپنے شوہر کی طرف سے طلاق کے اجراء کی وکیل ہے۔یعنی کسی بھی دوسرے وکیل کی طرح اپنے شوہر کی طرف سے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے۔ یہ وکالت درست ہے۔ اگر اس وکالت کی بنیاد یہ

شرط ہو تو یہ لازم الاجراء ہے اور مرد عورت کو اپنی وکالت سے معزول نہیں کر سکتا۔ اگر اس شرط میں پہلے سے طے شدہ شرائط وقوع پذیر ہو جائیں تو عورت اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے۔

لیکن اگر طلاقِ رجعی ہو تو مرد رجوع کر سکتا ہے۔ اور رجوع کر لینے کے بعد عورت کو دوبارہ اس شرط سے استفادے کا حق نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ حق ایک مرتبہ استفادے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر شرط اس انداز سے رکھی گئی ہو کہ طلاق، طلاقِ خلع (۱) ہوگی۔ یعنی طلاق کے عوض وہ اسے کوئی چیز بخشے گی، تو مرد رجوع نہیں کر سکے گا۔

سوال: تنہائی کے اوقات یا اوقاتِ حرمت جن کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے کون سے ہیں؟ اور ان اوقات میں بچوں پر کن امور کا لحاظ رکھنا لازم ہے؟

جواب: قرآنِ کریم میں ان اوقات کا ذکر آیا ہے جن میں عرب مشرقی معاشروں میں مرد اپنی عورتوں کے ساتھ تنہائی اختیار کرتے ہیں۔ عرب علاقوں، بالخصوص جہاں سخت گرمی پڑتی ہے، وہاں کے لوگوں کا معمول یہ ہے کہ وہ بعد از ظہر بھی کچھ دیر کیلئے استراحت کرتے ہیں۔

مذکورہ حکم کی بنیاد یہ ہے کہ جن اوقات میں والدین تنہائی اختیار کرتے ہیں، ان اوقات میں بچے بغیر اجازت لئے ان کے کمروں میں داخل نہ ہوں۔ البتہ یہ بات صرف انہی اوقات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور اسی طرح ان پر کوئی معین احکام بھی مرتب نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا تعلق سماج کے عرفی احکامات سے ہے۔

۱- طلاقِ خلع اس صورت میں ہوتی ہے جب بیوی شوہر کے ساتھ رہنے پر مائل نہ ہو اور اس سے متنفر ہو اور اگر اس کا شوہر اسے طلاق نہ دے تو اسکے خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہونے کا امکان ہو۔ اس موقع پر عورت اپنے شوہر کو طلاق پر راضی کرنے کیلئے اپنا مہر یا اس سے کچھ زیادہ بخش دیتی ہے۔

بوڑھی عورتوں کے مسائل

سوال: قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ: وَ الْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ (اور ضعیفی کی وجہ سے بیٹھ رہنے والی عورتیں جنہیں نکاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' ان کیلئے کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو الگ کر دیں' بشرطیکہ زینت کی نمائش نہ کریں۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۶۰) کیا اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ بوڑھی عورتوں پر پردہ واجب نہیں ہے؟

جواب: ظاہراً پردے کے کپڑوں کو ایک طرف رکھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر جوان عورتوں کیلئے اپنے پردے پر توجہ واجب ہے اس قدر توجہ ان بوڑھی عورتوں کیلئے ضروری نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایسی عورتوں کیلئے ان اعضائے جسمانی کو کھلا رکھنا جائز ہے جنہیں کھلا رکھنا ان کا معمول ہو۔ جیسے بال اور پنڈلیاں۔ اور یہ بات اس بارے میں آنے والی آیت اور احادیث سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوال: کیا عمر رسیدہ خواتین سے مصافحہ جائز ہے؟

جواب: نامحرم عورتوں سے ہاتھ ملانا کسی صورت جائز نہیں ہے' چاہے یہ عورتیں جوان ہوں یا بوڑھی۔ اِس بارے میں دلائل موجود ہیں۔ جب معصومؑ سے سوال کیا گیا کہ: کیا مرد' نامحرم عورت سے ہاتھ ملاسکتا ہے؟ تو امامؑ نے جواب دیا: نہیں ملاسکتا۔ بجز یہ کہ کپڑے کے اوپر سے اور ہاتھ کو بغیر دبائے ہوئے ملائے۔

عقدِ متعہ

سوال: اگر عقد کے فریقین اسکے حکم کے بارے میں اختلاف رکھتے ہوں' تو ان کا کیا فریضہ

ہوگا؟ مثلاً اگر ایک ایسا مرد جو متعہ کے حلال ہونے کا قائل ہے' ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہے جو اس قسم کے نکاح کو حلال نہیں سمجھتی لیکن جس عمل کو وہ خود حرام سمجھتی ہے اُس کے ارتکاب کی بھی پروا نہیں کرتی اور مرد عورت کی اس رائے سے واقف ہو' تو کیا مرد کیلئے ایسا عقد صحیح ہوگا؟

جواب: اگر فریقِ مقابل' ایجاب وقبول کی صورت میں عقد کے ارادے میں سنجیدہ ہو' تو ایسا عقد صحیح ہے۔ اگرچہ وہ جس چیز کو حرام سمجھتا ہے اس کے بارے میں بے پروائی برتے۔ کیونکہ عقد کی بنیاد یہ ہے کہ دونوں فریق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یعنی عورت اپنے آپ کو اس مرد کی زوجیت میں دینے کا ارادہ کرے اور مرد اس عورت کو اپنی زوجیت میں لینے کا ارادہ کرے (چاہے موقتی چاہے دائمی)۔ جب دونوں کا یہ ارادہ سنجیدگی کے ساتھ جامۂ عمل پہن لے' تو ایسا عقد صحیح ہے۔ ہر چندان دونوں میں سے کوئی ایک اسے ناجائز سمجھتا ہو۔

بالفاظ دیگر ناجائز ہونے کا عقیدہ رکھنا اگر عقد وانشاء میں غیر سنجیدہ ہونے کا باعث ہو' تو ایسے عقد کو باطل کر دیتا ہے۔ لیکن جس وقت ایک فرد جس حکم پر عقیدہ رکھتا ہے اُس کی مخالفت کرتے ہوئے عقدِ نکاح پڑھنے کا ارادہ کرلے اور جن چیزوں کو وہ شرعاً جائز سمجھتا ہے اُن ہی کی مانند اس (عقد) کے لوازمات کی بھی پابندی کرے' تو جو شخص اسکے حلال ہونے کا معتقد ہے اس کا عقد صحیح ہے۔

لیکن اگر بالفرض مقابل فریق جو اس عقد کے جواز کا عقیدہ نہیں رکھتا اور عقد کی انجام دہی میں زوجیت کا ارادہ نہ رکھے اور (عقد کے) الفاظ کو محض فریقِ ثانی کو خوش کرنے کی غرض سے ادا کرے تاکہ شرع کے نام پر غیر شرعی تعلقات استوار کرلے' تو ایسی صورت میں عقد غیر شرعی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں عقد واقع ہی نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ عقد دو فریقوں سے وجود میں آتا ہے اور ان میں سے ہر فریق کا عقد میں سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مفروضہ صورت زنا ہوگی۔

بالفاظ دیگر' اس تعلق کا شادی ہونا' یا اس کا زنا ہونا' رشتہ ازدواج میں سنجیدہ ہونے یا غیر سنجیدہ ہونے سے وابستہ ہے۔ اگر عقدِ نکاح کے دونوں فریق یا اس کا کوئی ایک فریق اس عقد میں سنجیدہ اور مخلص نہ ہو' اور اس نے صرف زبان سے عقد کے الفاظ دہرائے ہوں' اس کے معنی کا ارادہ نہ کیا ہو' تو عقد واقع نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اسکی کوئی شرعی حیثیت بھی نہیں ہے۔

عورت کا متعدد شوہر رکھنا

سوال: لوگ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے تعدد ازدواج کے سلسلے میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات کو مدِ نظر نہیں رکھا ہے۔ کیونکہ اسلام میں مردوں کو ایک سے زیادہ شادیوں کا حق دیا گیا ہے لیکن عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: سب سے پہلے کسی بھی قانون کو وضع کرنے کی افادیت' اس کے اسباب اور محرکات کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیونکہ قانون صرف مزاج اور خواہشات کی پیروی میں وضع نہیں کیا جاتا کہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دے دیں اور جس کو چاہیں حرام کر دیں' اور پھر اسے قانون کا نام دے دیں۔ بلکہ قانون وضع کرتے وقت حقیقی صورتحال کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

جب ہم تعدد ازدواج کے مسئلے کو دیکھتے ہیں تو سوال ذہن میں آتا ہے کہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کیوں دی گئی ہے؟ اس سوال کے جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جنسی پہلو ازدواجی تعلق کا (واحد پہلو نہ بھی کہیں تو) بنیادی پہلو ہے۔ اور اس بارے میں مطالعہ بتاتا ہے کہ کبھی کبھی جنسی لحاظ سے مرد کیلئے ایک عورت کافی نہیں ہوتی۔ تاریخی لحاظ سے بھی یہ امر ثابت شدہ ہے کہ کثیر تعداد میں ایسے مرد گزرے ہیں جو ایک بیوی رکھنے کے باوجود متعدد خواتین سے جنسی تعلقات رکھتے تھے۔ لہٰذا ہر دور میں شادی شدہ زندگی کے ساتھ ساتھ زنا کاری بھی رہی ہے۔ حتیٰ آج بھی جبکہ مغربی دنیا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس کے پیروکار صرف ایک شریکِ حیات رکھنے کی ترویج کرتے ہیں' لیکن اسکے باوجود

ازدواجی زندگی سے باہر قانونی یا غیر قانونی صورت میں ناجائز جنسی تعلقات کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ حتیٰ بعض مغربی قوانین نے' غیر قانونی تعلقات کو قانونی شکل دے کر انہیں قانونی روابط کے ہم پلہ قرار دے لیا ہے' ہر چند بعض مواقع پر وہ اسے ترجیح نہیں دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنسی تعلقات میں تعدد اور تنوع ایک ایسا امر ہے جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ مرد میں بہت جلد ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر مواقع پر عورت کے مقابلے میں مرد کی جنسی خواہش شدید ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک عورت اس کی ضرورت پوری نہیں کرتی۔ لہٰذا اس خلا کو (جو اگرچہ اکثریت میں نہیں پایا جاتا) سنجیدگی کے ساتھ پر ہونا چاہیئے۔ بالخصوص ان حالات میں جبکہ متعدد جنسی تعلقات مرد کیلئے ضروری ہوں۔ لہٰذا اس جنسی مسئلے کے حل کیلئے ازدواجی تعلق میں تعدد اور تنوع ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

اس بارے مین تیسری بات یہ ہے کہ جنگیں عورتوں کی بہ نسبت مردوں کیلئے زیادہ ہلاکت خیز ہوتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مرد جنگوں کا ایندھن بنتے ہیں' ہر چند بعض جدید حکومتیں ایسی نئی فوجیں تشکیل دے رہی ہیں جن میں عورتوں کو بھی میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت ہے۔ لیکن پھر بھی عورتوں کی ایک بہت ہی کم تعداد جنگوں میں شرکت کرتی ہے۔ یہ چیز مردوں کی آبادی کے تناسب پر منفی اثر مرتب کرتی ہے۔

پس جب صورتحال یہ ہو تو کیا کیا جائے؟ کیا عورتوں کی اُس تعداد کو جو مردوں سے زیادہ ہے' شادی بیاہ سے محروم رکھا جائے؟ یا یہ کہ انہیں گمراہی کے کنویں میں دھکیل دیا جائے۔ ظاہر ہے یہ راستہ اس مشکل کے حل کی بجائے اس کی پیچیدگیوں میں مزید اضافہ کر دے گا۔ لہٰذا اپنے منفی اثرات کے باوجود دوسری اور تیسری شادی اس پہلو سے مثبت ہے۔

مذکورہ مسائل سے قطع نظر ممکن ہے کوئی مرد اپنی بیوی سے اس قدر محبت کرتا ہو کہ اس کے بانجھ ہونے کے باوجود اسے طلاق دینے پر تیار نہ ہو' لیکن اس کے دل میں اولاد کی

خواہش بھی موجود ہو۔ دوسری شادی اس قسم کے مردوں کیلئے ایک مناسب راہِ حل ہے۔ اس سلسلے میں اور مسائل بھی ہیں جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں۔

بعض اوقات یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت صرف مردوں ہی کو کیوں دی گئی ہے؟ عورتوں کو یہ اجازت کیوں نہیں؟

جب ہم تاریخی رُخ سے اس مسئلے کا مطالعہ کرتے ہیں تو گناہ پیشہ عورتوں کے سوا عام عورتوں کو تعدد (یعنی ایک سے زیادہ شوہروں) کا خواہشمند نہیں پاتے۔ البتہ گناہ پیشہ عورتوں کو بھی جنسی ضرورت سے زیادہ ان کے اقتصادی حالات اور ضروریات تعدد پر آمادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا عورت کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ متعدد سے نہیں بلکہ ایک ہی شخص سے تعلق کو پسند کرتی ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ عورت فطرتاً ایک ہی فرد سے تعلق چاہتی ہے نہ کہ متعدد افراد سے۔ عورت چاہتی ہے کہ ایک خاص پہلو سے وہ ایک مرد کی ہو کے رہے اور مرد صرف اس کا ہو کے رہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اپنا پورا وجود صرف ایک مرد کے سپرد کرے۔

یوں وہ مشکلات جو مرد کیلئے ایک سے زیادہ شادیوں کو جائز قرار دیتی ہیں اور جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ان کا عورت کو سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ عورت کی جنسی سرشت بھی مرد کی طرح نہیں کہ وہ تعدد کی خواہشمند ہو۔ عورت میں (عام طور پر) جنسی جوش اور ہیجان مرد کی بہ نسبت کمزور ہوتا ہے۔ اور خاص حالات کے سوا اکثر ایک عورت کی جنسی خواہش کی تسکین کیلئے ایک مرد کافی ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی کی بیشتر مشکلات بھی عورت کے جوش و ہیجان میں کمی کے نتیجے میں مرد کی تسکین نہ ہو سکنے کی باعث جنم لیتی ہیں۔

عورتوں کی آبادی کی نسبت مردوں کی آبادی کے زیادہ ہونے کا مفروضہ بھی غلط ہے۔ جس کی گواہی خاص حالات و شرائط جیسے جنگ و جدال اور حتیٰ طبیعی حالات سے ملتی ہے۔

ایک اور نکتہ جس کا ذکر یہاں مناسب ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام خاندانی نظام کی مصلحت اس بات میں سمجھتا ہے کہ اُس کا سربراہ باپ ہو۔ یہ امر فطری پہلو کے ساتھ ساتھ سماجی پہلو سے بھی تسلیم شدہ ہے۔ گھرانے کو ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی سرپرستی کرے اور مرد یہ ذمے داری اٹھانے کی زیادہ قدرت رکھتا ہے۔

اس بات کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں کہ مرد جسمانی لحاظ سے طاقت وقوت رکھتا ہے یا اس کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی وہ عورت سے زیادہ قوی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ عورت حاملہ ہو سکنے اور بچے کو دودھ پلانے کی استعداد کی وجہ سے گھرانے کی سرپرستی کی ذمے داری اٹھانے کے سلسلے میں زیادہ آزادیٔ عمل کی حامل نہیں بجز اسکے کہ وہ اپنے بچوں کا نقصان برداشت کرنے پر تیار ہو۔

باپ کی سربراہی کی بنیاد پر قائم گھریلو نظام اور عورت کے متعدد شوہر کرنے کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بچوں کا نسب تباہ ہو جائے گا۔

پوری دنیا نے اس بات کو قبول کیا ہے۔ حتیٰ مغرب میں بھی مردوں اور عورتوں کے حقوق وفرائض میں مساوات کے باوجود گھرانے کا قابلِ قبول اور قابلِ اعتماد نظام وہی ہے جس کا سربراہ باپ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت شادی کے بعد اضطراری اور نادر مواقع کے سوا شوہر کا خاندانی نام اپنے نام کے آگے لگاتی ہے، جبکہ مرد عورت کا خاندانی نام استعمال نہیں کرتا۔ اسی طرح بچہ اپنی ماں کا نہیں بلکہ اپنے باپ اور اس کے خاندان کا نام اپنے نام کے آگے لگاتا ہے۔

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ پوری دنیا کا خاندانی نظام باپ کی سربراہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ باپ کی حاکمیت پر مبنی نظام کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بچہ باپ سے منسوب ہو اور یہ امر عورت کے متعدد شوہر رکھنے کی صورت میں ممکن نہیں۔ حتیٰ اگر بالفرض اس سلسلے میں بہت سی پابندیاں اور حدود وقیود عائد کر دی جائیں (البتہ جو قابلِ اطمینان نہیں ہیں) مثلاً جب عورت ایک شوہر سے حاملہ ہو جائے تو پھر دوسرے شوہروں سے تعلق نہ رکھے، تو اس قسم کی باتیں غیر

فطری ہیں۔

گھر کی سربراہی عورت کے ہاتھ میں ہونے اور مرد کے ہاتھ میں ہونے کے درمیان بہت فرق ہے۔ کیونکہ مرد کی شخصیت میں موجود بہت سے عناصر بچے کی شخصیت سے ضعف و ناتوانی کا احساس دور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اپنی ماں کی زیرِ سرپرستی تربیت اور نشو ونما پاتے ہیں وہ ان لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں جو اپنے باپ کے زیرِ سایہ پل کر بڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسلام' جو دو سال کی عمر کے بعد بچے کی حضانت (سرپرستی) ماں کی بجائے باپ کے سپرد کرتا ہے' اس کا راز یہی ہے۔ ہر چند اس امر کے منفی پہلو بھی ہیں لیکن اس کے مثبت پہلو زیادہ ہیں۔

ہمارے خیال میں مرد کی شخصیت اور اس کی خلقت میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو گھر کے بندوبست اور اسکے نظم ونسق کے سلسلے میں اسے عورت سے ممتاز کرتی ہیں۔ تمام دنیا' حتیٰ ترقی یافتہ دنیا نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ میدان بھی جن میں عورت کے نظم ونسق سنبھالنے اور بندوبست (عورت کی سربراہی) کرنے کی گنجائش موجود ہے' ان کا انتظام اور انصرام چلانے میں بھی مرد برتری اور فوقیت رکھتے ہیں۔

ذرا تصور کیجیے کہ اگر کسی گھر میں ایک عورت ہو اور اسکے متعدد شوہر' تو اس گھر کا حال اور وہاں کا ماحول کیسا ہوگا؟ یہ گھر سکون وقرار سے محروم ہوگا۔ کیونکہ مرد کی شخصیت میں موجود خصوصیات اور عورت کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت اس تعدد کو مردوں کے درمیان جنگ اور نزاع کی صورت میں بدل دے گی۔ جبکہ وہ ماحول اور گھرانے جن میں عورتیں ایک مرد کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں گھر کو میدانِ جنگ میں تبدیل نہیں کرتے۔

ہاں' کبھی کبھی ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں بھی متعدد مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک سے زیادہ شوہروں کی صورت میں گھریلو ماحول میدانِ جنگ کا منظر پیش کرے گا اور وہاں کا سکون واطمینان غارت ہو جائے گا۔

ہم مردوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کی اس کیفیت کا مشاہدہ بعض اوقات اُس

وقت کرتے ہیں جب کوئی ایک عورت کئی مردوں کی چاہت کا مرکز بن جاتی ہے اور ان مردوں کی باہمی رقابت جنگ وجدال کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

تاریخ میں ماں کی سرپرستی یا عورت کی حاکمیت پر مبنی نظام نام کی چیز کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اسکی زیادہ تر جزیات' بالخصوص اس دور میں مردوں اور عورتوں کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ بہرصورت یہ نظام ایک مخصوص خطۂ زمین اور تاریخ کے ایک خاص دور میں پایا گیا ہے لیکن طولِ تاریخ میں عام طور پر باپ کی سرپرستی پر مبنی نظام ہی موجود رہا ہے۔

(۴)

ہجرت (امیگریشن) کے احکام

ہجرت (امیگریشن) کے احکام

سوال: ''تعرب بعداز ہجرت'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: ''تعرب بعداز ہجرت'' وہ حالت ہے جس میں کوئی مسلمان اسلامی شعور اور اسکی پابندی ترک کر کے ایک جاہل اور گمراہ انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

''تعرب'' کا لفظ ''اعرابی'' سے ماخوذ ہے' جو قرآنِ مجید میں لفظ ''اعراب'' کی صورت میں آیا ہے اور اِس سے مراد وہ شخص ہے جو دینی سوجھ بوجھ سے عاری ہو۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: **ولا تعرّب بعد الهجرة** (دیہات چھوڑنے کے بعد وہاں واپس نہ جاؤ۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱۔ ص ۵۰۶۔ روایت ۱۵۳۸۳)

امام علی رضا علیہ السلام نے محمد بن سنان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

وحرّم الله التعرب بعد الهجرة للرجوع عن الدين و ترك الموازرة للانبياء والحجج، وما فى ذلك من الفساد وابطال حق كل ذى حق لعلة سكنىٰ البدو، ولذلك لو عرف الرجل الدين كاملاً لم يجزله مساكنة اهل

الجهل والخوف علیه' لانه لا یومن ان یقع منه ترک العلم والدخول مع اهل الجهل والتمادی فی ذلک. (خداوندِ عالم نے تعرب بعداز ہجرت کو اس لئے حرام قرار دیا ہے کہ یہ عمل دین سے پلٹ جانا' اور انبیا اور خدا کی حجتوں کی ہمراہی سے دستبردار ہو جانا ہے۔ نیز (اس لئے بھی حرام قرار دیا ہے کہ) اس عمل میں فساد پوشیدہ ہے اور دیہات میں سکونت اختیار کرنے کے نتیجے میں ہر صاحبِ حق کا حق پامال ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شخص دین کی مکمل شناسائی رکھتا ہے اسکے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ جاہلوں اور ایسے لوگوں کی ہم نشینی اختیار کرے جن کی صحبت اسکے دین کیلئے خطرہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ (اس صحبت کے نتیجے میں) یہ شخص اپنا علم کھو بیٹھے اور جاہلوں کے ساتھ گھل مل جائے اور گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۵۔ ص ۱۰۰۔ روایت ۲۰۰۶۶)

''تعرب بعداز ہجرت'' کی ایک قسم کفار کے ایسے ملک میں منتقل ہونا ہے جہاں کفر آمیز اخلاق و عادات اور کافرانہ ثقافتی اور سماجی گمراہیاں عام ہوں اور کسی ایسی اسلامی تعلیمی و تربیتی سرگرمی کا وجود نہ ہو جو ایک مسلمان انسان' اسکے اہلِ خانہ اور اسکی اولادوں کی پناہ گاہ ہو اور کوئی ایسا اسلامی ادارہ اور مرکز موجود نہ ہو جو وہاں مقیم مسلمانوں کو اس ماحول کے منفی اثرات سے نجات دلائے' وہ ماحول جو ممکن ہے انہیں فکری اور عملی گمراہی میں مبتلا کر دے اور آخر کار فسق و فجور کے گڑھے میں ان کے گر جانے کا موجب ہو۔ یہی وہ امر ہے جو ایسے ممالک کی جانب ہجرت کے حرام ہونے کا باعث ہے۔

سوال: گزشتہ مسئلے میں بیان کئے جانے والے حکم سے کون سے مواقع مستثنا ہیں؟

جواب: اس حکم سے صرف وہ موقع مستثنا ہے جب انسان اپنے وطن میں ظلم و ستم کا شکار ہو اور ایسی دشوار صورتحال کا سامنا کر رہا ہو جسے برداشت کرنا اسکے لئے ناممکن ہو' یا وہ انتہائی مشکل کے ساتھ اس صورتحال کو برداشت کر رہا ہو۔

اس سے ملتے جلتے حالات کچھ دوسرے لوگوں کیلئے بھی پیش آتے ہیں۔ مثلاً وہ

مسلمان جن کے پاس اسلامی مملکت میں ایک باعزت زندگی گزارنے کی گنجائش نہ ہو یا انہیں وہاں کوئی پناہ گاہ میسر نہ ہو یا یہ کہ اسلام کی مصلحت اور مفاد کا تقاضا ہو کہ کوئی شخص لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کی غرض سے یا سرزمینِ کفر پر آباد مسلمانوں کو اسلام سے آگاہ کرنے اور انہیں گمراہی اور انحراف سے محفوظ رکھنے کی خاطر سرزمینِ کفر کی جانب ہجرت کرے۔

یا یہ کہ اگر کسی مسلمان کو اپنے ایمان اور اپنی دینداری کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ سیاسی یا تجارتی فوائد کے حصول کیلئے سرزمینِ کفر کی جانب ہجرت کرسکتا ہے۔

یا یہ کہ کوئی مردِ مسلمان گمراہی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور اپنے آپ کو منفی عوامل کے اثرات سے بچا سکتا ہو۔

ایسے لوگ جو اس قسم کے ممالک کی جانب کوچ کر چکے ہیں' ان کیلئے لازم ہے کہ اگر ممکن ہو تو اپنے لئے اسلامی مراکز' تربیتی مدارس اور سماجی سرگرمیوں اور کھیل کود کے کلب قائم کریں تاکہ اپنی حفاظت کرسکیں۔ یہ اقدامات اپنی ثقافت سے وابستگی اور عملی زندگی میں اسلامی احکام کی پابندی کے سلسلے میں خاطر خواہ اثرانداز ہوں گے۔ انہیں چاہئے کہ خداوندِ عالم کا یہ فرمان ہمیشہ یاد رکھیں کہ: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر وہ ملائکہ معین ہوں گے جو سخت مزاج اور تند و تیز ہیں اور خدا کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے اسی پر عمل کرتے ہیں۔ سورۂ تحریم ۶۶۔ آیت ۶)

سوال: کیا مادّی ضروریات کا دباؤ اور قانونی اسناد کی ضرورت پناہ گزینی اختیار کرنے' یا ہجرت کا شرعی جواز بن سکتی ہیں؟

جواب: اگر یہ صورتحال انسان کو سخت اور دشوار حالات سے دوچار کر دے' تو اسکے لئے پناہ

گزینی اختیار کرنا اور ہجرت کرنا جائز ہے۔

سوال: ایک ایسی عورت جس نے کسی مغربی ملک میں پناہ لی ہوئی ہے۔ کیا اسکے لئے وہاں کے سرکاری افسران کی درخواست پر اپنی بے پردہ یا ایسی تصویر اتروانا جائز ہے جس میں اس کے سر کا کچھ حصہ کھلا ہوا ہو؟

جواب: یہ عمل اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ عکس بردار (photographer) عورت ہو۔ مذکورہ مفروضے میں سرکاری افسران کو مجبوراً تصویر فراہم کرنے کی صورت میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔

سوال: کیا میزبان ممالک کے بعض ایسے قوانین کی مخالفت جائز ہے جو اسلامی رسوم و رواج اور اقدار کے منافی ہیں؟

جواب: یہ امر اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ مخالفت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ حکیمانہ ہو اور جو مسلمانوں کی عزت و وقار اور ان کے مقام کو نقصان نہ پہنچاتا ہو۔ کیونکہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسلام نے جن رسوم و رواج' اقدار اور شرعی احکام کی پابندی کا حکم دیا ہے ہر حالت میں (سوائے اس صورت میں جبکہ ان پر عمل کرنا شدید سختی اور مشکل کا موجب ہو جائے) ان کی پاسداری کریں۔ علاوہ ازایں اسلام اور مسلمانوں کی عزت و آبرو اور وقار کی حفاظت بھی ہر مسلمان پر واجب ہے۔

سوال: کیا پناہ گزینوں کو حاصل ہونے والی سہولتوں اور روپے پیسے کے بارے میں شرع کا کوئی خاص موقف ہے؟

جواب: اگر انسان ان ممالک کے قوانین وضوابط کے مطابق ان سہولتوں اور پیسوں کا مستحق ہو تو ان کا لینا جائز ہے۔

سوال: مغرب کے بازاروں میں فروخت ہونے والی ان مصنوعات کے بارے میں شرع کا حکم کیا ہے، جو نجس (غیر شرعی طور پر ذبح کئے جانے والے جانوروں کی) کھال سے تیار کی جاتی ہیں؟ کیا ان مصنوعات سے گیلے ہاتھ کا لگنا، ہاتھ کو نجس کر دیتا ہے؟ اور اگر ان مصنوعات کے پاک یا نجس ہونے کے بارے میں شک ہو، تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: اگر ان کی پاکیزگی (یعنی ان کے شرعی طریقے سے ذبح کئے جانے کے بارے میں) شک ہو۔ مثلاً جس ملک سے یہ مال خریدا گیا ہے، وہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد زندگی بسر کرتی ہے اور انہوں نے شرعی طریقے سے ذبح کرنے کی ذمے داری اٹھائی ہوئی ہے۔ یا اس بات کا احتمال ہو کہ کھال اسلامی ممالک سے درآمد (import) کی گئی ہے اور اس بات کا احتمال ظاہر کریں کہ یہ کھال اس جانور کی ہے جسے شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے، تو ایسی صورتوں میں اسے پاک قرار دیا جائے گا اور اس کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہوگا۔

لیکن اگر آپ کو اس بات کا علم ہو کہ جانور کو غیر شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے، تو اس کی کھال سے بنی مصنوعات کو نجس قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں اس سے گیلے ہاتھ کا لگنا، ہاتھ کو نجس کر دے گا۔ اور اس کے ساتھ نماز پڑھنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ نجس مردار کا حصہ ہے اور نجس مردار کے کسی حصے کے ساتھ نماز پڑھنا جائز نہیں۔

سوال: مغرب کے بازاروں میں دستیاب ان غذاؤں کے بارے میں شرع کا حکم کیا ہے جن کے متعلق شک ہو کہ ان میں سور کا گوشت یا اسکی چربی استعمال کی گئی ہے؟

جواب: اگر انسان کو اس بات کا شک ہو، کہ ان غذاؤں میں مردار یا سور کا گوشت یا چربی استعمال کی گئی ہے لیکن کسی ذریعے سے اس کا یقین حاصل نہ ہو، تو اسکے لئے ان غذاؤں کو کھانا حلال ہے اور ان غذاؤں کو پاک قرار دیا جائے گا۔

سوال: اگر مجھے کوئی مناسب کام (job) نہیں مل رہا ہو، تو کیا میرے لئے ایسے سپر اسٹور

میں کام کرنا شرعاً جائز ہوگا' جس کے ایک حصے میں شراب کی مختلف اقسام فروخت ہوتی ہیں؟ اور اگر مجھے اسی حصے میں کام پر مامور کیا جائے' تو میرا فریضہ کیا ہے؟

جواب: ایسے مقامات پر کام (job) کرنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ وہاں کام کرنے والے شخص کا کام حرام لین دین نہ ہو' ہر چند اس جگہ کے ایک حصے میں شراب فروخت کی جاتی ہو۔ لیکن اگر کام ایسے مواد کی فروخت اور فراہمی ہو جس کا استعمال حرام ہے' تو یہ پیشہ بنیادی طور جائز نہیں' ماسوا اس کے کہ یہ نوکری کرنے کے علاوہ اسکے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ ہو اور یہ ملازمت ترک کرنے کی صورت میں اسے حرج (زحمت' سختی اور تنگی و تکلیف) کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نیز کوئی دوسری ایسی ملازمت موجود نہ ہو جس کے ذریعے وہ اپنی گزر بسر کر سکے اور اسکی بے کاری خود اسکی اور اسکے بچوں کی فاقہ کشی کا باعث ہو جائے اور اسکے نتیجے میں وہ خفت و ذلت اور رسوائی پر مجبور ہو جائے۔ ایسی صورت میں ایسا کام (job) کرنا جائز ہے۔ کیونکہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (دین میں تمہارے لئے کسی قسم کی زحمت اور تنگی نہیں رکھی گئی ہے۔ سورہ حج ۲۲۔ آیت ۷۸)

سوال: کیا کسی ایسی مغربی خاتون سے متعہ کرنا صحیح ہے جو بغیر معنی سمجھے صیغۂ عقد کے الفاظ زبان سے ادا کر دیتی ہے؟ نیز کیا عقد کا متعین صیغہ پڑھے بغیر فریقین کا محض راضی ہونا کافی ہے؟

جواب: عقدِ ازدواج (خواہ دائمی ہو یا عارضی) مسلمان کے ساتھ ہو یا اہلِ کتاب کے ساتھ' اس وقت تک جائز نہیں' جب تک فریقین (مرد اور عورت) عقد کے ذریعے ازدواجی تعلق قائم کرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ اس عقد کیلئے کسی خاص لفظ کو شرط قرار نہیں دیا گیا ہے۔ ہر ایسا لفظ یا جملہ جو عام طور پر ازدواجی تعلق کے قیام پر دلالت کرتا ہو' کافی ہے۔ اور عقد کا صیغہ پڑھے بغیر' فریقین (یعنی مرد اور عورت کا) صرف راضی ہونا کافی نہیں ہے۔

سوال: کیا حرج (تنگی، زحمت اور دشواری) کی حالت میں یا معمول کی حالت میں مغربی عورت کے ساتھ مصافحہ کرنا جائز ہے؟
جواب: انتہائی دشوار صورتحال کے سوا، اجنبی عورت کے ساتھ مصافحہ کرنا مطلقاً جائز نہیں، خواہ وہ عورت مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ البتہ مردِ مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ دشوار اور مشکل صورتحال کی تشخیص کرتے وقت انتہائی باریک بینی سے کام لے تا کہ ایسی صورتحال میں دی جانے والی اجازت اسے دینی احکام کی پابندی میں سہل انگاری سے کام لینے والا نہ بنا دے۔ خداوندِ عالم کا فرمان ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے حالات سے خوب باخبر ہے، چاہے وہ کتنے ہی عذر کیوں نہ تراشے۔ سورۂ قیامت ۷۵۔ آیت ۱۴، ۱۵)

سوال: مغرب میں قائم بعض بازاروں میں چوری کا مال فروخت ہوتا ہے۔ کیا ایک مسلمان پناہ گزین کیلئے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ اموال چوری کے ہیں، انہیں خریدنا جائز ہے؟
جواب: یہ عمل جائز نہیں، کیونکہ مسلمان یا کافر سے چوری کے مال کی خرید و فروخت جائز نہیں۔ لیکن اگر ان اموال کے مالکوں کا علم نہ ہو تو ان پر مجہول المالک (۱) اموال کا حکم لاگو ہوتا ہے۔ ان اموال کے مجہول المالک ہونے کے فرض کے باوجود، مسلمان چور سے ان کا خریدنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عمل چوری پر ان کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتا ہے۔

سوال: ان مغربی ممالک میں جہاں ہم نے پناہ لی ہوئی ہے، وہاں کی عمومی (public) اور شخصی (private) املاک میں تجاوز، جیسے ٹیلی فون کالز کی چوری اور سپر مارکیٹس میں ہاتھ کی

۱۔ مجہول المالک، وہ مال ہے جس کا مالک متعین طور پر معلوم نہ ہو۔ مثلاً ایسا مال جو سرِ راہ پڑا ہوا ملے اور اسکے مالک کا تلاش کرنا ممکن نہ ہو، تو اسکے مالک کی طرف سے اسے صدقے کے طور پر دے دینا چاہئے۔

صفائی دکھانے کے بارے میں شرع کا حکم کیا ہے؟
جواب: یہ عمل بنیادی طور پر جائز نہیں ہے۔ علاوہ ازایں' یہ عمل نظم ونسق اور عمومی املاک (public properties) کے نظام کی مخالفت کے لحاظ سے بھی جائز نہیں۔

سوال: کیا عیسائیوں کی عبادات اوران کے مذہبی شعائر کے متعلق جاننے کیلئے ان عبادات و شعائر کی ادائیگی کے دوران' یا ان کے بعد کلیسا میں آمدورفت حرام ہے؟
جواب: مذکورہ مقصد کیلئے وہاں آمدورفت جائز ہے۔ ماسوا اسکے کہ یہ عمل عنوانِ ثانوی کی بنیاد پر حرام ہوجائے۔

۵

مطبوعات کے احکام

مطبوعات کے احکام

سوال: کیا دشمن کی توہین اور اُسے بدنام کرنے کی غرض سے بے بنیاد خبریں گھڑنا جائز ہے؟
جواب: یہ عمل جائز نہیں، کیونکہ جھوٹ مطلقاً حرام ہے، ماسوا جبکہ اسلام کے مفاد میں لازم ہو جائے اور جب یہ عمل دشمن پر اسلام کی فتح وکامیابی کا باعث ہو، یا دشمن کو کمزور کرنے کا سبب ہو، یا اسے مضمحل اور نفسیاتی شکست سے دوچار کردے، یا اسکی خوداعتمادی کو ختم کردے، یا اسی طرح کی دوسری باتوں کیلئے جن کا میدانِ جنگ کی صورتحال تقاضا کرتی ہے۔

سوال: پہلے سوال ہی کے تسلسل میں عرض ہے کہ کیا اس صورت میں خبر گھڑنا جائز ہوگا، جب اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؟
جواب: جھوٹی خبر گھڑنے کے جواز کیلئے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ اس سے اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ بلکہ اسکا شرعی جواز اس بنیادی مصلحت کے موجود ہونے پر منحصر ہے جس کی اہمیت جھوٹ کی صورت میں مرتب ہونے والے ضرر سے زیادہ ہو۔ یعنی اس جھوٹ کے ذریعے مرتب ہونے والی مصلحت اسکے نقصان سے زیادہ اہم ہو، اور اس قدر اہم ہو کہ تزاحم

کی صورت میں اسکے مقدم ہونے کا حکم لگایا جائے۔(۱)

سوال: کیا خبر میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرنا جائز ہے جو اسکی تاثیر اور اس پر اطمیان میں اضافہ کردے؟

جواب: یہ عمل اس صورت میں جائز ہے جبکہ یہ اضافے خود خبر میں اضافہ نہ ہوں، بلکہ اندازِ بیان ایسا ہو اور ایسے اشارات شامل کئے جائیں، جو خلافِ واقع نہ ہوں۔ بصورتِ دیگر جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح جزیات میں دروغ بافی کی گئی ہے جسے ان شرعی ضوابط کے تابع ہونا چاہئے جو دروغ کو جواز فراہم کرتے ہیں۔

سوال: کیا مایوسی پھیلانے والی خبروں کا نشر کرنا جائز ہے؟

جواب: بنیادی طور پر اگر یہ عمل امتِ اسلامیہ میں نفسیاتی شکست کا احساس پیدا کردے، مقابلے کے میدان میں اسکے موقف کو کمزور کرے اور چیلنجز کے سامنے اسکی شکست وزوال کا باعث ہو تو جائز نہیں۔

سوال: کیا اسلامی مطبوعات میں بے پردہ مسلمان لڑکیوں کی تصاویر چھاپنا جائز ہے؟ اس بارے میں غیر مسلم خواتین کی تصاویر کے متعلق شرعی حدود کیا ہیں؟

۱۔ تزاحم، وہ حالت ہے جس میں معاملہ اہم تر مصلحت اور کم اہمیت تر ضرر کے درمیان ہو یا دو مصلحتوں کے درمیان ہو جن میں سے ایک مصلحت دوسری مصلحت سے اہم تر ہو، اور ان دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو۔ مثلاً انسان کا کسی مظلوم کو نجات دلانے کی خاطر مجبوراً جھوٹ بولنا۔ اس مثال میں جھوٹ (جو کہ حرام ہے) اس بے گناہ کو چھٹکارہ دلانے سے (جو کہ ایک واجب عمل ہے) تزاحم رکھتا ہے۔ اس موقع پر مظلوم کو نجات دلانا مقدم ہے کیونکہ اس کی اہمیت جھوٹ کے ضرر کا ازالہ کردیتی ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ جب مکلّف انسان کے پاس مسجد کو پاک کرنے اور نماز کا کافی وقت نہ ہو تو وہ ان دونوں میں سے کسی ایک عمل کا مکلّف ہے۔

جواب: یہ عمل اگر مسلمان خواتین میں بے پردگی کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کا باعث نہ ہو تو حرام نہیں۔ بات رہی غیر مسلم عورتوں کی بے حجاب تصاویر کی شرعی حدود کی، تو مسلمان خواتین ہی کی مانند غیر مسلم خواتین کی تصاویر بھی اس طرح نہیں چھاپنی چاہئیں کہ وہ جنسی ہیجان اور تحریک کا باعث بنیں۔

سوال: اگر خبر سے تعلق رکھنے والا شخص خبر کو افشا نہ کرنا چاہتا ہو، تو کیا اسکی رضامندی حاصل کیے بغیر اس خبر کو شائع کرنا جائز ہے؟
جواب: اگر خبر ایسے راز پر مبنی ہو جس سے متعلق شخص نے اسے چھپا کر رکھا ہو، تو ایسے شخص کی اجازت کے بغیر اسکا راز افشا کرنا جائز نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو رضامندی حاصل کرنا ضروری نہیں۔ البتہ اس صورت میں جبکہ اِس عمل سے اُسے کوئی مادّی یا معنوی نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔

سوال: کیا دشمن کو پہنچنے والے نقصان اور اسکی حالت بیان کرنے والے اعداد و شمار میں مبالغہ کرنا جائز ہے؟
جواب: اگر مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کی غرض سے حالات کا لازمی تقاضا ہو، تو ایسا عمل جائز ہے۔ لیکن مسئلے کے دوسرے پہلو پر بھی توجہ مبذول رہنی چاہئے، اور وہ یہ کہ یہ عمل کامیابی کو اس قدر بڑا اور دشمن کو اس قدر ضعیف و کمزور ظاہر نہ کرے کہ مجاہدین میں سستی، سہل پسندی اور دشمن سے مقابلے کیلئے ان میں عدم آمادگی کو فروغ دے۔

سوال: کیا اسلامی تحریکوں اور مجاہدین اسلام کی سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو اسکی کیا حد ہے؟
جواب: یہ عمل (بنیادی طور پر) اس حد تک انجام دینا کہ اس پر جھوٹ کا عنوان صادق آئے

جائز نہیں ہے۔ ہاں، (اس صورت میں جائز ہوگا) جب ایسے عناوین ثانوی پیدا ہو جائیں جن کا اسلام کی مصلحت تقاضا کرے۔ اس صورت میں بھی ان عناصر کی سرگرمیوں کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا جانا چاہیئے کہ وہ نفسیاتی اور عملی لحاظ سے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو جائیں۔

علاوہ ازاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ایسے کام کبھی کبھی عام لوگوں کے اذہان میں منفی تاثر بھی چھوڑتے ہیں۔ کیونکہ جب لوگ حقائق اور ان کے بارے میں کیئے جانے والے پروپیگنڈے کا موازانہ کریں گے اور انہیں ان کے درمیان فاصلہ نظر آئے گا' تو ان عناصر کے پروپیگنڈے سے ان کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

سوال: اخباری الزام تراشیاں اور وہ بے فائدہ صحافتی جنگیں جو اخباری صفحات کو میدانِ جنگ بنا دیتی ہیں' ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اسلام کی نظر میں الزام تراشی ایک مذموم اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ اور ممکن ہے اس عمل کی مرتکب ہونے والی مطبوعات کو فائدے سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑے۔ کیونکہ وہ لوگ جو الزام تراشی اور گالم گلوچ کرنے والوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے' ان کی نظر میں ان مطبوعات کی وقعت کم ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان بے فائدہ صحافتی جنگوں کا ہے جو معاشرے کو بنیادی اور مفید جنگوں اور مطبوعات کو مفید مسائل پیش کرنے سے باز رکھتی ہیں۔

سوال: بعض اوقات نامہ نگاروں کے کام کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ خبروں کے حصول کیلیئے جاسوسوں کی طرح کام کریں۔ کیا یہ عمل شرعاً جائز ہے؟

جواب: مومن کا جاسوسی کرنا حرام ہے۔ کیونکہ لوگوں کے راز اور ان کے عیوب و نقائص علاقۂ ممنوعہ ہیں' اور ان ممنوعہ علاقوں میں داخل ہونا جائز نہیں۔ ہاں' یہ عمل صرف اس صورت میں جائز ہوگا جب کسی بڑے نقصان کی روک تھام یا مفادِ عامہ کے حصول کیلیئے شرعی ضرورت اس

اقدام کا تقاضا کرے۔

سوال: خبروں کی کانٹ چھانٹ کرنا' یا ایک حصہ کاٹ کر بقیہ کو نشر کرنا' شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟
جواب: یہ عمل اگر حقیقت کے برخلاف اظہار کا باعث نہ ہو تو جائز ہے۔ یعنی اگر اسے اس طرح بنا کر پیش کیا جائے کہ دوسرے اس سے خلافِ واقع مطلب اخذ نہ کریں' تو جائز ہے۔

سوال: کیا اس قول: انظر الیٰ ماقیل لا من قال (یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے' یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے) کی بنیاد پر کسی ایسے شخص کے بارے میں لکھنا جائز ہے جس نے اسلامی معاشرے میں بحث اور سوال اٹھائے ہیں؟
جواب: بنیادی طور پر یہ عمل جائز ہے۔ سوائے اُس وقت کے جب اس شخص کی تائید اور اسکے نام اور افکار کا نشر ہونا اسلام اور اسلامی معاشرے کیلئے ضرر رساں ہو۔ (ایسی صورت میں یہ عمل جائز نہیں رہے گا)

(٦)

بازار کے احکام

بازار کے احکام

سوال: بعض دکانوں پر لکھ کر لگا دیا جاتا ہے کہ: خریدا ہوا مال واپس یا تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ کیا اس کی پابندی لازم ہے؟ کیا یہ (خریدار پر سے) نقص وغیرہ (کی صورت میں مقررہ مدت میں مال لوٹانے) کے اختیار کو ختم کر دیتا ہے؟

جواب: لکھ کر لگائی گئی یہ عبارت (خرید و فروخت کے) معاہدے کے ضمن میں رکھی گئی شرط کی حیثیت رکھتی ہے، جو (خریدار پر سے) اختیارات کو ختم کر دیتی ہے اور خریدار کو بغیر کسی اختیار کے خریداری کا پابند بنا دیتی ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب خریدار نے اس عبارت کو پڑھا ہو اور اس کے بارے میں مطلع ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ خریدار نے اس عبارت کو نہ دیکھا ہو، یا وہ پڑھنا ہی نہ جانتا ہو۔

سوال: بعض جگہوں پر کسٹم کا ضبط کیا ہوا سامان بیچا جاتا ہے۔ کیا اس سامان کو خریدنا جائز ہے؟

جواب: اس قسم کے سامان کی خریداری اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کے مالک کی

رضا مندی یا اس سے اسکی لاتعلقی کا علم نہ ہو۔ اگر ان اشیا کے مالکوں کا پتا ہو‘ یا ان کا پتا کرنا ممکن ہو‘ اور وہ انہیں خریدنے کی اجازت دے دیں‘ یا اس عمل سے ان کی لاتعلقی کا علم حاصل کیا جا سکے‘ تو اِس سامان کی خریداری جائز ہے۔ لیکن اگر اِن اشیا کے مالک معلوم نہ ہوں مجہول ہوں‘ تو ان اشیا پر مجہولِ مالک کا حکم لاگو ہوگا اور اس بارے میں حاکمِ شرع سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کوئی شخص گاڑیوں یا دیگر اشیا کی خرید و فروخت کرنے والے کسی ادارے میں جاتا ہے اور ان سے کوئی خاص قسم کی گاڑی یا شے طلب کرتا ہے اور انہیں اپنی مطلوبہ شے کی خصوصیات بتاتا ہے تاکہ وہ اسے اسکے لئے فراہم کریں اور وعدہ کرتا ہے کہ اسے خرید لے گا۔ کیا اس شخص پر اس وعدے کی پابندی لازم ہے؟

جواب: اگر یہ وعدہ‘ ان اشیا کو اپنے لئے خریدنے کی درخواست پر مشتمل ہو‘ یعنی صورت یہ ہو کہ ادارے کا مالک اشیا کی خریداری میں اسکا وکیل ہو‘ یا یہ درخواست معاملے کی شکل و صورت رکھتی ہو‘ تو اسکی پابندی لازم ہے۔ لیکن اگر یہ درخواست ایسے قول و قرار کی صورت میں ہو جو معاملے (سودے) جیسے معاہدے پر مشتمل نہ ہو‘ تب اسکی پابندی لازم نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں (نہ ہی وکالت کی صورت میں اور نہ کسی معاملے کی شکل میں) کوئی معاہدہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اسکے باوجود تکلیف کے لحاظ سے اس قول و قرار کا وفا کرنا مستحب ہے اور وعدہ کرنے کی صورت میں ممکن ہے اسے وفا کرنا واجب ہو۔ لہٰذا احتیاط یہ ہے کہ اس وعدے کو پورا کیا جائے۔

لیکن اگر کسی متعین چیز کی خرید و فروخت پر اتفاق ہو گیا ہو‘ تو ایسی خرید و فروخت باطل ہے۔ کیونکہ جس چیز کا سودا ہوا ہے وہ فی الحال بیچنے والے کی ملکیت نہیں ہے۔ اور رسولِ مقبول کی حدیث ہے کہ: **لا تبع ما ليس عندك** (جو چیز تمہارے پاس موجود نہیں (یعنی جس کے تم مالک نہیں ہو) اسے فروخت نہ کرو)۔ لہٰذا بیچنے والا شخص قیمت یا قیمت

کے پیشگی وصول کردہ کچھ حصے کا مالک نہیں۔

لیکن اگر خرید وفروخت کلی صورت میں اور ذمے ہو یعنی جس مال کا سودا کیا جارہا ہے وہ مالک کے پاس موجود کوئی معین مال نہ ہو تو ایسی خرید وفروخت درست ہے اور دونوں فریق اس چیز کے مالک ہو جائیں گے جو ابھی منتقل ہو گی۔ خریدار اس غیر متعین مال کا مالک ہو جائے گا جو فروخت کرنے والے کے ذمے ہے اور فروخت کرنے والا بھی اس قیمت کا مالک ہو جائے گا جو خریدار کے ذمے واجب ہے۔ اس طرح پیشگی ادا کردہ رقم (بیعانہ) فروخت کرنے والے کی ملکیت ہو جائے گا اور وہ مال کے حصول یا کسی اور مقصد کیلئے اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔

سوال: گزشتہ سوال کے ضمن میں ہی عرض ہے کہ اگر مال فروخت کرنے والا مال کی پوری قیمت پیشگی وصول کر لے اور پھر اسی رقم سے مال خریدے اور وہی مال خریدار کو زیادہ قیمت پر فروخت کرے، تو کیا یہ سودا درست ہوگا؟ اور کیا اس سے حاصل ہونے والا منافع جائز ہوگا؟

جواب: اگر خرید وفروخت، گزشتہ سوال کی پہلی اور دوسری صورت کی طرح ہو، تو فروخت کرنے والا قرض کی بابت رقم کا مالک ہے اور زیادہ قیمت پر مال فروخت کرسکتا ہے اور اضافی منافع حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ خرید وفروخت کا عمل ان کے آپس میں اتفاق کے ساتھ مکمل اور درست طور پر انجام نہیں پایا ہے۔ لیکن اگر تیسری صورت کی مانند ہو تو فروخت کرنے والا شخص (بیعانے کی) رقم کا مالک ہے اور اسے اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اس قیمت سے زیادہ طلب اور وصول کرے جس پر اسکا اور خریدار کا اتفاق ہو چکا تھا۔

سوال: آج کل لین دین کا ایک طریقہ رائج ہے جسے ''معاملہ بشرطِ فروخت'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک شخص اپنا مال فروخت کرنے کی غرض سے دوسرے شخص کو دیتا ہے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ اس طرح کے معاملے کی بنیاد کیا ہے؟ جس شخص نے مال کو امانت کے بطور

حاصل کیا ہے کیا اِس پر لازم ہے کہ وہ اسے اسی قیمت پر بیچے جسے فروخت کرنے والے نے معین کیا ہے؟ یا وہ امانت حوالے کرنے والے (فروخت کرنے والے اصل شخص) کے مالی حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے جس قیمت اور جن شرائط پر چاہے مال بیچ سکتا ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب میں دو صورتیں فرض کی جاسکتی ہیں:

پہلی صورت: یہ مال مالک کی امانت کے طور پر فروخت کرنے والے کے پاس ہو اور اسکے منافع میں اسکا حصہ ہو۔ اس صورت میں (اگر امانتاً دینے والے نے شرط رکھی ہو تو) قیمت میں اس کی طرف سے لگائی گئی شرط کا لحاظ رکھا جانا چاہیے' اور اگر وہ فروخت کرنے میں مطلق وکالت رکھتا ہو' تو آزاد ہے کہ مال کی جو قیمت چاہے رکھے۔

دوسری صورت: وہ شخص جس کے سپرد مال کو بطورِ امانت کیا گیا ہے' وہ سارے مال کو ایک معین قیمت پر خریدے۔ البتہ اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس میں سے کچھ مال وہ فروخت نہیں کرسکا تو اسے اسکے مالک کو واپس کردے گا اور اس (واپس کی گئی) مقدار کا سودا ختم ہو جائے گا۔ اس صورت میں اسے اس مال کی قیمت کے تعین' اسکی فروخت کے طریقے اور اسکی شرائط کے سلسلے میں مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں مال اسکی ملکیت ہے اور وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مال میں تصرف کرے۔

عام طور پر رائج "معاملہ بشرطِ فروخت" اس دوسری صورت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

سوال: کیا قرض کے مقابل حاصل کیا جانے والا ہر قسم کا فائدہ سود ہے' یا صرف اس وقت سود کہلائے گا جب اسکی شرط رکھی جائے؟

جواب: سود اس وقت کہلائے گا جب قرض کے معاہدے میں شرط رکھی جائے۔ لیکن اگر شرط نہ رکھی جائے تو پھر سود نہیں' اور ایسا نفع لینا حرام نہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے کہ: **خير القرض ما جر منفعة** (بہترین قرض وہ ہے جس کے نتیجے میں کوئی فائدہ

ہو۔ وسائل الشیعہ ۔ج ۱۸۔ص ۳۵۵۔ روایت ۲۳۸۳۵)۔ اس فائدے سے مراد وہ نفع ہے جو قرض لینے والا شخص، قرض دینے والے شخص کو اپنی خوشی سے ادا کرے۔ امامؑ فرماتے ہیں: جاء الربا من قِبل الشرط، وانما تفسده الشروط (سود پہلے سے شرط رکھنے کی وجہ سے ہوتا ہے اور شرط رکھنا نفع کو فاسد کر دیتا ہے۔ وسائل الشیعہ ۔ج ۱۸۔ص ۱۹۰۔ روایت ۲۳۴۶۳)

سوال: کیا رائج کرنسی حقیقی مالی حیثیت رکھتی ہے، یا وہ اسناد ہیں جن کی ضمانت حکومت نے لی ہے؟ بالخصوص جبکہ ان کاغذوں پر سونا یا چاندی بھی نہیں چڑھایا گیا ہے اور بسا اوقات حکومت ان کاغذوں کو منسوخ کر دیتی ہے اور پھر ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔

جواب: کرنسیاں، اس قانونی اعتبار کے لحاظ سے جس کی عقلی بنیاد بھی ہے حقیقی مالی حیثیت کی حامل ہیں۔ البتہ ان کاغذوں کا اعتبار سونے یا قومی سرمائے جیسے معدنیات اور ان اموال کی بنا پر ہونا چاہئے جن کی حکومت مالک ہے۔ مراد یہ نہیں ہے کہ مثلاً پانچ روپے کے سکے کو اسکی مالیت کے عین برابر سونے یا دھات سے ڈھالا جائے۔

قدرتی طور پر کاغذی کرنسی کا مالی اعتبار اس وقت تک ہے جب تک اسے اعتبار دینے والا اسکے اعتبار کی ضمانت دیتا ہو۔ اور یہ اعتبار دینے والی وہ قدرت اور حکومت ہے جس میں اعتبار عطا کرنے کی طاقت ہو۔ جب کبھی حکومت (جسے اختیار حاصل ہے) اسکا اعتبار ختم کر دے گی، اسکی کوئی قیمت نہ رہے گی۔

سوال: کیا چیک کو اسکی اس وقت کی قیمت سے کم قیمت پر اور اسی کرنسی میں خریدنا جائز ہے؟ اسے دوسری کرنسی سے خریدنے کا کیا حکم ہے؟ اگر چیک مسترد (bounce) ہو جائے، تو اس چیک کے اصل مالک کو خریدنے والے کو کیا دینا چاہئے؟

جواب: چیک نقد رقم نہیں ہے، بلکہ مالی سند یا وثیقہ ہے اور یہ معاملہ نقد بہ نقد کی فروخت کا

ہے۔ اگر چیک مسترد (bounce) ہو جائے تو وہی رقم واپس کرنی چاہئے جو وصول کی ہے۔ کیونکہ چیک کی رقم سے جو کم مقدار وصول کی گئی ہے' وہ جلد ادائیگی کی وجہ سے ہے' جو ادا نہیں ہو سکی ہے۔

سوال: کیا اس قیمت پر کرنسی کی خرید و فروخت جائز ہے' جو معاہدے کے وقت معین کی گئی تھی' چاہے اسے جلد ہی تحویل میں دے دیا گیا ہو؟
جواب: جب ہم کہتے ہیں کہ کرنسیوں کا حکم سونے اور چاندی کے سکوں ہی کا حکم رکھتا ہے' اور ان کی خرید و فروخت کے وقت تقابض (دینا اور لینا) لازم ہے (البتہ ہماری رائے میں تقابض احتیاطِ واجب ہے) اس بنا پر تحویل میں تاخیر کی صورت میں مذکورہ معاملہ صحیح نہیں' اور خرید و فروخت کے عمل کو روپے کے تحویل میں دینے اور تحویل میں لینے کے وقت انجام پانا چاہئے۔

سوال: ایسا شخص جو بینکوں میں لوگوں کی ضمانت لے سکتا ہے' کیا وہ اس کے عوض جس شخص کی ضمانت لے رہا ہے اُس سے یا بنک سے اجرت وصول کر سکتا ہے؟
جواب: (اسکا ایسا کرنا) جائز ہے۔ کیونکہ ضمانت ایک ایسا عمل ہے کہ اگر ضمانت لینے والا اسے رضا کارانہ طور پر انجام نہ دے رہا ہو تو یہ عمل اسے اجرت کا مستحق قرار دیتا ہے۔

ذبیحے اور گوشت فروخت کرنے کے احکام

سوال: کیا ایسی کمپنیوں میں ملازمت جائز ہے جو غیر شرعی ذبیحے یا سور کے گوشت کو پیک کرنے کا کام کرتی ہیں؟ مثلاً ان کمپنیوں کے ایسے شعبوں میں کام کرنا جہاں پیکنگ ہوتی ہے' یا جہاں ان کی مشینری اور ساز و سامان کی صفائی ستھرائی ہوتی ہے؟
جواب: اصولی اعتبار سے ایسی کمپنیوں کے پیکنگ کے شعبے میں کام کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن

اگر یہ پیکنگ ان غیر مسلموں کو فروخت کرنے کیلئے کی جاتی ہے جو اس طرح کے گوشت کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں، تو ایسے شعبے میں کام کرنا جائز ہے۔ البتہ احتیاط یہ ہے کہ اس عمل سے پرہیز کیا جائے اور اس احتیاط کو ترک کرنا مناسب نہیں۔ البتہ اس کام کی جگہ اور مشینوں کی صفائی ستھرائی ہر حال میں جائز ہے۔

سوال: گائے، بکری یا مرغی کے گوشت کی خریداری کے وقت، کیا اس پر یہ تحریر ہونا کافی ہے کہ یہ اسلامی شریعت کے مطابق ذبح کیا گیا ہے، جبکہ ہمیں اس بات کا علم بھی ہو کہ یہ غیر مسلم ممالک سے درآمد (import) کیا گیا ہے؟
جواب: یہ تحریر کافی نہیں ہے، جب تک صحیح طریقے سے ذبیحے کا اطمینان حاصل نہ ہو جائے۔

سوال: کیا ایسے علاقے کے بازار سے بغیر تحقیق کے گوشت خریدنا جائز ہے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے اور عیسائی اقلیت میں رہتے ہیں؟
جواب: بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں کے بازار میں فروخت ہونے والے ذبیحے کا گوشت اس کے پاک ہونے کی علامت ہو، اگر چہ اس علاقے میں غیر مسلم اقلیت بھی رہتی ہو۔

مالکِ مکان اور کرایہ دار

سوال: کیا مالکِ مکان، مقررہ مدت کے خاتمے پر، کرایہ دار کو مکان سے نکال سکتا ہے؟
جواب: جائز ہے، لیکن اس وقت نہیں جب کرائے کے معاہدے میں یہ شرط ہو کہ کرایہ دار مدت کو بڑھا سکتا ہے۔ جیسا کہ بہت سے ممالک میں اس صورتحال کے قانونی شکل میں رواج پا جانے کی وجہ سے یہ چیز مالکِ مکان اور کرایہ دار کے درمیان ایک ضمنی شرط کی صورت میں بدل چکی ہے۔

سوال: کیا مالکِ مکان، مقررہ مدت کے خاتمے پر کرائے کی رقم بڑھا سکتا ہے؟
جواب: اگر کرایہ دار نے کرایہ نہ بڑھانے کی شرط نہ رکھی ہو، تو مالکِ مکان کرایہ بڑھا سکتا ہے۔ لیکن اگر شرط رکھی ہو (چاہے ضمنی شرط کی صورت میں، جیسے کہ بعض ممالک میں رائج ہے) تو پھر مالکِ مکان کو کرایہ بڑھانے کا حق نہیں۔

سوال: بعض کرائے دار مکان یا کرائے کی جگہ چھوڑنے کیلئے اسکے مالک سے پیسے طلب کرتے ہیں۔ کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟
جواب: اگر شرط یا معاہدے کی وجہ سے، کرایہ دار کو وہاں رہنے کا حق حاصل ہو، تو اس حق سے دستبردار ہونے کیلئے وہ کچھ رقم طلب کر سکتا ہے۔

سوال: فقہ اسلامی کی روشنی میں مالکِ مکان اور کرایہ دار کے درمیان تعلق کی بنیاد کیا ہے؟ کیا کرائے داری کا معاہدہ لازم العمل معاہدہ ہے، یا یہ لوگوں کے درمیان رائج ایک عرفی معاہدہ ہے، یا ایک ایسا قانون ہے جو ہر ملک میں رائج ہے؟
جواب: یہ فریقین پر لاگو ہونے والا ایک قانونی معاہدہ ہے۔ لہٰذا آیتِ قرآنی: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (اپنے معاہدوں کی پابندی کرو۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۱) کی بنیاد پر فریقین پر اپنے کیئے ہوئے معاہدے کی پابندی لازم ہے۔ نیز لوگوں کے درمیان رائج عرف اور شہروں میں لاگو ہر قانون خود اپنے طور پر کسی قدر و قیمت کا مالک نہیں ہوتا جب تک یہی عرف اور قانون ایک عمومی اتفاق رائے اور تفاہم میں تبدیل نہ ہو جائے۔ یعنی اگر کرائے کا معاہدہ اس توافق و تفاہم پر مبنی ہو اور اسکا ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہو، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ طرفین کے درمیان ایک ضمنی شرط طے پا چکی ہے اور انہیں (واضح شرط کی مانند ہی) اس شرط کی بھی پابندی کرنی چاہئے اور اس پابندی کیلئے پیغمبر اسلامؐ کا یہ قول دلیل ہے کہ: المؤمنون عند شروطهم (مومنین کو اپنی طے شدہ شرطوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۔ ص ۲۷۶۔

روایت ۱۸۰۷۲)

سوال: بعض لوگ زیارت وسیاحت کے سیزن میں کرائے پر چلانے کیلئے کسی جگہ کو کرائے پر لیتے ہیں۔ کیا ان کا اس طرح کسی دوسرے شخص کو یہ جگہ کرائے پر دینا درست ہے؟
جواب: اگر دوسری مرتبہ کرائے پر دینا' پہلی مرتبہ کرائے پر دینے میں شامل ہے۔ اور پہلی مرتبہ کرائے پر دیتے وقت اس بات کو ملحوظ بھی رکھا گیا ہے کہ کرائے پر لینے والا اس جگہ کو زائرین اور سیاحوں کو کرائے پر دے گا' تو ایسا کرنا درست ہے۔

سوال: کیا ٹیلی فون' فیکس مشین اور کمپیوٹر وغیرہ کی مانند رابطے (communication) کے جدید وسائل کے ذریعے خرید وفروخت' کرائے اور مبادلہ (exchange) جیسے معاملات طے کرنا جائز ہے؟ ان معاملات کی صحت کیلئے ضروری قواعد کیا ہیں؟
جواب: مذکورہ وسائل سے مبادلے (exchange) کے سوا تمام معاملات جائز ہیں۔ کیونکہ مبادلے میں تقابض (یعنی تحویل میں دینا اور تحویل میں لینا) شرط ہے۔ جبکہ معاملے کو صحت دینے والا ضابطہ یہ ہے کہ طرفین کی طرف سے معاملے کو بیان کرنے والا اور اسکی پابندی کا اعلان کرنے والا (خواہ زبانی' خواہ تحریری صورت میں) کوئی ذریعہ ہونا چاہئے اور ہر معاملے کی عمومی شرائط فراہم ہوں۔ ہم اسکے ایک مجلس میں ہونے' یا ایجاب وقبول کی لفظی ادائیگی کو شرط نہیں سمجھتے۔ لہٰذا معاہدے کا کسی بھی ایسے طریقے سے انجام پانا جو اسکی برقراری کی علامت ہو اور عرف میں بھی معاہدے کا مصداق شمار کیا جائے' کافی ہے۔ حتیٰ معاہدہ خواہ تحریری صورت ہی میں کیوں نہ کیا گیا ہو۔

سوال: اگر معاہدہ فسخ ہو جائے اور معاملہ ختم ہو جائے' تو اس صورت میں دلال نے دلالی کی وجہ سے جو رقم وصول کی ہے' کیا اسے وہ رقم واپس لوٹانی چاہئے؟

جواب: اسے یہ رقم واپس نہیں کرنی ہوگی۔ کیونکہ اس نے اپنی دلالی اور خرید وفروخت انجام دے کر اپنی ذمے داری پر عمل کیا ہے' لہٰذا مذکورہ رقم کا مستحق ہے۔ بعد میں جو کچھ پیش آئے گا اسکا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ معاملے کے بارے میں بعد میں پیش آنے والے حوادث کی اسکے ساتھ شرط نہیں ہوئی ہے۔

سوال: اگر کرائے دار نے سکونت اختیار کرنے سے پہلے گھر کی تعمیر کیلئے کچھ رقم خرچ کی ہو' تو کیا کرائے کا معاہدہ ختم ہو جانے کی صورت میں وہ مالکِ مکان سے اپنی اِس رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے؟

جواب: نہیں' وہ اس رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتا' ماسوائے اس صورت کے جبکہ اس نے مالکِ مکان کے کہنے پر اسکے حساب میں گھر تعمیر کیا ہو۔

سوال: کیا غیر مسلموں کو اپنی املاک کرائے پر دینا جائز ہے؟ نیز کیا کرائے دار پر ذاتی طرزِ عمل کے بارے میں مالکِ مکان کی طرف سے عائد کردہ شرائط کی پابندی لازم ہے؟

جواب: اگر اس صورت میں مسلمانوں کو کوئی نقصان یا مفسدہ پہنچنے کا امکان نہ ہو' تو غیر مسلموں کو اپنی املاک کرائے پر دینا جائز ہے۔ نیز کرائے دار (اور مالکِ مکان پر بھی) لازم ہے کہ کرائے کے معاہدے کے تقاضوں اور اسکی شرائط کی پابندی کریں۔

سوال: ایسے کمرے جن کا ابھی کوئی وجود نہیں' اور صرف نقشے پر موجود ہیں' انہیں خریدنے کا حکم کیا ہے؟

جواب: انہیں خریدنا جائز ہے' اس قسم کا معاملہ بیع فی الذمہ کے مشابہ ہے۔

بیمہ کمپنیاں

سوال: بیمے بالخصوص بیمہ زندگی (lifeinsurance) کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ بعض لوگ بیمے کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں اور اسے مجہول اور لاعلمی پر مبنی معاہدہ قرار دیتے ہیں اور اسے سود پر مشتمل معاملے کی مانند سمجھتے ہیں اور بیمہ زندگی کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ اس قسم کا بیمہ اللہ تعالیٰ کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے؟

جواب: شرع کی رو سے بیمہ (بشمول بیمہ زندگی) کا معاہدہ صحیح ہے۔ کیونکہ یہ ایک مستقل معاہدہ اور آیہ قرآن: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ کے تحت ہے۔ یہ مجہول یا لاعلمی پر مبنی معاہدہ نہیں ہے اسلئے کہ فریقین اسکے انجام اور نتائج سے آگاہ ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ بیمہ کمپنی کا اس بات سے لاعلم ہونا کہ وہ بیمہ زندگی کی صورت میں بیمہ کروانے والے سے کیا وصول کرے گی یا بیمہ کرنے والے کا اس بات سے آگاہ نہ ہونا کہ وہ پوری مدت میں کتنی رقم بیمہ کمپنی کو ادا کرے گا بالکل قدرتی بات ہے اور معاہدے کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ کیونکہ مجہول معاملے کے متعلق موجود دلائل ان موارد کو شامل نہیں کرتے جنہیں عقلا نے بھی لوگوں کی زندگی کی رائج اقتصادی ضرورت تسلیم کیا ہے۔

اس معاملے میں سود تو سرے سے ملحوظ ہے ہی نہیں۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ بعض مواقع پر بیمہ کمپنی معاہدہ توڑنے کی صورت میں مال کو کچھ اضافے کے ساتھ واپس کرتی ہے تو وہ اس سود کے معنی میں شامل نہیں ہے جو معاہدے کی صورت میں لیا جاتا ہے (۱) اور حرام ہے۔

۱۔ معاہدے والا سود یہ ہے کہ کوئی شخص کچھ مال کسی فرد یا کمپنی کو اس شرط پر دے کہ وہ اسے اضافے کے ساتھ واپس کرے گا اور معاہدے میں شرط رکھے کہ جو رقم وہ قرض دے رہا ہے اس سے زیادہ اسے واپس کی جائے گی۔

اور یہ کہنا تو بہت ہی عجیب سی بات ہے کہ بیمۂ زندگی خدا کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ معاہدے میں یہ بات پیش نظر نہیں ہوتی کہ بیمہ کرنے والا بیمہ کرانے والے کی زندگی کی حفاظت کرے گا' بلکہ معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بیمہ کرانے والے کی موت کی صورت میں ایک معین رقم اسکے اہلِ خانہ کو دے گا۔

سوال: کیا بازار سے ایک خاص زمانے میں آئندہ قیمت بڑھنے کی امید پر مال خریدنا ذخیرہ اندوزی شمار ہوتا ہے؟ نیز کیا ضرورت کی تمام اشیا اور مال و اسباب پر ذخیرہ اندوزی کا اطلاق ہوتا ہے' یا یہ ان میں سے کچھ خاص کیلئے محدود ہے؟
جواب: اگر بازار میں فراہم کردہ مال مفقود (غائب) ہو جائے اور اسکا ذخیرہ کرنا لوگوں کیلئے نقصان دہ ہو' تو یہ عمل ذخیرہ اندوزی ہے اور حرام ہے۔

ذخیرہ اندوزی کی حرمت کا موضوع لوگوں کی تمام عام اور خاص ضروریاتِ زندگی ہیں اور ہمارے خیال میں اس میں صرف معین اشیا ہی شامل نہیں' جیسا کہ فقہا کے درمیان مشہور ہے۔

سوال: اپنی مارکیٹ بنانے کی غرض سے پہلا ٹھیکیدار کام لینے والے شخص سے ایک کام پر معاملہ طے کرتا ہے اور دوسرا ٹھیکیدار پہلے ٹھیکیدار سے طے کرتا ہے کہ جس قیمت پر اس نے معاملہ طے کیا ہے وہ اس سے کم پر کام انجام دے گا۔ اس طرح جو اضافی رقم پہلے ٹھیکیدار نے کام لینے والے شخص سے وصول کی ہے وہ اُسے ملے گی۔ کیا اس دوسرے ٹھیکیدار سے طے پانے والا معاہدہ درست ہے؟
جواب: پہلا ٹھیکیدار تمام کام دوسرے ٹھیکیدار کو کم قیمت پر حوالے کرنے کا مجاز نہیں' سوائے اس صورت میں جبکہ اس نے معاہدے سے پہلے کچھ کام اسکے ساتھ براہِ راست یا بالواسطہ انجام دیا ہو۔

سوال: تجارت میں منافع کی حد کیا ہونی چاہئے؟
جواب: اصولاً معاملات میں منافع کی کوئی حد معین نہیں۔ لیکن اگر اُن چیزوں کی تجارت ہو جو ذخیرہ اندوزی کی حرمت میں شامل ہیں، تو اُن میں منافع اِس قدر زیادہ نہ رکھا جائے جو لوگوں پر ظلم ہو اور اُن کیلئے باعثِ ضرر و نقصان ہو۔ اسی طرح اگر معاملہ کسی ایسے اسلامی ملک میں انجام دیا جا رہا ہو جو اسلامی شریعت اور پابندِ شرع قیادت کے تابع ہو اور اس مملکت میں مفادِ عامہ کی بنیاد پر نفع کیلئے کچھ قواعد مقرر کیئے گئے ہوں، تو ولایتِ فقیہ کے تقاضوں اور مفادِ عامہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اُن قواعد کی پابندی کی جانی چاہئے۔

سوال: کیا کسی مال کی خاص علامات کو بدلنا دھوکا دہی ہے؟ اگر اسکے عوض مال کی قیمت کم ہو جائے، تو کیا حکم ہے؟
جواب: تجارت میں دھوکا دہی کے معنی ہیں گھٹیا اور ناپسندیدہ جنس کو عمدہ اور پسندیدہ جنس کے پردے میں چھپا کر پیش کرنا، یا اچھی چیز میں بُری چیز کی ملاوٹ کرنا، جیسے دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرنا، یا بُری چیز کو اچھا بنا کر پیش کرنا، جیسے باسی سبزیوں کو تازہ ظاہر کرنے کیلئے اُن پر پانی چھڑکنا، یا ایک چیز سے دوسری چیز کو چھپا دینا، جیسے لوہے پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھا دینا تاکہ لوگ گمان کریں کہ یہ سونا یا چاندی ہے۔

بعض اوقات اشیا کا نقص واضح ہوتا ہے اور فروخت کرنے والے نے بھی اس عیب کو نہیں چھپایا ہوتا، لیکن خریدار یہ سمجھتا ہے کہ بیچنے والا اُسے مال کا عیب بتائے گا، لہٰذا وہ اس کا عیب جاننے کیلئے اسے اچھی طرح نہیں دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ مال بے عیب ہے۔ ایسے موقع پر جس خریدار نے فروخت کرنے والے پر اعتماد کیا ہے اُسے مال کے عیب سے آگاہ نہ کرنا، دھوکا دہی ہے۔

اگر مال کی مخصوص علامات کو اس طرح بدلا جائے کہ تبدیلی واضح نہ ہو اور معاہدے میں اس مال کا اسکے اصل نام، خاص عنوان اور اصلی حالات میں لحاظ رکھا جائے، تو یہ دھوکا

دہی ہے اور حرام ہے۔ چاہے ایسے مال کی قیمت معمول سے کم ہی کیوں نہ وصول کی جائے۔

سوال: تجارت میں دھوکا دہی (fraud) کس حد تک نظر انداز کی جا سکتی ہے؟
جواب: اس حد تک جسے عام طور پر لوگ نظر انداز کرتے ہیں اور جس حد تک لوگ عموماً باریک بینی اور موشگافی سے کام نہیں لیتے، اس حد تک اس میں اشکال نہیں ہے اور جس کے ساتھ فریب کیا جا رہا ہے اسے اس حد (کی فریب دہی) میں معاملہ ختم کرنے کا حق حاصل نہیں۔

سوال: کیا حکومت کی طرف سے مقرر کی گئی قیمت کی پابندی کرنا واجب ہے؟ بالخصوص جبکہ قیمتِ خرید سرکاری قیمت سے زیادہ ہو؟
جواب: سرکاری قیمت کی پابندی واجب نہیں ہے، سوائے اُس جگہ جہاں ایک ایسی حکومت نے اسے لازم قرار دیا ہو جس کی اطاعت واجب ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد انتہائی ضروری مصلحت کا خیال رکھنا اور لوگوں کو بھاری نقصان سے بچانا ہے۔

سوال: کیا ایسی اشیا کی خرید و فروخت جائز ہے جو کسٹم کے بغیر یا اسمگلنگ کے ذریعے لائی جاتی ہیں؟
جواب: بنیادی طور پر تو یہ عمل حرام نہیں ہے، سوائے اُس وقت جبکہ یہ کسی حرام عنوان کا لازمہ نہ ہو (۱) چنانچہ اضطراری حالات اور ثانوی عنوان کے تحت اسکا بھی خاص حکم ہے۔

سوال: اگر کسی مال کو نقد لینے اور ادھار لینے کی صورت میں اسکی قیمت میں فرق ہو، تو کیا بیچنے والے پر یہ بتانا لازم ہے کہ ادھار لینے کی صورت میں خریدار کو نقد لینے سے زیادہ قیمت ادا

۱۔ عنوانِ لازمہ: جیسے کہ کوئی فعل مومن کی ہتک حرمت کا باعث بنے یا کسی اہم اسلامی مفاد کے لئے باعث ضرر ہو۔

کرنی پڑے گی؟
جواب: اگر معاملہ ادھار پر ہو اور فروخت کرنے والا اور خریدنے والا دونوں کسی معین قیمت پر متفق ہو جائیں، تو یہ معاملہ صحیح ہے۔ اگر چہ خریدار نقد اور ادھار قیمت کے فرق سے واقف نہ بھی ہو۔

سوال: اسٹاک مارکیٹ میں حصص کے سودوں میں کن شرائط کا لحاظ رکھنا چاہئے؟
جواب: اسٹاک مارکیٹ کے سودے بھی دوسری طرح کی خرید و فروخت کی مانند ہیں، اور ان سودوں میں بھی خرید و فروخت کی شرعی شرائط کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

سوال: ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی کے عوض اسکی اس روز کی قیمت سے زیادہ قیمت پر ادھار فروخت کرنے کا کیا حکم ہے؟
جواب: اگر یہ خرید و فروخت وزن کرنے اور ناپنے کی قسم کی نہ ہو اور یہ سودا (خرید و فروخت کی صورت میں) ادھار کا نہ ہو، تو جائز ہے۔

سوال: کیا مال بیچنے والے کا وکیل، خود اس مال کو خرید سکتا ہے؟ اسکے لئے کن قواعد و ضوابط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؟
جواب: یہ عمل اس صورت میں جائز ہے جبکہ اسے اپنے موکل کی طرف سے خود خرید لینے کی وکالت بھی حاصل ہو۔ اس عمل میں مال کے مالک کی طرف سے مقرر کردہ ضوابط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جس طرح دوسروں کو فروخت کرنے میں ان قواعد کا لحاظ رکھتا ہے۔

سوال: کیا کمپنی کے ایک شریک (partner) کا اسی کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر، مینیجر یا ملازم کی حیثیت سے کام کرنا اور اسکے عوض ایک معین اجرت لینا جائز ہے؟

جواب: جائز ہے' کیونکہ منیجر یا کارکن ہونا اسے اجرت کا مستحق بنا دیتا ہے- اس لئے کہ منیجر ہونے اور پارٹنر ہونے میں فرق ہے اور متعدد حیثیتوں کی صورت میں متعدد حق رکاوٹ نہیں ہیں۔

سوال: کیا ایک تاجر اپنا امپورٹ لائسنس دوسرے تاجر کو فروخت کر سکتا ہے؟ یعنی سودے اس تاجر کے نام سے انجام پائیں جس کا لائسنس ہے لیکن مال دوسرے خریدنے والے تاجر کا ہو۔

جواب: اگر اس امپورٹ لائسنس کی کوئی مالی حیثیت ہو اور وہ قابلِ انتقال ہو' تو اسکی خرید و فروخت جائز ہے۔ اور اسکے مقابل رقم وصول کرنا بھی جائز ہے' اسلئے کہ یہ رقم امپورٹ لائسنس کے استعمال کے عوض حاصل کی جارہی ہے۔

سوال: ایسی خرید و فروخت جس میں مدت معین ہو' کیا اس میں ہرجانے کی شرط رکھنا درست ہے؟ مثال کے طور پر کوئی شخص ایک مال کو مقررہ قیمت پر خریدے اور طے پائے کہ (مثلاً) ایک ماہ بعد مال اسکے حوالے کیا جائے۔ ایسی صورت میں کیا وہ یہ شرط رکھ سکتا ہے کہ اگر بیچنے والے نے مال حوالے کرنے میں تاخیر کی تو اُسے ہرجانہ ادا کرنا ہوگا؟

جواب: یہ عمل جائز نہیں ہے۔ کیونکہ تاخیر کی صورت میں اس قسم کی شرط عائد کرنا' سود لینے کے مترادف ہے۔

سوال: سگریٹ' لہو ولعب اور کھیل کود کے سامان' یا وہ اشیا جنہیں حلال اور حرام دونوں جگہوں پر استعمال کیا جاسکتا ہے' جیسے ویڈیو' ڈش اینٹینا اور موسیقی کے آلات وغیرہ کی تجارت کا کیا حکم ہے؟ ان سے استفادے کے طریقے کا تعین کیا فروخت کرنے والے کی ذمے داری ہے یا خریدار کی' یا عرفِ عام کی؟

جواب: تجارت کے جائز ہونے کیلئے ضروری ہے کہ جن چیزوں کی تجارت کی جارہی ہے ان کا استعمال حلال ہو۔ایسی چیزیں جنہیں حلال اور حرام دونوں طرح سے استعمال کیا جاسکتا ہے' اگر ان کو فروخت کرتے وقت' ان کے حرام استعمال کی شرط نہ رکھی جائے' تو انہیں بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ فروخت کرنے والے پر لازم نہیں ہے کہ وہ ان کے استعمال کی صورت کی شرط رکھے۔

لہٰذا مذکورہ آلات اگر عام طور پر اور عرفِ عام کی نگاہ میں حلال اور حرام دونوں امور میں قابلِ استعمال ہوں' تو انہیں فروخت کرنا جائز ہے۔ لیکن اگر ان آلات کا حرام امور میں استعمال غالب ہو جائے' اور حلال امور میں استعمال بہت ہی کم رہ جائے' یا بیچنے والا یہ بات جانتا ہو کہ ان آلات کو خریدار کے حوالے کرنا اسکی گمراہی کا سبب بن جائے گا' تو پھر انہیں فروخت کرنا جائز نہیں۔

جہاں تک بات رہی سگریٹ کی' تو کیونکہ ہم نے سگریٹ پینے کی حرمت (حرام ہونے) کا فتویٰ دیا ہے' اسلئے اسکی تجارت بھی ناجائز ہے۔ کیونکہ سگریٹ میں کوئی حلال منفعت نہیں' البتہ ہمارا مقلد اس مسئلے میں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرسکتا ہے اور اُس (مجتہد) کے فتوے پر عمل کرسکتا ہے' جو سگریٹ پینے کو حلال سمجھتا ہو۔

سوال: بعض اشیا اپنے استعمال کی تاریخ کے بعد بھی قابلِ استعمال ہوتی ہیں' فقط ان کی کوالٹی گھٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں کیا فروخت کرنے والے کیلئے لازم ہے کہ وہ ان اشیا کے استعمال کی آخری تاریخ متعین کرے؟

جواب: اگر قابلِ لحاظ احتمال کی بنیاد پر ان اشیا کا استعمال نقصان کا باعث ہو' تو ان اشیا کی فروخت جائز نہیں۔ اور اگر نقصان کا احتمال نہ ہو' تب بھی خریدار کو مطلع کرنا ضروری ہے۔ اگر خریدار کو اس بات سے بے خبر رکھا گیا ہو کہ مال کے استعمال کی تاریخ گزر چکی ہے اور اسے بعد میں یہ معلوم ہو جائے' تو وہ معاملہ ختم کرنے کا حق رکھتا ہے۔

سوال: چند افراد ایک کاروبار میں شریک بنتے ہیں، ان میں سے ایک اس کاروبار کا ماہر ہے جبکہ دوسرے اس بات کا علم نہیں رکھتے کہ انہیں کتنا مال خریدنا چاہئے۔ مال کی خریداری کے بعد وہ دیکھتے ہیں کہ جو مال انہوں نے خریدا ہے وہ بازار کی کھپت سے زیادہ ہے۔ اور اس سارے مال کو فروخت کرنا ممکن نہیں۔ اب کیا تمام شریک (partners) نقصان برداشت کریں گے، یا صرف وہ ماہر شریک (partner) جس نے مال کی کھپت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے؟

جواب: اگر علم اور مہارت رکھنے والا وہ فرد، تمام شریکوں کی طرف سے صاحبِ اختیار وکیل تھا، اور اس نے اپنی تشخیص اور سوج بوجھ کی بنا پر مال خریدا ہے، اور مال اور بازار کے حالات کا جائزہ لینے میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوا ہے، تو تمام شریکوں کو خسارہ برداشت کرنا پڑے گا اور اگر اُس نے بازار کی ضرورت اور مال کی صورتحال جاننے میں کوتاہی کی ہے، تو سارا نقصان صرف اسے اٹھانا پڑے گا۔

سوال: کیا ادھار سامان بیچنا، اور اسے کم قیمت پر نقد خریدنا جائز ہے؟

جواب: بظاہر اس طرح کا معاملہ اس صورت میں درست ہے جب بیچنے والے نے معاملے میں پہلے ہی سے خریدار کے ساتھ یہ شرط طے نہ کی ہو کہ وہ اس مال کو اس سے کم قیمت پر خریدے گا۔ امام موسیٰ ابن جعفرؑ کی ایک حدیث، جسے ان کے بھائی علی بن جعفر نے بیان کیا ہے، اس میں ہے کہ: **سالته عن: رجل باع ثوباً بعشرة دراهم الیٰ اجل ثم اشتراه بنقد بخمسة دراهم ایحل؟ قال: اذالم یشترط و رضیاً، فلا باس** (میں نے ان (امامؑ) سے پوچھا کہ: کسی شخص نے ایک لباس دس درھم میں ادھار فروخت کیا، اور پھر پانچ درھم میں نقد خرید لیا۔ کیا یہ عمل حلال ہے؟ (امامؑ نے) جواب دیا: اگر انہوں نے شرط نہ باندھی ہو، اور رضا و رغبت کے ساتھ انجام دیا ہو، تو کوئی مضائقہ نہیں)

سوال: کیا خریدے ہوئے مال کو اسکی خصوصیات کی بنیاد پر اور اگلے خریدار کو تحویل میں دینے سے قبل، فروخت کرنا جائز ہے؟

جواب: اگر مال اس قسم سے تعلق رکھتا ہو جسے نہ ناپا جا سکتا ہے اور نہ اسے تولا جا سکتا ہے، تو جائز ہے۔ لیکن اگر اس قسم کا ہو جسے ناپا اور تولا جا سکے، تو کوئی حرج نہیں کہ جس قیمت پر خریدا ہے اسی پر بیچ دے اور جس قیمت پر خریدا ہے اس سے زیادہ قیمت پر بیچنا بھی بظاہر جائز ہے۔ البتہ احتیاط یہ ہے کہ جس قیمت پر خریدا ہے اس سے زائد قیمت پر نہ بیچے۔ واللہ العالم۔

سوال: کپڑوں کی فروخت کے مقام پر اشتہار کے طور پر مسلمان عورتوں کی تصاویر کی نمائش، اس علم کے ساتھ کرنا کہ خریداران خواتین کو نہیں پہچانتے کیا جائز ہے؟

جواب: جائز ہے، بشرطیکہ عموم کی نظر میں (یہ تصاویر) جنسی تحریک کا موجب نہ ہوتی ہوں۔

۷

سماجی و سیاسی تعلقات کے احکام

سماجی وسیاسی تعلقات کے احکام

سوال: دوسروں سے تعلقات کے قیام کے بارے میں، شرع کی طرف سے کیا حدود اور معیار مقرر کئے گئے ہیں؟

جواب: واضح ہے کہ کسی بھی انسان سے تعلقات کا قیام حرام نہیں ہے، چاہے وہ مسلم ہو یا کافر، متدین ہو یا غیر متدین۔ ہاں، اگر انسان کو اس بات کا خوف ہو کہ وہ دوسروں کے بُرے اخلاق، عادات اور افکار سے متاثر ہو جائے گا اور اِس کا اُن سے میل جول، اِسکی گمراہی کا باعث ہو گا، تو ایسی صورت میں ایسے لوگوں سے تعلقات کا قیام اِسکے لئے حرام، یا قریب قریب حرام ہے۔ اسی طرح اگر ایسے افراد سے اِسکا میل ملاپ معاشرے میں اِس کی بدنامی کا سبب ہو، تو انسان کیلئے مناسب نہیں کہ وہ کسی ایسی جگہ جائے جہاں جانا اس کیلئے تہمت لگنے کا باعث ہو۔ نیز اگر ایسے افراد سے تعلقات منکر کو قبول کرنا کہے جاسکیں۔ یعنی یہ ظاہر ہو کہ وہ جن لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اُن کی طرف سے ناپسندیدہ اعمال کی انجام دہی پر راضی ہے، تو ایسے تعلقات جائز نہیں۔

بالفاظِ دیگر دوسروں کے ساتھ تعلقات اور میل جول جائز ہے، سوائے اس وقت

جب انسان کو اپنی گمراہی یا بدنامی کا خوف ہو' یا وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں کوتاہی کا مرتکب ہو' جس پر عمل اسکا فرض ہے۔

سوال: میں نے کچھ بدنام جوانوں سے' ان کی اصلاح کی غرض سے دوستی کی ہے۔ میرے اِس عمل کی وجہ سے مجھے لوگوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا ہے۔ اِس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اگر صورت یہ ہے کہ ایسے افراد کی ہدایت واصلاح کا قوی امکان ہے' تو اُن سے دوستی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ لوگ جلد یا بدیر اِس دوستی کے مثبت نتائج سامنے آنے پر حقیقت جان لیں گے۔

لیکن اگر معاملہ معمولی ہو اور انسان پر ایسے لوگوں کے ساتھ گفتگو اور اُن کی ہدایت کا فریضہ واجب نہ ہو' تو لازم ہے کہ انسان اِس طرح کے تعلقات سے پرہیز کرے' بالخصوص جب اِن تعلقات کی وجہ سے اسکی ساکھ متاثر ہو رہی ہو۔

جنسِ مخالف سے دوستی

سوال: کیا میرے لئے اپنی کسی ہم جماعت (classfellow) یا دفتر کی ساتھی (colleague) لڑکی سے دوستی کرنا' اور اسکے ساتھ' اپنے مرد دوستوں کی مانند بات چیت کرنا' سیر و تفریح کرنا اور شرع کی طرف سے حرام قرار دیئے گئے امور کے علاوہ دوسرے تمام امور کو انجام دینا جائز ہے؟

جواب: عورتوں اور مردوں کا ملنا جلنا حرام نہیں ہے۔ لیکن یہ دونوں اپنی اپنی فطری خصوصیات کی بنا پر ایک دوسرے کے بارے میں جو احساس رکھتے ہیں اُس کی موجودگی میں اِس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ اِس قسم کا میل ملاپ شرعی حد تک محدود رہے گا۔ بلکہ شرعی لحاظ سے اِسکے منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں' بالخصوص اگر ان کی دوستی بے تکلفی میں

بدل جائے۔ اور عام طور پر اسی طرح ہوتا بھی ہے۔ یہ نکتہ ہم نے اُس مشہور حدیث سے اخذ کیا ہے جس میں مرد اور عورت کو تنہائی میں ملنے سے منع کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اِس ملاقات میں شیطان اُن کا تیسرا ساتھی ہوتا ہے۔

مرد اور عورت کا تنہائی میں ملنا جلنا بذاتہ قابلِ بحث مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اِس سے صرف اسلئے منع کیا گیا ہے کہ یہ عمل ارتکابِ گناہ کے داخلی اور خارجی حالات فراہم کرتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ گہری دوستی، جس کے ساتھ ملاقاتیں اور طرح طرح کی گفتگوئیں ہوتی ہیں انہی نتائج کو سامنے لاتی ہے جو تنہائی کے اس میل جول سے برآمد ہوتے ہیں، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن اگر مرد اور عورت دونوں ارتکابِ گناہ اور تحریک انگیز صورتحال سے محفوظ ہوں اور اُن کا میل جول حدودِ شرع کے تابع ہو، تو ایسے میل ملاپ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یعنی اگر اُن کا یہ تعلق ارتکابِ حرام کا سبب نہ بنے اور (گہری دوستی کی صورت میں) اِس تعلق کو شرعی عوامل کے ہمراہ جاری رکھنے کیلئے شرعی راستے موجود ہوں، مثلاً یہ تعلق عقدِ شرعی پر منتہی ہو، تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔

سوال: کیا تارک الصلوۃ کے ساتھ کسی کاروبار میں شریک ہونا جائز ہے؟

جواب: بنیادی طور پر یہ عمل جائز ہے، ماسوا اس صورت کے جب نہی عن المنکر کی شرائط کی مخالفت ہوتی ہو۔ بالفاظِ دیگر اگر نہی عن المنکر کی شرائط موجود نہ ہوں، مثلاً وہ شخص نہی عن المنکر کی کوئی پروا نہ کرے، یا اسے برائی سے روکنا نہی کرنے والے کو کسی بڑے نقصان سے دوچار کر دے، اور مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ اسکے ساتھ شرکت اور ہمکاری کی جائے، تو اِس صورت میں اسکے ساتھ شرکت میں کوئی حرج نہیں۔

اہلِ کتاب کے ساتھ تعلقات

سوال: کیا اسلام کی طرف دعوت کے مقصد کے بغیر اہلِ کتاب کے ساتھ تعلقات کے قیام میں کوئی شرعی مضائقہ ہے؟

جواب: ایسے تعلقات برقرار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ خداوندِ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: لَا یَنۡھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡھُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡھِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ (وہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نیکی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا ہے، جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں وطن سے نہیں نکالا ہے کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ سورۂ ممتحنہ ۶۰۔ آیت ۸)

تنظیموں سے ربط و تعلق

سوال: میں ایک سیاسی تحریک سے وابستہ ہوں اور اِس میں انحرافات کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں خود خلافِ شرع راستے پر نہ نکل جاؤں۔ اس سلسلے میں آپ مجھے کیا نصیحت فرمائیں گے؟

جواب: جب انسان کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہو، تو اِس پر اُس کی طرف سے فراہم کردہ لائحۂ عمل کی بجا آوری، اسکے موقف کی پابندی اور اسے درپیش چیلنجز کے مقابل دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ اسکا ساتھ دینا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس پر لازم ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت میں شمولیت سے پہلے ایک حد تک اِس بات کا اطمینان حاصل کرے کہ وہ سیاسی جماعت اصولِ شرع سے کس قدر ہم آہنگ ہے، تاکہ اسے یہ پتا چل جائے کہ وہ اس سے وابستہ ہو کر احکامِ الٰہی کی پابندی کو ملحوظ رکھ سکے گا یا نہیں۔

نیز اگر اِسے اِس جماعت میں کوئی انحراف نظر آئے، تو اُسے چاہئے کہ اِس پر تنقید کا

فریضہ انجام دے اور اِس انحراف کی اصلاح کیلئے ہر ذریعہ بروئے کار لائے۔ لیکن اگر بالفرض اِس میں تنقید اور اصلاح کی صلاحیت نہ ہو' تو واضح بات ہے کہ ارتکابِ حرام اور ترکِ واجب جائز نہیں۔ لیکن اِس جماعت کی رکنیت اختیار کئے رہنا اور اِس سے تعاون جاری رکھنا (یا رکنیت ترک کرنا اور تعاون سے دستبردار ہو جانا) اُن مثبت یا منفی نتائج کے تابع ہے' جو اس جماعت کی سرگرمیوں سے عمومی سطح پر مرتب ہوتے ہیں۔ اگر اِس جماعت میں خامیوں اور انحرافات کے باوجود اِس کے ساتھ اِس شخص کا وابستہ رہنا اسلام کے ارفع مقاصد کی خدمت ہو' تو اِس رابطے کو برقرار رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ وہاں صرف حق تلفیوں کا تماش بین بن کر رہتا ہے' اور کسی عظیم اسلامی مقصد کو جامۂ عمل پہنانے سے قاصر رہتا ہے' تو اسے چاہیے کہ اس جماعت سے تعلق ختم کر لے۔

سوال: کسی تحریک یا جماعت میں اصلاحی اقدامات کیلئے بعض اوقات کچھ تنظیمی قوانین کو توڑنا لازم ہو جاتا ہے' کیا اِس عمل میں کوئی شرعی قباحت ہے؟

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ انسان اس جماعت سے وابستگی کے وقت جس سطح کی ذمے داری کا حلف اٹھاتا ہے' اس میں فرق کے تناسب سے اس عمل کے مختلف احکام ہیں۔

دوسرے یہ کہ تحریک کے عمومی نظام میں واقع ہونے والے خلل اور اصلاحی عمل کے نتیجے میں مثبت اور منفی اثرات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ پھر جس طرف بھی اہم نتائج اور زیادہ مصلحت نظر آئے انسان وہ راستہ اختیار کر سکتا ہے۔

اصلاح کے خواہشمند شخص پر لازم ہے کہ اگر اسے اس بارے میں درست علم و آگہی نہ ہو' تو اس سلسلے میں ماہرین فن سے مشورہ کرے۔

سوال: اِس شخص کا فریضہ کیا ہے' جو یہ دیکھ رہا ہو کہ تنظیم کی صفوں میں موقع پرست افراد داخل ہو کر اسکی قیادت پر قابض ہو گئے ہیں؟

جواب: اِس کیلئے لازم ہے کہ اِس مسئلے کا بغور جائزہ لے۔ کیونکہ تحریکِ اسلامی یا کسی بھی دوسری قسم کی اسلامی تنظیم اور گروہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہیں۔ بلکہ اسلام اور مسلمانوں کا سرمایہ ہیں۔ اگر کچھ لوگ جماعتی، تنظیمی اور اجتماعی سرگرمیوں کو اپنے ذاتی مفاد کیلئے استعمال کررہے ہوں، تو ہم پر لازم ہے کہ خود تحریک کے اندر سرگرمیوں کے ذریعے اور مختلف ذرائع استعمال کر کے انہیں اِس عمل سے باز رکھیں اور تحریک کو نقصان سے بچاتے ہوئے مسئلے کو حل کریں۔ لہٰذا ایک ایسا شخص جو ایسی کسی تنظیم یا تحریک سے وابستہ ہو اُسے اس کے اندر موجود بعض مشکلات کی وجہ سے اس سے کنارہ کش نہیں ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ مخلص افراد کے ساتھ مل کر اِس مشکل کے حل کیلئے کوشش کرے۔

لیکن اگر موقع پرست افراد اپنا طرزِ عمل جاری رکھیں، اور تنظیم یا تحریک پر قبضہ جمالیں اور اسے اپنی ذاتی ملکیت بنا ڈالیں اور اس کا اسلام و مسلمین سے کوئی واسطہ نہ رہے، اور مستقبل میں بھی اسکے سدھار کی کوئی امید نظر نہ آرہی ہو، تو ظاہر سی بات ہے کہ مومن اور دیندار شخص کو ایسی تنظیم یا تحریک سے علیحدگی اختیار کرلینی چاہیئے۔ کیونکہ اب یہ کوئی اسلامی ادارہ نہیں رہی ہے، بلکہ ایک انفرادی اور شخصی ادارہ بن کے رہ گئی ہے۔ البتہ اس مسئلے کا گہری توجہ کے ساتھ جائزہ لینا چاہیئے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی نفسیاتی پیچیدگی (complex) انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ وہ یہ کام اسلام کیلئے کر رہا ہے جبکہ درحقیقت وہ ذاتی یا نفسیاتی عوامل کے تابع ہو کر یہ عمل انجام دے رہا ہوتا ہے۔

اگر مستقبل میں صورتحال کی تبدیلی کی امید ہو، تو تعاون اور سرگرمیوں کو غیر معینہ مدت تک روکے رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ تبدیلی کیلئے بہتر حالات وجود میں آجائیں۔

سوال: معاشرے میں کسی اسلامی تحریک یا تنظیم کے اثر ونفوذ میں اضافے کیلئے اس میں کام کرنا اور اسکی اعانت کرنا کیا صرف خداوند عالم کی اطاعت اور فقط اس کا تقرب چاہنے کے اصول کے منافی ہے؟

جواب: اگر اس اسلامی تحریک یا تنظیم کے اثر ونفوذ میں اضافہ' اسے اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اسلامی مقاصد کو جامۂ عمل پہنائے اور مثبت اقدامات کرے' تو ایسی تنظیم کی مدد تقربِ الٰہی کا ایک ذریعہ ہے۔

انسان کو خدا سے قریب کرنے والے عمل سے مراد وہ عمل ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ خدا سے تعلق واتصال رکھتا ہو۔ اگر انسان کسی مفید اسلامی ادارے یا تنظیم سے وابستہ ہو اور وہ ادارہ یا تنظیم بہترین صورت میں سودمند اسلامی مقاصد کیلئے کوشاں ہو اور انہیں جامۂ عمل پہنائے' تو ایسی تحریک یا تنظیم کے اثر ونفوذ میں اضافے کیلئے کام کرنا' درحقیقت ان عظیم مقاصد کیلئے جدوجہد کے مترادف ہے' جنہیں خدا کی رضا اور تائید حاصل ہے اور یہ عمل خدا کے تقرب کا باعث ہے۔

سوال: اس نکتۂ نظر کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے جو جماعتی رجحانات کو معاشرے میں انتشار اور اسکی تقسیم کا باعث قرار دیتا ہے؟

جواب: درحقیقت جماعتی رجحانات اور تنظیمی وابستگیاں تفرقے کا سبب نہیں' بلکہ انتشار و افتراق کا باعث بننے والی چیز تعصب ہے۔ مذکورہ نکتۂ نظر رکھنے والے لوگوں نے متعصب جماعتوں کو مدنظر رکھ کر یہ نظریہ اختیار کیا ہے۔ ہماری نظر میں جماعتی تعصب اور شخصی تعصب میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد لوگوں کو اپنی ذات کیلئے تعصب رکھنے کی دعوت دیتے ہیں لیکن عین اسی وقت کسی تنظیم کیلئے ان کے تعصب کو غلط قرار دیتے ہیں۔ واضح بات ہے کہ کسی شخص کیلئے لوگوں کا تعصب رکھنا بالآخر اس شخص کی پرستش پر منتہی ہوتا ہے' بالخصوص جبکہ ایسا شخص اسلامی معاشرے اور اسلامی مسائل کے بارے میں کسی کردار کا مالک نہ ہو۔

لہٰذا پارٹی بازی اور تعصب کو مسترد کرنے کے درمیان فرق ہے' خواہ تعصب جماعتی ہو' گروہی ہو یا شخصی۔

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عالمِ دین کو کسی تنظیم یا جماعت سے وابستہ' یا اس کا رکن نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس صورت میں اسکے کام جماعت کیلئے ہوں گے اللہ کیلئے نہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: (اس سوال کا جواب جاننے کیلئے) ضروری ہے کہ ہم تنظیمی ہونے کے معنی سمجھیں۔ تنظیمی یا تحریکی رجحان کا مطلب بلند اسلامی مقاصد کو جامۂ عمل پہنانے کی توانائی فراہم کرنے والے ذرائع و وسائل کے بارے میں ایک نکتۂ نظر کا حامل ہونا ہے۔ تنظیمی یا تحریکی رجحان کے معنی یہ ہیں کہ انسان اُن وسائل و ذرائع کے بارے میں سوچ رکھتا ہے جو (اُسکے اسلامی رجحان کی صورت میں) بلند اسلامی مقاصد کو جامۂ عمل پہنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں' اور جو انسان کو بلند اسلامی مقاصد کے حصول سے نزدیک کرتے ہیں۔

لہٰذا کسی عالمِ دین کو ایسی تحریک کے ساتھ تعاون اور ہمکاری سے روکنا ایک غیر فطری امر ہے جو مختلف ذرائع و وسائل اختیار کرتے ہوئے عظیم اسلامی مقاصد کے حصول کیلئے کوشاں ہو' جبکہ دوسرے ایسے وسائل موجود نہ ہوں' راہیں مسدود ہوں' جن کے ذریعے اسلامی مقاصد کو جامۂ عمل پہنایا جاسکے۔

لیکن قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جب کوئی عالمِ دین کسی ایسے ادارے کی بنیاد رکھے یا (پہلے سے قائم شدہ) کسی تنظیم یا تحریک سے وابستگی کا خواہشمند ہو' تو اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو اِس جماعت کے دائرے میں مقید نہ کرے۔ بلکہ اس جماعت یا تنظیم سے وابستگی کے ساتھ ساتھ پوری امت کیلئے بھی اپنے بازو کھلے رکھے۔ یعنی اسکا ذہن' اسکا دل اور اسکا کردار پوری امت کیلئے ہو۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا' تعصب کی بنیاد پر ایک محدود دائرے اور تنگ فضا میں اپنے آپ کو بند کر لینا' یعنی خود کو دوسروں سے جدا اور علیحدہ کر لینا اور کسی ایسی تحریک سے وابستہ ہونا جو معاشرے میں اخلاقِ حسنہ کی ترویج کے ساتھ امت کی خدمت کیلئے کمربستہ ہو' دو بالکل مختلف باتیں ہیں۔

اگر ہم اسلام کے مقاصدِ عالیہ کیلئے کسی انسان کے کسی خاص تحریک سے وابستہ

ہونے کی مخالفت کریں، تو اس صورت میں ہمیں ہر اجتماعی و سیاسی انجمن، مرکز اور تنظیم سے وابستگی کو غلط قرار دینا پڑے گا۔

لہٰذا اگر کوئی تحریک، جماعت یا تنظیم خدا کی رضا و خوشنودی کیلیئے اسلام کی راہ پر گامزن ہو، تو بعض اوقات اسکے ساتھ وابستگی نہ صرف جائز، مستحب بلکہ واجب ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم سوال میں بیان شدہ اصول کو قبول کرلیں تو پھر تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ کسی بھی مخلوط معاشرے میں اسلام پرستی غلط ہے اور ایسے سماج میں کسی کو اپنے اسلام کا علانیہ اظہار نہیں کرنا چاہیئے اور اسی طرح کسی عیسائی کو بھی اپنے عیسائی ہونے کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اِن کا اِس طرح مسلمان اور عیسائی کی صورت میں ایک دوسرے سے جدا جدا ہو جانا مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کردے گا اور اِس کے اندر تعصب میں اضافے کا باعث ہوگا۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ادعا درست نہیں ہے۔

کسی کے ساتھ وابستگی اور اسکی جانب قلبی رجحان ایک عام انسانی کیفیت ہے۔ اور انسانوں کے درمیان پائے جانے والے رجحانات و میلانات کا فرق جن کا سرچشمہ ان کے عقائد و افکار ہوتے ہیں، ایک فطری بات ہے اور اسکا معاملہ کسی تنظیم یا فرد کے بارے میں تعصب اور دوسروں سے دشمنی و عداوت سے جدا ہے۔

سوال: کچھ لوگ عالمِ دین کی کسی جماعت سے وابستگی کے حرام ہونے کی دلیل کے طور پر شہید محمد باقر الصدرؒ کا ایک فتویٰ پیش کرتے ہیں، جو انہوں نے ستّر کے عشرے میں دیا تھا۔ اس کی وضاحت میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ہمیں اِس فتوے کا علم ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اِس میں شہید صدرؒ نے جماعتی وابستگی کو حرام قرار نہیں دیا ہے، بلکہ ایک عالمِ دین کو درپیش سیاسی اور معروضی حالات کے پیشِ نظر، اِس پر اپنی جماعتی وابستگی کو اِس انداز سے ظاہر کرنا حرام قرار دیا ہے جو اِسے معاشرے کے سامنے ایک مخصوص دائرے میں مقیّد کردے اور نتیجے کے طور پر وہ (حتیٰ اپنی جماعت کیلیئے

بھی) کوئی خدمت سرانجام نہ دے سکے۔

ہمارے خیال میں اِس حکم میں شہید صدرؒ کے پیش نظر فنی پہلو رہا ہے، حکمتِ عملی کا پہلو نہیں رہا اور اسکا سبب بھی اُس زمانے کے خاص سیاسی حالات تھے۔ کیونکہ ایک انسان کو کسی ایسی سیاسی تحریک کے ساتھ فکری اور عملی وابستگی سے نہیں روکا جاسکتا جس پر اسے اطمینان و اعتقاد ہو۔ لیکن ساتھ ہی ایک عالمِ دین کیلئے مناسب ہے کہ وہ ایسی جماعتی دھڑے بندیوں کا اسیر نہ ہو جائے جن میں لوگ اپنی جماعتی وابستگیوں کی وجہ سے پہچانے اور تقسیم کئے جاتے ہیں اور اِنہی وابستگیوں کی بنیاد پر موقف اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسی وابستگی اور اِسکا اظہار بعض اوقات عالمِ دین اور عوام الناس کے باہمی تعلق کو ختم کردیتا ہے اور اِسکے وسیع کردار اور مقام کو نقصان پہنچاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اِس مسئلے میں حکم کا تعین مثبت اور منفی نتائج اور معروضی حالات و شرائط کے تابع ہے۔

سوال: آپ کی رائے میں شرعی لحاظ سے اسلامی تحریک کی سرگرمیوں کی حدود اور ابعاد کیا ہیں؟

جواب: ظاہر ہے کہ ہر اسلامی تنظیم کیلئے لازم ہے کہ وہ پوری امت کیلئے منصوبے تیار کرے۔ اسے چاہئے کہ اپنے منصوبوں میں تمام افرادِ ملت کو مدِ نظر رکھے، چاہے وہ افراد ہوں جو اسکے ہمراہ ہیں، چاہے وہ افراد ہوں جو اسکے ساتھ نہیں اور چاہے وہ افراد ہوں جو اسکے پروگراموں کو پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ہر قسم کی اسلامی سرگرمیوں کا امت سے متعلق ہونا ضروری ہے۔ تحریک کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو امت کے بارے میں ذمے دار سمجھے۔ اسے چاہئے کہ اپنے حامیوں کے ساتھ قریبی تعلق قائم رکھے اور اپنے مخالفین کے ساتھ بھی محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اِن کے اختلافِ رائے کو برداشت کرے۔

اسلامی تنظیموں کو جماعتی وابستگی کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان امتیاز نہیں قائم کرنا چاہئے، اور جماعتی وابستگی کو اسلام پسندی سے مشروط نہیں کرنا چاہئے، اور ایک کو سچا مسلمان

اور دوسرے کو نام کا مسلمان نہیں کہنا چاہئے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے لوگوں کو اِس صورت میں بھی مسلمان تسلیم کیا ہے جب وہ یقین واعتقاد کے ساتھ نہیں بلکہ خوف یا لالچ کی وجہ سے اسلام لائے تھے۔ فرمانِ الٰہی ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (یہ بادہ نشین عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں، کہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۴)۔

اس آیت سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ اسلام تمام انسانوں کو اپنی آغوش میں لے لینا چاہتا ہے اور اِس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کفر سے دور رہیں، خواہ وہ صرف بظاہر ہی اسلام سے وابستہ ہوں۔ لہٰذا تنظیم اور جماعت پر لازم ہے کہ وہ پوری امت کو مدِ نظر رکھے، نہ کہ ایک محدود اور تنگ دائرہ اسکے پیش نظر ہو۔

اِس بنیاد پر اسلامی جماعت یا تنظیم کیلئے ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں میں سے کسی ایسے فریق کے خلاف تعصب کا مظاہرہ کرے جو اِس کے ساتھ نہ ہو، البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ اِس فریق کے ساتھ بحث ومباحثہ کرے اور امت کی وحدت اور سلامتی کو نقصان پہنچائے بغیر اِسکے ساتھ علمی اور سیاسی میدان میں مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ہم اِس نکتے کی جانب اشارہ ضروری سمجھتے ہیں کہ استکبار کے منصوبوں کا ایک اہم رکن جس پر وہ اسلامی ممالک میں عمل پیرا ہیں، یہ ہے کہ فعال اور متحرک مسلمانوں کو سیاسی سرگرمیوں سے دور کیا جائے۔ لہٰذا وہ انہیں اسلامی جماعت یا اسلامی تحریک کے قیام کی اجازت نہیں دیتے۔ اور اسکی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اسلامی جماعت یا تحریک امتِ اسلامیہ کے درمیان تفرقے اور تقسیم کا سبب بنے گی۔ کیونکہ وہ اپنے طرفداروں کو مسلمان اور دوسروں کو غیر مسلم سمجھتی ہے۔ جبکہ ہم پہلے بھی اس ادعا کا جواب دے چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ اسلامی جماعت کی تشکیل کے معنی یہ نہیں ہیں اُسی طرح جیسے کسی قومی جماعت کی

تشکیل کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اِس میں شامل نہ ہونے والے لوگوں کا قوم سے کوئی تعلق نہیں۔

ان کی بہانہ تراشیوں سے قطع نظر اسلامی جماعتوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی جماعت کے مقاصد کے حصول کیلئے جس فکری مواد اور عملی کردار کا انتخاب کرتے ہیں، اس کے ذریعے استکباری عناصر کو کوئی بہانہ فراہم نہ ہونے دیں۔

ہم اسلامی جماعت کو ایک ایسی تحریک سمجھتے ہیں جو لوگوں کو اس منظّم پروگرام کے تحت اسلام کی دعوت دیتی ہے جسے اس مقصد کیلئے پیغمبر اسلامؐ نے ترتیب دیا تھا، جس میں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے افراد کے دلوں میں مضبوطی کے ساتھ اسلام کو بٹھانا بھی شامل تھا اور قبولیتِ اسلام کیلئے دوسروں کو آمادہ کرنے کی غرض سے اُن کے سامنے نئے افق کھولنا بھی دعوتی کاموں کا حصہ تھا۔ اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی سطح پر آنحضرتؐ نے غیر اسلامی ماحول کو اسلامی ماحول میں تبدیل کیا۔ لہٰذا اسلامی جماعت کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں میں پورے اسلامی معاشرے کو مدِنظر رکھے اور ہر اُس میدان تک اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرے جس میں اسلام دخل رکھتا ہے۔

اِس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ اسلامی جماعت امت کے اذہان میں اسلامی فکر کے فروغ کیلئے کام کرے، تاکہ اِس طرح عقیدے و شریعت اور سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی مفاہیم کے بارے میں اسلامی فکر کی بنیاد پر امت کی تربیت کر سکے اور نتیجتاً ایک ایسا اسلامی معاشرہ یا اسلامی امت وجود میں آئے جس کی فکری اور عملی بنیادیں اسلام پر استوار ہوں۔

اسی طرح اسلامی جماعت کے اہم فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کیلئے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور امن وسلامتی کے میدانوں میں منصوبہ بندی کرے۔ یعنی اسلامی دعوت کا نچوڑ فکری اور عملی لحاظ سے اسلامی جماعت کی تمام سرگرمیوں میں دکھائی دے۔ اور اسے چاہیے کہ امت میں موجود تمام قوتوں اور توانائیوں سے استفادہ کرے اور وہ مختلف رکاوٹیں اور مشکلات جو اُسے اسکے مقصد و ہدف کے حصول

سے دور کرتی ہوں' چاہے ان کا تعلق دینی میدان سے ہو' چاہے رسوم و رواج کے میدان سے اور اسی طرح کے دوسرے میدانوں سے' اُن سے مقابلے کے دوران کہیں سختی اور کہیں نرمی و لچک کا مظاہرہ کرے۔

ہماری نظر میں اسلامی جماعت کا کردار تمام مسلمانوں اور تمام انسانوں کیلئے داعیٔ الیٰ اللہ کا کردار ہے' جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی زبانی کہا ہے کہ: قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول اور نمائندہ ہوں۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۸)

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایک ایسی جماعت جو کسی ایسے معاشرے میں حکومت کی ذمے داریاں سنبھالنے کی خواہشمند ہو جہاں کئی مذاہب' یا کئی گروہ بستے ہیں اسکے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی ایک مذہب یا کسی ایک گروہ کے مفاد کیلئے کام کرے' بلکہ اُسے ایک قومی جماعت ہونا چاہئے' جس کے مقاصد اور سرگرمیوں کا دائرہ پوری قوم پر محیط ہو نہ کہ کوئی ایک خاص طبقہ اسکے پیش نظر ہو۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: میں ایک بالکل سادہ دلیل کی بنیاد پر اِس نکتۂ نظر سے متفق نہیں ہوں۔ اور وہ دلیل یہ ہے کہ جماعتی انداز سے کام (حتیٰ جمہوری طریقۂ کار کی بنیاد پر بھی) کا تقاضا ہے کہ افرادِ معاشرہ کے ہر گروہ کو اپنے فکری اصولوں اور سیاسی پروگرام کی بنیاد پر سیاسی سرگرمیوں کا حق حاصل ہو اور وہ دوسروں کو اپنا نظریہ اپنانے کی دعوت دے سکے۔

انسانی تمدن کے ارتقا کیلئے ضروری ہے کہ مختلف افکار و نظریات رکھنے والے لوگ' اپنے پورے خلوص کے ساتھ گفتگو اور باہمی تبادلۂ خیالات کے ذریعے اس تنوع و اختلاف کو وحدت میں بدلنے کی کوششیں کریں۔ لہٰذا جو لوگ اس انداز سے (جس کا سوال میں تذکرہ ہوا) سوچتے ہیں' وہ ہمیں اسی صورتحال میں باقی رکھنا چاہتے ہیں' اور ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم اسی مسلکی اور گروہی جمود کا شکار رہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ اندازِ فکر درست ہو، تو ہم انبیاؑ سے بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ آپ کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے، آپ کو چاہئے کہ انہیں دعوت نہ دیں، اور ایک مخلوط معاشرے میں تبلیغ کا کام نہ کریں۔ کیونکہ آپ اِس عمل کے ذریعے معاشرے کو اپنی سوچ کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں اور آپ کا یہ عمل معاشرے کو مشکلات کا شکار کردے گا۔ اسی طرح ہمیں مارکسزم، نیشنلزم اور اسی طرح کسی بھی دوسری فکر کے حامل افراد (جو عوام کی غالب اکثریت سے مختلف طرزِ فکر رکھتے ہیں) سے کہنا چاہئے کہ آپ کو ان لوگوں سے مخاطب ہونے کا کوئی حق نہیں جو آپ کے نظریے پر عقیدہ نہیں رکھتے، یا آپ سے مختلف نظریات کے حامل ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام کسی مہذب انسان سے بعید ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آپ کی سرگرمیاں اسلام کے دائرے میں محدود ہوتی ہیں۔ یعنی آپ پورے ملک کی سطح پر سرگرمِ عمل نہیں ہوتے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم تمام انسانوں کو اپنے پیشِ نظر رکھیں اور مسلمانوں کو اسلام کی راہ میں کام کرنے پر آمادہ کریں، تاکہ وہ اِس سلسلے میں تعاون کریں، اِس جدوجہد سے وابستہ ہوں اور غیر مسلموں کے ساتھ گفت وشنید اور مسائل و مشکلات میں ان کی مدد و اعانت کے ذریعے ان کی خدمت کریں۔ مثلاً جب ہم کسی ایسے معاشرے میں مصروفِ عمل ہوں جس میں عیسائی اور یہودی بھی رہتے ہوں، تو ہمارا مقصد تمام انسانوں کی خدمت ہو۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اسلام نے صرف ان اہلِ ذمہ ہی سے نہیں جو خود کو اہلِ ذمہ قرار دیتے ہیں بلکہ عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی معاہدوں کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

لہٰذا حکومتِ اسلامی یا اسلامی جماعت جس طرح مسلمانوں کے معاملات و مسائل کا اہتمام کرتی ہے، اسی طرح غیر مسلموں کے معاملات و مسائل سے بھی لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ بالخصوص جبکہ ایک مملکت کے اقتصادی مسائل ناقابلِ تقسیم ہیں اور معاشرے میں امن و امان اور سماجی توازن کو افرادِ معاشرہ کیلئے علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر ایک وطن کی صورت میں وہاں بسنے والے غیر مسلموں کے اقتصاد اور سلامتی کا توازن بگڑے گا، تو یقیناً

مسلمان بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ لہٰذا ہم مسلمان، دوسروں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور ہماری تحریک کی بنیاد اسلام ہونے کے باوجود ہم انسانیت کی خدمت کے اصول پر کام کرتے ہیں۔

ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے آپ کو ظلم کے خلاف جدوجہد کا پابند سمجھتے ہیں، چاہے یہ ظلم و ستم غیر مسلموں ہی پر کیوں نہ کیا جا رہا ہو۔ ہم غیر مسلم مظلوموں کے حق میں ظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ کیونکہ خداوندِ عالم اِس بات کو پسند کرتا ہے کہ ہم تمام انسانوں کیلئے عدالت طلبی کی بنیاد پر جدوجہد کریں، اور تمام انسانوں کے خیر خواہ کے طور پر کام کریں۔ یہ ایک بے بنیاد خیال ہے کہ اسلامی تحریک، جماعت یا دعوت غیر مسلموں پر کوئی توجہ نہیں دیتی اور صرف مسلمانوں کے دائرے میں سوچتی اور صرف انہی کیلئے عمل کرتی ہے۔ حقیقت اِس سے مختلف ہے۔

جب ہم گزشتہ ادوار کے ممالکِ اسلامیہ کے تجربے پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو ان کے بہت سے معاملات پر تحفظات رکھنے کے باوجود، ہمیں نظر آتا ہے کہ ان حکومتوں نے بھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سے یکساں طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جس طرح مسلمانوں کے بارے میں تاکید فرمائی اسی طرح اہلِ ذمہ و اہلِ پیمان کے بارے میں بھی تاکید کی ہے۔ دورِ حاضر میں بھی ہم ایران کی اسلامی مملکت میں دیکھتے ہیں کہ وہاں حکومت مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کا لحاظ رکھتی ہے، اور وہاں غیر مسلم آبادی کے تناسب کے مطابق ان کے حقوق ادا کرتی ہے۔

سوال: یہ افکار مسلمانوں اور غیر مسلموں، کسی کو بھی اپنے نظریے کی طرف دعوت دینے میں رکاوٹ نہیں۔ لیکن حاکم (چاہے وہ خود ایک جماعت ہو، یا ایک متحدہ محاذ سے تعلق رکھتا ہو) پر لازم ہے کہ وہ سب ہی کیلئے اپنے افکار و نظریات کی طرف دعوت دینے اور آزادانہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی فضا فراہم کرے۔

جواب: اِس مسئلے میں کسی نظریے کی پابند اور غیر پابند تحریکوں کے درمیان فرق ہے۔ غیر نظریاتی تحریکیں سیاسی میدان میں جمہور کی روش کی بنیاد پر عمل کرتی ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی نظریہ دوسرے نظریے سے برتر نہیں، صرف وہی چیز قانونی حیثیت کی مالک ہوتی ہے جس پر لوگوں کا اتفاق ہو۔ یہی جمہوریت کا تقاضا ہے۔ جبکہ اسلام اور مارکسزم وغیرہ کی مانند نظریات کی پابند تحریکوں کا مسئلہ جدا ہے۔ ہمارے خیال میں اسلام کو (بالخصوص موجودہ صورتحال میں) طاقت کے ذریعے پھیلایا اور نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چند گزشتہ ادوار میں بعض ممالک میں اسے یہ قدرت حاصل تھی۔ لیکن آج (تصوراتی طور پر نہیں بلکہ) حقیقی لحاظ سے ایسا ممکن نہیں رہا۔

اس بنیاد پر ہمارا کہنا ہے کہ جب ہم (مثلاً لبنان جیسے) ایک مخلوط معاشرے میں رہ رہے ہوں، تو ہمیں اسلام کی طرف دعوت دینے کا حق حاصل ہے۔ البتہ ہم خدائی فوجدار نہیں ہیں۔ ہم وہ تمام ذرائع اختیار کریں گے جو لوگوں کو ہماری تائید پر آمادہ کریں۔ یعنی یا تو وہ ہماری فکر کو قبول کریں اور مسلمان ہو جائیں یا صرف سیاسی روش میں ہمارے ہمنوا بن جائیں اور اگر ہمیں اپنا نمائندہ قرار دینے کا امکان نہ پائیں، تو کم از کم ہمیں دوسروں سے بہتر سمجھیں۔ ایسے حالات میں لوگ قدرتی طور پر ہمارے گرد جمع ہوں گے۔

اگرچہ ہمیں جمہوری طریقۂ کار اور اسکے فکری اصولوں کے بارے میں کچھ اعتراضات ہیں لیکن یہ بہت سی جگہوں پر ایک حقیقت کے طور پر سامنا آیا ہے، جیسے ایران میں، جو ایک اسلامی مملکت ہے۔

لہٰذا اسلام کی حاکمیت، جو لوگوں کا عقیدہ اور مطالبہ ہے، اسکے معنی دوسروں کی ضد، اُن کی نفی اور اُن کا انکار نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام نے اپنے معاشرے میں موجود دوسرے افراد کے ساتھ جن تعلقات کی تعلیم دی ہے، اُن کے مطابق ابتدا ہی سے، حتیٰ اب بھی مسلمان دوسرے ادیان ونظریات کے ماننے والوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔

اسلام نے اجتماعی نظم کے دائرے میں مختلف اقوام، قبائل اور برادریوں کے حقوق کی

ادائیگی کے حوالے سے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اسلام نے مملکتِ اسلامی کی حدود میں زندگی بسر کرنے والے ترکوں، کردوں اور ایرانیوں کو اپنی اپنی زبانیں بولنے اور ان رسوم و رواج پر عمل کی آزادی دی جو اسلامی اصول و قوانین کی روح کے منافی نہ ہوں۔ مملکتِ اسلامی میں زندگی بسر کرنے والی اقوام کو نسلی یا مذہبی امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ عرب ہونے کی صورت میں بھی حاکم کو اپنی عربیت کی وجہ سے دوسروں پر تسلط کا کوئی حق نہیں۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے چاہتا ہے کہ ہم مختلف اقوام و قبائل کا وجود تسلیم کریں: وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (اور پھر تم میں خاندان اور قبیلے قرار دیئے ہیں، تا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے خدا کے نزدیک محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۳)

اسلام نے قومی اور خاندانی خصوصیات کی نفی نہیں کی ہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ ان خصوصیات کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان فاصلے پیدا ہوں۔ بلکہ اسکی کوشش یہ ہے کہ یہ خصوصیات انسانی معاشرے میں ایک دوسرے کی پہچان اور شناخت کا ذریعہ رہیں اور ہر ایک اپنی خصوصیات اور تجربات ایک دوسرے کے سامنے پیش کرے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے کو قومی، خاندانی، قبیلائی اور نسلی تنوع و رنگارنگی کے اعتبار سے کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس بنیاد پر ہمارا خیال ہے کہ اگر مختلف گروہ تعصب آمیز اصول و نظریات پر کاربند نہ ہوں تو کوئی مشکل اور مسئلہ نہیں۔

اگر مسلمان کسی معاشرے میں اکثریت میں نہ ہوں اور وہاں اُن کی تعداد دوسروں کے مساوی بھی نہ ہو تو ان کیلئے حکومت کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن یہ صورتحال انہیں دوسروں کو اسلام کی طرف دعوت دینے سے نہیں روکتی۔ مسئلہ وہاں کھڑا ہوتا ہے جہاں آپ دوسروں کو مجبور کرنا چاہیں اور ان پر کوئی ایسی چیز مسلط کرنا چاہیں جسے وہ پسند نہیں کرتے۔

لیکن اگر آپ مہذبانہ طریقہ اختیار کریں اور گفتگو اور بحث و مباحثے کے ذریعے دوسروں کے سامنے اپنی فکر پیش کریں، یا عامتہ الناس کی خدمت کی غرض سے اس سوچ کے

ساتھ کسی تحریک کی بنیاد رکھیں کہ اگر لوگ اسے قبول کریں تو فبہا، بہت اچھے اور اگر نہ مانیں تو ہم انہیں مجبور نہیں کریں گے، تو ایسی صورت میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

مثلاً ہم لبنان جیسے ملک میں مسلمانوں اور عیسائیوں کو مخاطب کر کے اسلام کو فکر، جذبات اور زندگی کے اصول کے عنوان سے اس انداز سے پیش کر سکتے ہیں جس میں ثقافتی، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی شعبے شامل ہوں۔ البتہ بہت سے مسلمان یہاں اس فکر کو برداشت نہیں کرتے۔

اس بنیاد پر ہم اسلام پرستوں کو چاہئے کہ ایک ایسی فکر کے داعی کے طور پر کام کریں جو تمام انسانوں کیلئے ہو اور پورے ملک کیلئے عظیم مقاصد کا تعین کر کے اُن کے حصول کیلئے سرگرم عمل ہوں ورنہ ہم (خاص اسلامی دائرے میں) خود مسلمانوں کی بھی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے۔ جب تک عیسائیوں سے ہمارا رابطہ برقرار نہ ہو لبنان کی سلامتی اور اسکے اقتصادی اور اجتماعی مسائل کا حل ممکن نہیں۔ کیونکہ لبنان کا معاشرہ ایک بٹا ہوا معاشرہ نہیں، بلکہ باہم گھلا ملا، مخلوط معاشرہ ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایک مہذب انداز اختیار کئے بغیر فکرِ اسلامی کو ایک زندہ فکر کے عنوان سے پیش کیا جا سکے، وہی انداز جس کی تاکید اللہ رب العزت ان آیاتِ قرآنی میں کرتا ہے کہ: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دیں۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵) وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ صرف اچھی باتیں کیا کریں۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۵۳) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (تم برائی کا جواب بہترین طریقے سے دو کہ اس طرح جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ بھی ایسا ہو جائے گا جیسے گہرا دوست ہوتا ہے۔ سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۳۴) لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

اسی طرح اور بھی اسلامی تعلیمات تمدنی اور سیاسی میدانوں میں انسانوں کے سامنے اسلامی نظریات پیش کرنے کی تاکید کرتی ہیں، تاکہ وہ رضا و رغبت کے ساتھ ان کا انتخاب کریں، انہیں زبردستی ان پر ٹھونسنے کی تلقین نہیں کرتیں۔

سوال: اس بنیاد پر کیا آپ درست سمجھتے ہیں کہ اسلام پرستوں کو لبنان میں حکومتِ اسلامی کے قیام کا نعرہ بلند کرنا چاہیئے؟

جواب: ملکی، خطے کی اور عالمی سیاسی صورتحال کے پیش نظر، علاوہ ازایں لبنان کے داخلی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمارے خیال میں اس کا موقع نہیں۔ ہمارے خیال میں فی الحال لبنان میں اسلامی حکومت کے قیام کیلئے مناسب وقت نہیں ہے۔

سوال: اس صورتحال میں اسلام پسندوں کیلئے کونسا نعرہ بلند کرنا اور اسکی طرف دعوت دینا ممکن ہے؟

جواب: مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اسلام کو ایک ایسی دعوت کے عنوان سے پیش کریں جو معاصر انسان کے ذہن کو اپیل کرے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسلام کی حاکمیت کی دعوت دیں اور اس دعوت کو عصرِ حاضر کے انسان کے ذہن میں بٹھائیں۔ اسلام، گروہ پرست اور فرقہ پرست افراد کے طرزِ عمل کے برخلاف ایک گروہی اور فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں، بلکہ یہ ایک فکری اور شعوری تحریک ہے جس طرح عیسائیت بھی ایک فکری تحریک ہے۔ لہٰذا ہم عیسائیوں سے بھی کہتے ہیں کہ ہم اس ترقی یافتہ طریقے سے اسلام کو پیش کریں گے تاکہ اسے ایک گروہی دائرے سے باہر نکالا جاسکے، اور آپ عیسائی حضرات سے بھی چاہتے ہیں کہ آپ بھی عیسائیت کو اسی انداز سے پیش کریں، اور اسے ایک گروہی دائرے سے باہر لائیں۔ اس طرح ہم اسلامی اور عیسائی اقدار کو انبیاؑ کی لائی ہوئی اقدار کے عنوان سے نکتۂ اشتراک قرار دیں، اور ان میں پائے

جانے والے اختلافی نکات پر گفتگو اور بحث و مباحثہ کریں۔

اسی طرح ہمیں چاہئے کہ اسلام کو ایک حکومتی نظام کے طور پر پیش کریں (حکومت کرنے کے ایک وسیلے کے طور پر پیش کریں) ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ ہم پوری دنیا کو اسلامی بنانے کیلئے کوشاں ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے عیسائی حضرات دنیا کو عیسائی بنانے کیلئے، ہر فرقہ اپنے افکار و عقائد کی ترویج کیلئے اور امریکہ دنیا کو امریکی بنانے کیلئے کوششیں کر رہے ہیں اور یہ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔

لہٰذا آج کی متمدن دنیا میں کسی کا کسی کو دنیا کے سامنے اپنے افکار پیش کرنے سے روکنا ممکن نہیں۔ ہاں، یہ بات علیحدہ ہے کہ دنیا اسکی پیش کردہ فکر کو قبول کرے یا اسے مسترد کر دے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ آپ اپنی فکر کو مہذب طریقے سے، دوسرے انسانوں کی عقل و ذہنیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کے اعتقاد کا احترام کرتے ہوئے پیش کیجئے، اور اِس مقصد کیلئے گفتگو اور تبادلۂ خیالات کو اپنا ذریعہ بنایئے۔

لیکن اگر ہم محسوس کریں کہ اسلامی حکومت کا قیام ہمارے لئے ممکن نہیں، تو مسلمانوں اور عیسائیوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اسلام اور عیسائیت کی مشترکہ اقدار کے ساتھ زندگی بسر کریں، البتہ حریت و آزادی کی بنیاد پر: وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اور خدا کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو رب کا درجہ نہ دیں۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۶۴)، خدائے واحد پر ایمان کی بنیاد پر، لوگوں کے امور کا لحاظ رکھنے کی بنیاد پر اور تمام معاملات میں عدل و انصاف ملحوظ رکھنے کی بنیاد پر۔

بہت سے ایسے پہلو موجود ہیں جن سے استفادہ کر کے ہم مسلمانوں کو طاقتور بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور اغیار کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اور قوی ہونے کے باوجود دوسروں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

سوال: ایک مسلمان کے لئے، اسلامی جماعت میں سرگرمیوں (activities) کی کیا

حدود و قیود ہیں؟

جواب: واضح ہے کہ جو شخص کسی گروہ یا جماعت سے وابستہ ہونا چاہتا ہے اسکے لئے لازم ہے کہ سب سے پہلے وہ اِس (گروہ یا جماعت) کی اُن اقدار کے ساتھ وابستگی کی طرف سے اطمینان حاصل کرے جن پر وہ عقلی، شعوری اور دینی طور پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اگر وہ اِس تحریک کی عمومی روش کو اسلام سے ہم آہنگ پائے تو اس کے بعد اُسے اس بات کی پڑتال کرنی چاہئے کہ جو شخص یا ادارہ اس جماعت کی قیادت اور اسکے معاملات کا ذمے دار ہے اور اسکی تنظیم اور اسکی سمت کا تعین کرتا ہے، وہ بھی شرع کا پابند ہے یا نہیں؟ کیونکہ کسی تحریک کے مقاصد کا صحیح ہونا ہی کافی نہیں ہوتا' بلکہ جو شخص اس کی قیادت کر رہا ہے اُس کے معاملات کا نگراں اور منتظم ہے، اُسے بھی اِس تحریک کے پیش کردہ نظریات کا فکری اور عملی طور پر پابند ہونا چاہئے۔

اگر اِس جائزے اور پڑتال کا نتیجہ مثبت نکلے تو ظاہر ہے کہ اس تحریک سے وابستگی اختیار کی جاسکتی ہے اور اس کے عظیم مقاصد کو جامۂ عمل پہنانے کی خاطر کوئی ذمے داری سپرد کی جائے، تو اپنی قدرت و استطاعت کے مطابق اُسے ادا کیا جاسکتا ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ اس بات کا بغور جائزہ لیں کہ اسلامی سرگرمیوں کیلئے ہمیں کس قسم کی وابستگی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس بارے میں متعدد خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض مرجعیتِ اعلیٰ سے وابستگی کے خواہاں ہیں، بعض کسی جماعت سے اور بعض کچھ اور رائے رکھتے ہیں۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ عظیم اور بڑے مقاصد کا حصول اجتماعی جد و جہد ہی سے ممکن ہے انفرادی کوششوں سے نہیں۔ کیونکہ کوئی شخص کتنا ہی مضبوط اور باصلاحیت کیوں نہ ہو، حتیٰ وہ ایک صاحبِ اقتدار لیڈر ہی کیوں نہ ہو، وہ تن تنہا بڑے مقاصد کو جامۂ عمل نہیں پہنا سکتا۔ وہ بھی ان انسانوں کے ذریعے ان مقاصد کے حصول کی کوشش کرتا ہے جو ان مقاصد پر ایمان رکھتے اور اسکی پیروی کرتے

ہیں۔ لہٰذا ایک ایسا انسان جو صرف اپنی ذات کیلئے نہ جی رہا ہو بلکہ وہ جن مقاصد پر ایمان رکھتا ہے اور جن ذمے داریوں کی انجام دہی کا خواہاں ہے ان کا تعلق اسلام و مسلمانوں کی خدمت اور معاشرتی مسائل و مشکلات کے حل سے ہو، تو اسے ایک ایسی تحریک سے وابستہ ہونا چاہئے جو فعال تنظیمی قوت کی حامل ہو، اور جو قلیل یا طویل مدتی حکمتِ عملی کے تعین کیلئے بنیادی نتائج اخذ کرتے وقت ہدف کو موجودہ حالات و شرائط کے مطابق ترتیب دینے اور موقف کو مراحل کے مطابق تشکیل دینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

سوال: جماعت میں اس مرجعیت کا کردار کیا ہے جس سے وہ اپنی سرگرمیوں کیلئے سندِ جواز حاصل کرتی ہے؟

جواب: جماعتی مرجعیت کے موضوع کا شرعی اعتبار سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اگر فقہی مرجعیت کو دینی مرجعیت کی بنیاد سمجھا جائے، تو طبیعی بات ہے کہ کوئی بھی اپنے اعمال کو شرعی ضمانت دینے کیلئے اس مرجعیت سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو فقیہ کی ولایتِ عامہ کے معتقد ہیں، اُن کی نظر میں ایسی مرجعیت ولایتِ عامہ کی حامل ہے اور وہ لوگ جو ولایتِ فقیہ کو قبول نہیں کرتے، ان کی رائے میں ایسی مرجعیت ''ولایتِ فتویٰ'' (اگر یہ اصطلاح درست ہو تو) کی حامل ہے۔

لہٰذا جماعت کیلئے لازم ہے کہ اپنی عملی پالیسیوں میں خطِ ولایتِ فقیہ سے ہم آہنگ ہو۔ یا (اگر وہ ولایتِ فقیہ کے نظریے پر عقیدہ نہیں رکھتی) اُس نے جس فقیہ کو مرجع کے طور پر منتخب کیا ہے اسکے فتاویٰ کے مطابق عمل کرے۔ تاکہ عملی روش میں ہر مسئلے کے بارے میں اسکے پاس شرعی حجت موجود ہو۔

لیکن موجودہ فقہی مرجعیت کو اِس وقت مشکل یہ درپیش ہے کہ اسکی تشکیل اور اسکی سرگرمیوں کا تعین سیاسی اور فکری امور میں اسلامی تحریک کی تقویت اور توسیع کی بنیاد پر نہیں ہوا، اور اب بھی مرجعیت انفرادی صورت رکھتی ہے، وسیع اور ہمہ گیر منصوبہ بندی کی بنیاد پر

قائم نہیں، ایک ایک مسئلے کے بارے میں علیحدہ علیحدہ یا پھر درپیش صورتحال پر ردِ عمل کی صورت میں اپنے موقف اور طرزِ عمل کا تعین کرتی ہے۔اور یہ بات مرجعیتِ فقہی سے تحریک کے تعلق کو صرف فتوے کی حد تک محدود کردیتی ہے، ماسوا اسکے کہ جماعت کا رہنما خود تمام امور کے بارے میں صاحبِ فتویٰ اور صاحبِ نظر مجتہد ہو۔

اسی طرح مرجعیتِ ولایت (ولایتِ فقیہ) سے اسلامی تحریک کا تعلق اس مرحلے تک نہیں پہنچا ہے کہ مختلف اور متنوع ماحول کی بنیاد پڑے، جس میں وہ (خاص مواقع کے سوا) سیاسی، اجتماعی اور فکری وتربیتی میدانوں میں تحریک کے معاملات کی دیکھ بھال کرے۔ مختلف ومتنوع حالات وصورتحال (conditions) میں اس تعلق کا وسعت اختیار نہ کرنا اس بات کا سبب بنا ہے کہ جماعت وتحریک کے ساتھ مرجعیتِ فقہی کا ربط وتعلق نظری (theoretical) اور صرف فتوے کی حد تک رہا ہے اور اس سے معروضی حالات کیلئے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا، جبکہ اس سے عضوی اور عملی تعلق قائم ہونا چاہئے۔

لہٰذا ہمارا عقیدہ ہے کہ حزب اور جماعت کو اپنی سرگرمیوں کا جواز مرجعیتِ فقہی یا ولیِ فقیہ سے حاصل کرنا چاہئے اور اسکے پاس ایک قیادت یا فقیہ کی قیادت جیسی کوئی چیز ہونی چاہئے، جو نظری اور عملی سطح پر اسکی سرگرمیوں کو سیدھے راستے پر رکھے۔

مختصر یہ کہ اگر فقیہ اسلامی معاشرے میں اجرا ونفاذ کی قدرت رکھنے کا قائل نہ ہو اور فقط فتویٰ صادر کردینے کا معتقد ہو، تو اُسے جماعت یا تحریک پر کسی قسم کی قدرت اور بالا دستی حاصل نہیں ہوگی اور از روئے ولایت اسکے حکم کی پابندی لازم نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود ہی ولایتِ کلی کا قائل نہیں اور اسکا کام جماعت کے معاملات میں صرف وعظ ونصیحت، رہنمائی اور فتویٰ دینا ہے۔

لیکن جو فقیہ، نظریۂ ولایتِ فقیہ کی رو سے اسلامی معاشرے میں عملی اور اجرائی قدرت کا حامل ہو اور اسکے پاس ایسی مشنری اور نظام موجود ہو جس کے ذریعے وہ اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کا ساتھ دے سکے، تو طبیعی طور پر جماعتوں اور تنظیموں کا اسکے ساتھ ربط و

تعلق (نظریۂ ولایتِ فقیہ کی بنیاد پر) ایک شرعی اور اسلامی رہبر کا ان لوگوں کے ساتھ ربط و تعلق ہے جو اسلام کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور اس صورت میں اس رابطے کو اس انداز سے ترتیب دینا چاہئے کہ اہم مسائل میں خطِ ولایت اور تنظیمی یا جماعتی راہِ عمل آپس میں ہم آہنگ ہو۔

سوال: مذکورہ مسئلے میں حزب سے تعلق رکھنے والے ان مکلف افراد کیلئے کیا حکم ہے جو ولایتِ فقیہ کے قائل مجتہد کی تقلید کرتے ہیں، یا ایسے مجتہد کے مقلد ہیں جو نظریۂ ولایتِ فقیہ کا قائل نہیں ہے؟

جواب: ممکن ہے ان دونوں آراء کو باہم جمع کیا جا سکے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ ایک ایسا شخص جو ولایتِ فقیہ پر عقیدہ نہیں رکھتا، اسے چاہئے کہ ولیٔ فقیہ کی جانب سے صادر ہونے والے امور کا جائزہ لے۔ اگر یہ امور اسکے مرجع کی نظر میں حرام ہوں تو قدرتی بات ہے کہ اسے ان کی اتباع کا حق نہیں، ماسوا ان حالات کے جہاں عناوین ثانویہ اسے واجب یا جائز بنا دیں۔

لیکن اگر اسکے مرجع تقلید کی نظر میں یہ امور حرام نہ ہوں بلکہ جائز ہوں اور اسلامی مصالح و مفادات بھی اسکا تقاضا کرتے ہوں اور ولیٔ فقیہ کی رائے بھی اسکے موافق ہو، تو اُسے چاہئے کہ ولیٔ فقیہ کی اطاعت کے عنوان سے نہیں بلکہ عظیم اسلامی مصالح و مفاد کے تقاضوں کے تحت اس امر میں ولیٔ فقیہ کی اطاعت کرے۔

سوال: فدائی (خودکش) حملوں کے بارے میں شرعی موقف کیا ہے؟

جواب: فدائی حملے دشمن کے خلاف جہاد کا ایک ہتھیار ہیں۔ خداوندِ عالم نے مسلمانوں پر جہاد کو واجب قرار دیا ہے۔ اور جب جہاد کی شرعی شرائط موجود ہوں تو جہاد کیلئے اُن تمام وسائل و ذرائع کو استعمال کیا جانا چاہئے جو دشمن کو نقصان پہنچائیں اور جن سے اسلام کے مقاصد حاصل ہوں۔

کچھ لوگ فدائی حملوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے آیہ قرآن: لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۵) کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر وہ عمل جس میں انسان کو اپنی موت کا علم ہو فدائی (خودکش) حملہ ہے اور یہ اقدام اسلام میں حرام ہے۔ جبکہ اِس آیۂ کریمہ کی رو سے انفرادی اور ذاتی مسائل میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا حرام قرار دیا گیا ہے اِس میں جہاد شامل نہیں ہے۔ کیونکہ جہاد تو انسان اپنے آپ کو خطرات اور موت کے منہ میں ڈال کر ہی انجام دیتا ہے۔ لہٰذا یہاں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ انسان (جہاد کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے) اپنے آپ کو ہلاکت کا شکار کرلے چاہے اسے اس مقصد کے حصول کا یقین ہو یا یقین نہ ہو۔

جو مجاہدین دشمن کا سامنا کرتے ہیں وہ خود اپنے آپ کو خطرات میں ڈالتے ہیں اور بعض صورتوں میں یہ مجاہدین اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا جب جہاد کی نگرانی کرنے والا ولیٔ امر اِس بات کو محسوس کرے کہ ان حالات و شرائط میں فدائی (شہادت طلب) حملوں کی ضرورت ہے اور اِن کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہیں اور اسلام و مسلمین کی کامیابی اِس بات پر موقوف ہوگئی ہے کہ مجاہدین دشمن کے مجمع کے درمیان اپنے آپ کو بم سے اڑا لیں، تو یہ عمل جہاد کا عنوان اور شکل اختیار کرلیتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کیلئے کسی خاص ذریعے کا تعین نہیں کیا ہے، بلکہ ذرائع و وسائل کی تشخیص اس ولیٔ امر پر چھوڑی ہے جو جہاد کی رہنمائی کررہا ہے۔ ولیٔ امر کو چاہئے کہ جہاد کیلئے رائج طریقے اختیار کرے، اور اگر وہ دیکھے کہ مسلمانوں کی کامیابی یا انہیں نقصان سے محفوظ رکھنا کوئی غیر معروف طریقہ اختیار کرنے پر موقوف ہے، تو ضرورت کی صورت میں وہ طریقہ اختیار کرے۔

لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ وہی دلیل جو جہاد کو جواز بخشتی ہے وہی فدائی حملوں کو بھی جواز فراہم کرتی ہے۔ البتہ اِس صورت میں جبکہ عسکری صورتحال اِن کے مثبت نتائج کی نشاندہی کرے۔

سوال: فدائی حملوں (suicideattacks) کی ضرورت کی تشخیص کس کے ذمے ہے؟
جواب: قطعی طور پر شرعی قیادی نظام اسکا ذمے دار ہے۔ یہ ادارہ اِس قسم کے عمل کی ضرورت کو تشخیص دیتا ہے اور مجاہدین کو اسکی انجام دہی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یا پھر جہاد کے کسی بھی دوسرے ذریعے سے استفادے کی دعوت دیتا ہے۔ اور طبیعی بات ہے کہ قیادی ادارے کو بھی اس صورتحال کی تشخیص کرتے ہوئے ماہرین سے رجوع کرنا چاہیئے۔ جب لائحہ عمل واضح ہو جاتا ہے اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد قیادت اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ فدائی حملے کی ضرورت ہے، تو اس سلسلے میں اقدام کا حکم صادر کرتی ہے۔

سوال: عام طور پر رائج نظریہ یہ ہے کہ فدائی حملے بعنوانِ اوّلی حرام ہیں لیکن ولیٔ امر یا ولیٔ فقیہ عنوانِ ثانوی کے تحت انہیں جائز قرار دیتا ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟
جواب: ہم اسے عنوانِ اوّلی کے تحت حرام نہیں سمجھتے۔ کیونکہ میدانِ جہاد میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا حرام نہیں، یہ عمل صرف انفرادی مسائل میں حرام ہے جہاں انسان کسی جذباتی، نفسیاتی یا اقتصادی مسئلے کی وجہ سے خود اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ جبکہ فدائی حملے دشمن کی گھات میں بیٹھنے اور اس پر یلغار کرنے جیسے جنگی منصوبوں کی مانند ہیں، جن کا فیصلہ اعلیٰ قیادت کرتی ہے۔ وہ قیادت یہ منصوبے بنا کر ان پر عمل کیلئے نچلی قیادت کو احکامات صادر کرتی ہے۔ فدائی حملوں اور یلغار اور دفاع جیسی دوسری عسکری کارروائیوں کے درمیان ولیٔ امر کی براہِ راست یا بالواسطہ اجازت کی ضرورت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ کسی مسلمان سپاہی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے جہاد کرے، بلکہ اسے شرعی قیادت کے احکام کا تابع ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایسی قیادت ہی جہاد کی اجازت اور مقابلے کے میدان میں اسکے لئے اقدام کے جواز کا تعین کرتی ہے۔

غیر اسلامی جماعتوں سے روابط و تعلقات

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غیر اسلامی جماعتوں سے تعلقات کا قیام' اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنے کے مترادف ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنا' یا اُن سے دستبردار ہو جانا ایک ناپسندیدہ بات ہے' جس کا تعلق اندازِ فکر اور اجرائی و عملی پہلو سے ہے۔ لیکن جب اسلام پسندوں اور سیکولرسٹوں کے درمیان ایک خاص مرحلے میں مشترک مقصد کے حصول کیلئے کسی تعاون کی صورت پیدا ہوتی ہے' تو اِس موقع پر اسلام پسندوں نے دراصل اپنے اصولوں کو نہیں چھوڑا ہوتا' بلکہ یہ تعاون' معاہدہ اور اتحاد اِس مشترک مقصد کی بنیاد پر ہوتا ہے جس پر یہ دونوں فریق متفق ہوتے ہیں۔ اس اتحاد کے نعرے' دونوں فریقوں کے نعرے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیسے آج اسرائیل یا عالمی استکبار کے خلاف جنگ میں ہم بعض ایسے افراد اور گروہوں کے ساتھ مل کر جدوجہد میں مصروف ہیں جو اِن دو امور میں ہم سے اتفاقِ رائے رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اسی میدان میں سرگرمِ عمل ہیں جس میدان میں ہم مصروفِ کار ہیں۔ اور عالمی استکبار کی سرنگونی' اسرائیل کے خلاف جہاد اور اُس کی سرکوبی یا اُسے کمزور کرنے کیلئے جدوجہد ہمارا مشترکہ نعرہ ہے۔ ہم اِس نعرے کو اپنے فکری موقف سے ہٹنا نہیں سمجھتے کیونکہ یہ اِس مرحلے میں ہمارا اور ان کا مشترکہ نعرہ ہے۔

اِن کے ساتھ مشترکہ جدوجہد اپنے اصولوں سے دستبردار ہونے کے مترادف نہیں ہے' کیونکہ مشترکہ نکات پر اِن کے ساتھ تعاون ایسے ہی ہے جیسے آپ اور آپ سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص ایک ہی راستے پر چلتے ہوئے قریب قریب آجائیں۔ اِس صورت میں دونوں میں سے کسی نے بھی اپنا راستہ نہیں چھوڑا ہوتا۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اسلام سے علیحدہ یا متصادم نظریے سے تعلق رکھنے والی کسی تنظیم یا جماعت سے تعاون اُسے ایک جائز سیاسی' تحریکی فکر کے طور پر قبولیت کی سند دینا

ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں سمجھتے۔ ایسی جماعتیں جو اسلام کے دائرے سے باہر مختلف نظریات' وابستگیوں اور رجحانات کی مالک ہوں' اُن کے ساتھ باہمی معاہدوں اور تعاون کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی فریق فکری اور سیاسی لحاظ سے دوسرے کو جائز نہیں سمجھتا لیکن ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے مل جل کر کام کرتا ہے۔ اور کسی دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے کے معنی اسکی فکر کو جائز سمجھنا نہیں ہیں۔ کیونکہ اِس میدان میں معاملات اپنے حقیقی عناصر کے تابع ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایک مشترک ہدف کیلئے اِس قسم کے تعاون اور اتحاد میں اصولی اعتبار سے کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ اسلام پرستوں کو اِس بات سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ ان کے اتحادی مشترکہ ہدف سے تعلق رکھنے والی چیزوں سے زیادہ ان سے سوءِ استفادہ نہ کریں اور اپنے مخصوص نعروں اور نظریات کا اظہار نہ کریں' جو اُن کی تحریک کی امتیازی علامات ہیں اور جو ممکن ہے اسلامی تحریک کیلئے نقصان دہ ہوں۔ اتحاد کے قیام اور محاذ کی تشکیل کے وقت اِس مسئلے کی جزئیات اور تفصیلات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اصولی طور پر مرحلہ وار مقاصد کے حصول کیلئے دوسروں کے ساتھ معاہدہ کرنا' اُن کا حلیف بننا اور اُن کے ساتھ مل کر اتحاد تشکیل دینا اپنے فکری اور عملی موقف سے پیچھے ہٹنا شمار نہیں ہوتا۔

اسلام پرستوں کے درمیان باہمی تعاون کی بنیادیں

سوال: جنابِ عالی کی نظر میں خود اسلامی تحریکوں اور شخصیات کے درمیان باہمی تعاون اور اتحاد کے اصول و قواعد کیا ہیں؟ کیا صرف نظریاتی اختلاف فریقِ ثانی کی عدالت کے خاتمے اور اسے فاسق قرار دینے کا سبب بن سکتا ہے؟

جواب: جب ہم اپنے ساتھ جزی مسائل میں اختلاف رکھنے والے لیکن بنیادی اصولوں میں متفق اسلام پرستوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیں' تو اُن کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا ایک مسلمان کا طرزِ عمل دوسرے مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی اُنہیں برا

بھلا کہنا، اُن پر ناحق تہمت لگانا، اُنہیں بدنام کرنا اور اُن کی غیبت کرنا جائز نہیں ہے۔

مثبت اور منفی رویے اختیار کرتے ہوئے اور حلال وحرام معاملات میں ہمیں اسلامی اخلاق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ لیکن اسکے باوجود یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ کبھی کبھی کسی ایک فریق کے خیال میں دوسرے فریق کا عمل گمراہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اِن امور میں اچھی طرح جانچ پرکھ سے کام لینا چاہئے۔ بعض اوقات کسی بڑی اسلامی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی فریق کو کمزور کیا جائے۔ ایسے مواقع پر اہم اور اہم ترین امر اور سود و زیاں کے درمیان موازنہ کیا جائے گا۔ اگر اسکے نتیجے میں ہم یہ محسوس کریں کہ دوسرے کے مقابل ایک فرد کا منفی طرزِ عمل حدودِ شرع سے خارج نہیں ہوا ہے، تو اسکی عدالت ختم نہیں ہوئی، سوائے اُس صورت کے جب وہ گمراہی کا راستہ اختیار کرلے۔ یعنی کسی مسلمان کی غیبت کرے (اور اسکی غیبت کو استثنائی مواقع میں سے نہ سمجھے) یا دوسروں کو ناحق برا بھلا کہے، ان پر تہمت لگائے۔ قدرتی بات ہے کہ اِس قسم کا طرزِ عمل انسان کو فسق کے دائرے میں داخل کردیتا ہے اور اسے فاسق قرار دے دیتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کے میل جول میں (خواہ یہ تنظیمی یا جماعتی کاموں کے سلسلے میں ہو یا اس کے علاوہ) ہمیں چاہئے کہ اسلام اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر عمل کریں اور ہمارے لئے اس حد سے تجاوز جائز نہیں ہے، ماسوا اُن مقامات کے جہاں شریعتِ اسلامی نے کسی چیز کو جائز قرار دیا ہو۔

سوال: اِس مقام پر ایک مشکل یہ سامنے آتی ہے کہ ایسی صورتحال میں ہر فریق دوسرے کے بارے میں اپنے منفی طرزِ عمل کے جواز کیلئے، اپنے نکتۂ نظر سے ایک توجیہ گھڑ لیتا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اپنے موقف اور طرزِ عمل کی توجیہ کیلئے اپنے مزاج اور خواہش کے مطابق عمل کرنے کی بجائے، ہمیں شرعی قواعد وضوابط سے رجوع کرنا چاہئے۔ اہم اور اہم ترین کا مسئلہ قطعی طور

پر سود و زیاں (مصلحت اور مفسدہ) سے جڑا ہوا ہے۔ اور سود و زیاں کو جاننے کیلئے مسائل کا من پسند طریقے سے نہیں بلکہ اِن مسائل کی واقعیت اور حقیقت کے اعتبار سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

یہاں اس بات کی یاددہانی مناسب دکھائی دیتی ہے کہ ردِعمل کے طور پر مزاج کے مطابق یا جماعتی اور گروہی سوچ کے زیرِاثر موقف اختیار کرنا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ فریقِ مخالف میں صرف برائی ہی برائی دکھائی دیتی ہے، اسمیں کوئی معمولی سی خوبی بھی نظر نہیں آتی۔ یہ ایک غیر اسلامی طرزِ عمل ہے۔ عصبیت کی تعریف میں امام زین العابدین علیہ السلام کی ایک حدیث ہے کہ: **العصبية التی یاثم علیها صاحبها ان یریٰ الرجل شرار قومه من خیار قوم آخرین، ولیس من العصبية ان یحب الرجل قومه، ولکن العصبية ان یعین الرجل قومه الظلم ...** (وہ عصبیت جس کا حامل شخص گناہگار ہے، ایسی عصبیت ہے جس میں مبتلا شخص اپنی قوم کے بدکردار افراد کو دوسری قوم کے نیکوکار افراد پر ترجیح دے۔ کسی شخص کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت نہیں ہے۔ ہاں، عصبیت یہ ہے کہ انسان ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۵۔ ص ۳۷۲۔ روایت ۲۰۷۷۸)

سوال: کیا جماعت یا تنظیم، اپنے ممبر کو اپنے مخالف افراد یا اداروں سے رابطہ برقرار رکھنے سے منع کرسکتی ہے؟

جواب: اگر جماعتی وابستگی کا تقاضا ہو اور اسلامی شریعت کی پابندی یا کسی اسلامی مصلحت کی موجودگی نے اِس پر لازم کیا ہو، تو اسے شرعی قیادت (اگر ایسی قیادت جماعت میں موجود ہو) کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اگر وہ قیادت ایسے احکام صادر کرے جو حرام کی انجام دہی کا حکم نہ دیتے ہوں، یا کسی واجب سے نہ روکتے ہوں، بلکہ مباح اور عناوین ثانوی کے تحت حرام ہو جانے والی ترجیح کے حامل ہوں، تو جماعت یا تنظیم کے کارکنوں کو ان ہدایات کی

پابندی کرنی چاہئے۔

سوال: مذکورہ بالا سوال کے برعکس سوال ہے کہ اگر جماعت اپنے کسی رکن کو ایسے افراد یا اداروں سے روابط قائم کرنے کو کہے جن سے وہ اختلاف رکھتا ہے' یا جنہیں وہ پسند نہیں کرتا' تو اِس صورت میں کیا اِس پر ان احکامات کی پابندی لازم ہے؟
جواب: اگر یہ حکم ایک ایسی شرعی قیادت کی طرف سے صادر ہوا ہو' جس کے احکام پر عمل شرعی اصولوں کے تقاضوں کے تحت لازم ہے' تو اِس حکم کی اطاعت ضروری ہے۔

کل کے دشمن آج کے دوست

سوال: معروف سیاسی تعبیروں جیسے ''کل کے دشمن آج کے دوست'' کی شرعی معیارات کے مطابق کیا حیثیت ہے؟
جواب: کبھی کبھی دشمنی اور دوستی کا معاملہ بنیادی طور پر مختلف نکتہ ہائے نظر کے ساتھ انسانوں کے تعلق اور اُن کی مخالفت کے مسئلے سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ جیسے کفر اور ایمان کا معاملہ۔ قدرتی طور پر کفر' ایمان کا دشمن ہے اور کافر' کفر پر مبنی اپنے موقف کی بنیاد پر اسلئے مومن کا دشمن ہوتا ہے کیونکہ مومن ایمان پر مبنی موقف رکھتا ہے۔ یہاں یہ دشمنی ایک شخص کے ساتھ دوسرے شخص کی دشمنی نہیں ہے بلکہ ایک نظریے اور مکتب کی دوسرے نظریے اور مکتب کے ساتھ دشمنی ہے' ایک اصول کی دوسرے اصول کے ساتھ عداوت ہے۔

کبھی کبھی مکتبِ ایمان کی مصلحت تقاضا کرتی ہے کہ کافر کے ساتھ ایک قسم کا تعلق قائم کیا جائے۔ البتہ ذہن نشین رہے کہ ہم رابطہ اور تعلق کہہ رہے ہیں' کافر شخص کے ساتھ مخلصانہ دوستی کی بات نہیں کر رہے۔ کیونکہ بعض اوقات کافر کے ساتھ ربط و تعلق قائم کر کے اسلام و ایمان کی خدمت کی جا سکتی ہے۔

جس طرح مسلمان ممالک کافر ممالک کے ساتھ تجارتی' علمی اور تیکنیکی تعلقات قائم

کر کے اُن سے استفادہ کرتے ہیں'اِسی طرح اسلام کیلئے شدید خطرناک کافر دشمن سے مقابلے کیلئے ہمیں کم خطرناک کافر دشمن کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اور اگر ہم تنہا اسکا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں لیکن کسی شخص یا ادارے کے ساتھ مل کر اسکا مقابلہ کر سکتے ہوں' تو ایسے موقع پر عظیم اسلامی مصلحت کے تحت اسکے ساتھ سیاسی' اقتصادی اور اسی طرح دوسرے شعبوں میں دوستی کا قیام جائز ہوگا۔

اسلام جس چیز کو حرام قرار دیتا ہے'وہ دشمنانِ خدا سے محبت والفت پر مبنی تعلقات کا قیام ہے۔محبت والفت پر مبنی تعلقات کی بنیاد ان کے ساتھ گہرا قلبی تعلق اور ان کی تمام خصوصیات کے ساتھ دلی وابستگی ہوتی ہے'اور یہ عمل کفر کے ساتھ تعلق اور وابستگی کے ہم معنی ہے' کفر کے بارے میں تساہل اور اسے کم اہمیت دینے کے مترادف ہے۔اور یہ رویہ اس آیۂ کریمہ کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ (آپ کبھی نہ دیکھیں گے کہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والی قوم' ان لوگوں سے دوستی کر رہی ہے جو اللہ اور اسکے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں۔سورۂ مجادلہ ۵۸۔آیت ۲۲)

گہرے قلبی احساس اور اخلاص کی بنیاد پر محبت والفت اور ایسے میل جول اور تعاونِ باہمی کے درمیان فرق ہے جسے بعض اوقات سیاسی دوستی کہا جاتا ہے۔ممکن ہے ایک شخص سیاسی لحاظ سے ایک وقت میرا دشمن ہو' کیونکہ اس وقت وہ اسلامی مفادات اور مصالح کے برخلاف سرگرم عمل ہو۔لیکن اگر یہی شخص کل حالات و واقعات کے زیرِاثر ایک نیا موقف اختیار کر لے' تو ممکن ہے میرا دوست بن جائے۔

سوال: بعض حکومتیں' اسلامی تحریک کے ساتھ مضبوط تعلقات اور تعاون کے عنوان سے' اِس سے خاص اطلاعات طلب کرتی ہیں۔ان اطلاعات کو اس طریقے سے ان کے حوالے کرنے کی کیا حدود ہیں کہ ان سے دوستانہ فضا بھی خراب نہ ہو اور اسلامی تحریک کو بھی نقصان

نہ پہنچے؟

جواب: یہ اُن تفصیلی امور میں سے ہے جن کی جزیات تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ انتہائی غور وخوض کے ساتھ اِس بات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے کہ وہ حکومت آپ کے رازوں کی امین ہے یا نہیں؟ اور اُس کے ساتھ آپ کا تعلق اسلام کے فائدے میں ہوگا یا اُسے نقصان پہنچائے گا؟

اِسی طرح ایسی حکومتوں کے ساتھ تعاون اور ہمکاری کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ اسلام و مسلمین کے مفاد میں ہے یا نہیں؟ اور اس بات کی تشخیص کی جائے کہ اس رابطے کے نتیجے میں اسلامی تحریک کو حاصل ہونے والے فائدے اُس حکومت کو حاصل ہونے والے فوائد سے زیادہ ہیں یا نہیں؟

اگر ضرورت تقاضا کرے کہ ایسی حکومت کو کچھ معلومات فراہم کردی جائیں، تو ان معلومات کو اچھی طرح چھان پھٹک لینا چاہئے اور ایسی معلومات فراہم کرنی چاہئیں جن سے اسلام کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

سوال: ایسی مسلمان حکومتوں کے ساتھ کس طرح تعاون کیا جاسکتا ہے جو ہمارے دشمنوں سے روابط رکھتی ہیں؟

جواب: واضح بات ہے کہ ایسی حکومتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے مکمل احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ حکومتیں ہمارے دشمنوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے ان حکومتوں کے ساتھ ہمارا کام کرنا بھی دشمنوں کو فائدہ پہنچائے اور اُن کی پوزیشن مضبوط کرنے کا باعث بن جائے اور شاید اس صورتحال سے دشمن فائدہ اٹھائے۔ ہمیں چاہئے ایسی حکومتوں کے ساتھ تعاون و ہمکاری کا فیصلہ اپنے ضروری اور ترجیحی مفادات کی بنیاد پر کریں، تاکہ اسکے منفی کی بجائے زیادہ سے زیادہ مثبت نتائج برآمد ہوں۔ اگر صورت یہ ہو تو اُن کے ساتھ تعاون اور ہمکاری میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ کسی خطرے

امکان نہ ہو۔

سوال: کیا اسلامی حکومت کی طرح، اسلامی جماعت بھی دوسری حکومتوں اور سیاسی مراکز سے روابط و تعلقات کے قیام کا اختیار رکھتی ہے؟ یہ بات پیش نظر رہے کہ بعض لوگ اس عمل پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کیلئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جماعت کے وسائل اور قوت حکومت (بالخصوص بڑی حکومتوں کے) وسائل اور قوت سے کم ہوتے ہیں؟

جواب: واضح سی بات ہے کہ جب کوئی جماعت یا تحریک دوسروں سے تعلق قائم کرنا چاہے، تو اسے اپنے اس اقدام کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہئے۔ کیا اس (غیر اسلامی) حکومت کے اسلام مخالف منصوبوں اور اقدامات کا اثر قبول کئے بغیر اس کے ساتھ تعاون کا امکان موجود ہے؟ یا اگر بالفرض حکومت اسلامی ہو، لیکن اس کے اور جماعت کے درمیان بعض نکات پر اختلاف پایا جاتا ہو، تو اسلامی جماعت کا اپنی کمزور پوزیشن کے ساتھ اس حکومت سے تعاون کرنا اور گھل مل جانا اسکے بنیادی معاملات کو شدید نقصان پہنچاتا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں اس تعلق اور رابطے کے بارے میں اچھی طرح جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ممکن ہے اس جائزے اور غور و فکر کے نتیجے میں بعض اوقات ہم اس حکومت کے ساتھ کسی بھی قسم کا رابطہ برقرار نہ کرنے کا فیصلہ کریں، تاکہ اس رابطے کے نتیجے میں اس حکومت کی پوزیشن مستحکم نہ ہو، اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ اسکے برعکس فیصلے تک پہنچیں۔

لہٰذا (اسلامی یا غیر اسلامی) حکومتوں کے ساتھ جماعت و تنظیم کے تعلق کے حوالے سے ایسے گوناگوں مسائل موجود ہیں جن کے بارے میں تفصیلی اور جزی خطوط کا تعین ممکن نہیں، ماسوا اس واضح اصول کے کہ: ''اس قسم کے تعلقات کے قیام میں اسلام و مسلمین کی مصلحت و مفاد کو پیش نظر رکھا جائے۔''

سوال: آج کل اسلامی تحریکوں اور (بے دین) حکومتوں کے درمیان تعلقات کو معمول پر

لانے کی دعوت کے عنوان سے جو آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، اُن کے بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟ کیا یہ بات ائمہؑ کے اُس معروف موقف سے ہم آہنگ ہے جو انہوں نے اموی اور عباسی حکومتوں کے ساتھ اختیار کیا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ حکومتیں اسلام کا نعرہ بلند کررہی تھیں؟

جواب: اِن حکومتوں کے ساتھ اِس انداز سے تعلقات کو معمول پر لانا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے کہ یہ تعلقات اُن کیلئے سندِ جواز بن جائیں اور معمول کے اِن تعلقات کے نتیجے میں اُن ناجائز حکومتوں کے خلاف باطنی احساسات سرد پڑ جائیں۔ کیونکہ ہمیں کسی بھی غیر شرعی چیز کو شرعی قرار دینے کی اجازت نہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ظالموں سے قطع تعلق کے حکم پر مشتمل ائمہؑ کی احادیث، حتیٰ اُنہیں حج تک کیلئے اونٹ کرائے پر دینے کی ممانعت (جس کے بارے میں امام موسیٰ کاظمؑ اور صفوان جمّال کے درمیان ہونے والی گفتگو میں آیا ہے) کی بنیاد، خود اِس عمل کی حرمت نہیں ہے، بلکہ اسکی اساس یہ ہے کہ اِس عمل کے نتیجے میں ان (ظالموں) کے ساتھ ایک باطنی تعلق قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ امامؑ نے صفوان سے سوال کیا: کیا تمہاری یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ لوگ زندہ سلامت واپس لوٹیں، تاکہ تمہیں تمہارا کرایہ ادا کریں؟ صفوان نے کہا: جی ہاں! امامؑ نے فرمایا: جو شخص اِن کی بقا اور سلامتی چاہتا ہے وہ ان ہی میں سے اور ان ہی کے ساتھیوں میں سے ہے۔ (من لایحضرہ الفقیہ۔ ج ۴۔ ص ۴۳۷)

لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ غیر شرعی حکومت کے ناجائز ہونے پر شعوری اور قلبی عقیدہ رکھے۔

لیکن اگر ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمکاری اور تعلقات کو معمول پر لانے کی دلیل لوگوں کی عام ضروریات کو پورا کرنا اور ایسے پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے ہو جو بسا اوقات بعض مشترک امور میں غیر شرعی حکومت کے ساتھ تعاون اور ہمکاری کو ضروری قرار دیتے ہیں، تو فوائد اور نقصانات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ عمل جائز ہوگا۔ اِس مسئلے میں دیا جانے والا

حکم جنگ بندی کے حکم کی مانند ہے، جس میں ماہرین اور اصحابِ شریعت کی طرف سے تشخیص دے دینے کی صورت میں جنگ روک دی جاتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی آراء، مسئلے کے گرد و پیش، اُس وقت کے حالات و واقعات اور اس فیصلے کے منفی اور مثبت آثار و نتائج کے تناسب سے متغیر احکام رکھتی ہیں اور انہیں قبول یا مسترد کرنے کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں دیا جا سکتا۔

یہ مسئلہ خارجی، قلبی اور عقلی لحاظ سے اصولی طور پر نا قابلِ قبول قرار دیا جانا چاہئے۔ تا کہ انسان اِن لوگوں کے ساتھ یگانگت اور ہمدلی کا احساس نہ کرے جنہیں شرعی جواز حاصل نہیں۔ البتہ اس معاملے میں حالات و شرائط کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا جماعت کو دوسروں سے تعلقات کے قیام کے بارے میں حکومت یا جماعت کی قیادت کے فیصلے کا تابع ہونا چاہئے، یا اِس بارے میں ولی فقیہ یا مرجع سے رجوع کرنا واجب ہے؟

جواب: اس مسئلے میں اس ولی امر سے رجوع کیا جانا چاہئے جس کے پاس ولایتِ شرعی موجود ہو، چاہے اسکی ولایت اوّل درجے کی ہو چاہے دوسرے درجے کی۔ قدرتی بات ہے کہ ولی امر جن امور میں مہارت نہیں رکھتا، اُن میں وہ اپنی رائے ٹھونس نہیں سکتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنی عدالت سے محروم ہو جائے گا، جو اِسکی ولایت کی بنیاد ہے۔ ولی فقیہ پر لازم ہے کہ وہ ایسے ماہرین سے رجوع کرے جو زیرِ نظر مسئلے کے مصالح و مفاسد (اچھے بُرے نتائج) کی تشخیص کر سکیں۔ خواہ مسئلہ ایک حکومت کے دوسری حکومت کے ساتھ تعلقات کا ہو، چاہے اسلامی تحریک یا تنظیم کے کسی حکومت یا جماعت سے تعلق کا، ایسے افراد سے رجوع کرنا چاہئے جنہیں شرعی جواز حاصل ہو۔ قدرتی بات ہے کہ اگر فقیہ اور غیر فقیہ کے درمیان معاملہ آ پڑے، تو فقیہ مقدم ہے، بشرطیکہ وہ معاملات اور مسائل میں ماہرین اور صاحبانِ رائے سے رجوع کرتا ہو۔

امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ تعلقات

سوال: کچھ لوگوں کے اِس خیال کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے سوا تمام ممالک کے ساتھ تعلقات کا قیام ممکن ہے۔ کیونکہ اِن ممالک (امریکہ اور اسرائیل) میں قائم حکومتیں اسلام دشمنی کی بنیاد پر قائم ہیں؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ مسلمان دنیا کی تمام حکومتوں کے ساتھ باہمی مشترکہ مفادات، ایک دوسرے کے احترام اور اپنی ضروریات کی تکمیل کی غرض سے معمول کے تعلقات قائم کرسکتے ہیں۔ ایسے تعلقات کا قیام حتیٰ امریکہ کے ساتھ بھی ممکن ہے، اگر وہ اسلامی کاز کے ساتھ اپنی عداوت ختم کردے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی سیاست تبدیل کردے۔

البتہ اسرائیل اگر اپنی سیاست بھی بدل لے اور اپنا رویہ بھی تبدیل کرلے، تب بھی اسکے ساتھ تعلقات کا قیام ممکن نہیں۔ کیونکہ سرزمینِ فلسطین پر ناجائز اور جابرانہ قبضے کی وجہ سے اِس حکومت کی بنیاد ہی غیر قانونی ہے۔ لہٰذا اسرائیل کا معاملہ دوسری حکومتوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ اسرائیل کے وجود کی بنیادیں فلسطینی عوام کی لاشوں پر رکھی گئی ہیں۔ فلسطین میں یہودیوں کی صورتحال اس قوم کی سی ہے جس نے ایک دوسری قوم کو اسکے وطن سے نکال کر اسکی سرزمین پر قبضہ جمالیا ہو۔ لہٰذا ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان اس غاصب حکومت اور قوم کو قانونی جواز فراہم کرے۔ کیونکہ شریعتِ الٰہی کی رو سے غصب حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کسی صورت کفار کو مومنین پر غالب نہیں آنے دے گا: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (اور خدا کفار کو صاحبانِ ایمان کے خلاف کوئی راہ نہیں دے سکتا۔ سورہٴ نساء۴۔ آیت ۱۴۱)

سوال: اگر فرض کریں کہ اسرائیل اپنی موجودہ سیاست سے دستبردار ہوجائے اور ہر حقدار کو اسکا حق ادا کردے، اور فلسطینی بغیر کسی استثنا کے اپنے وطن کو لوٹ جائیں اور حکومت اس بات

کو مان لے کہ آئندہ حکومت کی تشکیل استصواب رائے اور آزادانہ انتخابات کی بنیاد پر ہوگی، تو کیا اسرائیل کے بارے میں رویہ تبدیل کیا جاسکتا ہے؟

جواب: اگر دنیا کے مختلف گوشہ وکنار سے (فلسطین) آ کر بسنے والے یہودی اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں اور جن فلسطینیوں کو ناحق ان کے ملک سے نکالا گیا ہے وہ فلسطین واپس آ جائیں، تو اِس صورت میں فلسطین الاصل یہودی مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ اپنے ملک میں رہ سکتے ہیں اور اُن کے ساتھ مل کر اپنے معاملات چلا سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس صورت میں فلسطین پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی (کیونکہ فلسطین کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے) اور اگر اِس کا امکان نہ ہو، تو باہم مل جل کر رہنے کیلئے ایک حقیقت پسندانہ نظام تشکیل دیا جائے۔ اِس طریقے کے نقصانات دوسرے طریقوں کے نقصانات سے کم ہیں۔

سوال: کیا یہ شرط رکھنا کہ ترکِ وطن کر کے فلسطین میں آ بسنے والے یہودی اپنے اپنے سابقہ وطن واپس چلے جائیں، اِس حق کی مخالفت نہیں جو خداوندِ عالم نے (جائے مسکن کے انتخاب کے سلسلے میں) انسانوں کو دیا ہے؟

جواب: نہیں، ایسا نہیں ہے، کیونکہ وہ یہاں ایک قوم کو کچلنے کیلئے آئے ہیں۔ فلسطین کوئی غیر آباد ویران اور ایسی سرزمین نہیں تھی جس کا کوئی مالک نہ ہو۔ بلکہ یہ آباد خطہ ارضی تھا جس میں فلسطینیوں کی آبادیاں اور املاک تھیں۔ غیر ملکی یہودی، دوسرے ممالک سے یہاں آئے اور فلسطین پر قابض ہوگئے۔ اور کسی سرزمین پر جبری اور طاقت کے زور پر قبضے کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ درست ہے کہ انسان جہاں چاہے سکونت اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اسے دوسروں کے گھر پر قبضے اور دوسروں کی زمین پر ناجائز تصرف کا حق حاصل نہیں۔

عادل حکومت کی خصوصیات

سوال: عادل حکومت کی صفات وخصوصیات کیا ہیں؟ اس میں اور ظالم حکومت میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟

جواب: عادل حکومت وہ حکومت ہے جس کی سربراہی' قیادت کے بارے میں شرع کے فراہم کردہ اصولوں پر مبنی ہو اور جو معاشرے کی رہنمائی سے تعلق رکھنے والے امور میں مختلف ماہرین کی آراء اور نظریات سے استفادہ کرے۔ نیز عادلانہ اور شرعی حکومت سے مناسبت رکھنے والے قوانین کی حامل ہو اور جس میں قانون کے اُجرا میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا جاتا ہو اور جس میں قانون تمام افرادِ معاشرہ پر منصفانہ طور پر لاگو ہوتا ہو۔ جبکہ ظالم حکومت وہ حکومت ہے جس میں مذکورہ بالا خصوصیات موجود نہ ہوں۔

سوال: ایک ایسی حکومت جس پر لوگ رائج جمہوری طریقے سے متفق ہو جائیں' کیا اصولی بنیاد پر ایک شرعی حکومت ہوگی؟

جواب: حکومت کے شرعی جواز کے مسئلے میں ایک سے زائد نظریات کی مناسبت سے اِس سوال کے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔

اگر ہم حکومت کے شرعی جواز کے سلسلے میں شورائی طریقۂ کار کے قائل ہوں' تو حکومتی قیادت بھی شوریٰ کے ذریعے منتخب ہونی چاہئے۔ یعنی قیادت باہمی مشاورت کے ذریعے وجود میں آئے۔ قابلِ اعتماد شرعی خصوصیات کے ساتھ ایک معین شخص پر اتفاق رائے کے ذریعے ایسی قیادت سامنے لائی جاسکتی ہے۔

البتہ اِس طریقے میں ایسا نہیں ہے کہ لوگ جسے چاہیں قیادت کیلئے منتخب کرلیں' حتیٰ اگر وہ شخص کافر بھی ہو تو اُسے شرعی جواز مل جائے گا (نہیں' ایسا نہیں ہے)۔ کیونکہ اگر شوریٰ ہی کو بنیاد قرار دیں تب بھی لوگوں کا کسی کو صرف اتفاقِ رائے سے چن لینا' اسکی قیادت کو

شرعی جواز فراہم نہیں کرتا۔ بلکہ جس شخص کو قیادت کیلئے منتخب کیا گیا ہے' اُسے حاکم کیلئے شرعی صفات سے متصف ہونا چاہئے۔

لیکن اگر ہم ولایتِ فقیہ کے ماننے والے ہوں' تب بھی فقیہ کو انتخاب کیلئے عوام کے سامنے آنا چاہئے اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ دوسرے مجتہدین میں سے قیادت کیلئے اُسکا چناؤ کریں۔ کیونکہ لوگوں کی رائے ہی اسکی ولایت کو عملاً جامۂ عمل پہناتی ہے' اُسے ولیٔ امر کا مصداق قرار دیتی ہے اور ولایت کے اعتبار سے اسکی اطاعت کو واجب کرتی ہے۔

سوال: اگر کوئی حکومت اپنے اسلامی ہونے کا دعویٰ کرے' لیکن اسکے باوجود اس میں بعض اسلامی قوانین جیسے سود کی حرمت اور حدود کا اجرا معطل ہوں' تو کیا ایسی حکومت کو ایک عادل حکومت قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب: اگر بعض احکامِ شرع کے تعطل کی وجہ وہ شرعی قاعدہ ہو جو مصالح و مفاسد کے درمیان تزاحم کے اصول کی بنیاد پر اس (تعطل) کا تقاضا کرتا ہو' تو اِس تعطل کے نتیجے میں حکومت اپنی اسلامیت سے خارج نہیں ہوتی' کیونکہ اسکا یہ غیر اسلامی اقدام اسلام کے تدریجی طریقۂ کار کے تابع ہے۔ البتہ عارضی اور قلیل مدت کیلئے۔

لیکن اگر احکام کا تعطل شرعی جواز سے محروم ہو' تب بھی یہ حکومت کے اسلامی ہونے کی صفت کو زائل نہیں کرتا۔ ہاں' ایسی حکومت کو ایک منحرف حکومت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ حکومتِ اسلامی ہونے کے باوجود بعض احکام میں انحراف سے دوچار ہے۔ مثلاً ایک اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے بارے میں احوالِ شخصیہ (personal law) کے غیر اسلامی قانون کا نفاذ ایک طرح کا انحراف ہے۔ لیکن اسی قانون کا غیر مسلموں کے بارے میں ان کے آئین و شریعت کے مطابق نفاذ مسلمانوں اور ان کے درمیان طے ہونے والے معاہدے کے تابع ہے۔

حکومتی قوانین کی مخالفت اور اسکے اموال میں تصرف

سوال: حکومتی قوانین کی مخالفت اور نافرمانی کس وقت جائز ہے؟ اور حکومتی اموال میں تجاوز کا کیا حکم ہے؟

جواب: ہم کفار کے اموال (خواہ کافر کوئی فرد ہو یا حکومت) میں تجاوز کے جائز ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے۔ لیکن اِس حکومت کے قوانین کی نافرمانی جائز سمجھتے ہیں جو اپنے عوام پر ظلم کرے اور مسلمان بھی اس کی رعایا میں شامل ہوں۔ مسلمان اِس حکومت کو گرانے کیلئے اِسکے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ البتہ مسلمانوں کو اِس بات کا حق نہیں کہ وہ اِس ملک کے قوانین کی خلاف ورزی کریں جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبکہ یہ مخالفت اور خلاف ورزی وہاں کے معاشرتی نظم ونسق (law and order) میں خلل کا باعث ہو۔ بعض اوقات یہ عمل حرام بھی ہو جاتا ہے۔

سوال: بعض فقہا نے غیر اسلامی حکومت کے اموال میں تجاوز کو اِس عنوان سے جائز قرار دیا ہے کہ یہ اموال مجہول المالک ہیں اور وہ حاکمِ شرع کی اجازت سے اِن اموال میں تصرف کو درست سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: حکومت کی مالکیت کے بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں:

ایک نظریہ مالکیت کو صرف عاقل اور مختار شخص میں منحصر سمجھتا ہے اور کسی بھی ادارے اور تنظیم کو مالک نہیں سمجھتا۔ چاہے وہ حکومت ہو' چاہے کوئی انجمن' چاہے کوئی جماعت اور چاہے مسجد۔

اس نظریے کی رو سے جن چیزوں کو حکومت کی املاک واموال کا نام دیا جاتا ہے' در حقیقت وہ حکومت کی نہیں ہوتیں۔ کیونکہ حکومت ایک معنوی شے ہے' جو مالک نہیں ہو سکتی۔ پس وہ اموال جو حکومت کے کہے جاتے ہیں وہ اموال مجہول المالک ہیں اور اِن اموال کا

اختیار بھی حاکمِ شرع کے ہاتھ میں ہے۔

مالکیت کے بارے میں دوسرا نظریہ بھی ہے' جو کہتا ہے کہ حکومت مالک ہوسکتی ہے' لیکن اسکے لئے حاکم شرع کی منظوری ضروری ہے' تا کہ حکومت کا انتظام چلانے والے لوگ اموال کی منتقلی کے سلسلے میں انجام دیئے جانے والے معاملات کی اجازت رکھتے ہوں۔ اگر حکومت کو حاکمِ شرع کی جانب سے اجازت حاصل نہ ہو' تو وہ غیر شرعی ہے' اموال کی مالک نہیں ہوسکتی۔ اِن اموال پر اسکی مالکیت کی بنیاد غیر شرعی ہوگی اور ان پر مجہول المالک اموال کا قانون لاگو ہوگا۔

اسکے باوجود حکومت کے اموال کو مجہول المالک اموال سمجھنے والے فقہا بھی' دونوں ہی صورتوں میں اپنے مقلدین کو حکومت کے اموال میں تصرف اور تجاوز کی اجازت نہیں دیتے۔ بالخصوص اگر یہ عمل اجتماعی نظم ونسق (law and order) میں خلل کا باعث بنے۔

اِس بارے میں ایک اور نظریہ بھی ہے' جو حکومت یا حکومت کے سوا کسی اور کی ملکیت کے درمیان فرق کا قائل نہیں' اور ملکیت کے معتبر ہونے میں کسی انسان کی ذاتی شخصیت اور حکومت کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اس بنیاد پر حکومت اسلئے مالک ہوتی ہے کہ اعتباری اور معروف وجود کی مالک اور عقلی اصول کے مطابق ہے۔ لہٰذا وہ دلائل جو کسی فرد یا افراد کی ملکیت کو محترم شمار کرتے ہیں وہ حکومت کے اموال واملاک کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔

سوال: اِن مذکورہ آراء میں' جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

جواب: ہم سمجھتے ہیں کہ حکومتی مالکیت درست ہے اور حکومت کے اموال مجہول المالک نہیں بلکہ معلوم المالک ہیں۔ اور اگر ہم حکومت کے اموال کو مجہول المالک سمجھیں' تب بھی یہ اموال ان دوسرے مجہول المالک اموال سے مختلف ہیں' جو حاکمِ شرع کی جانب پلٹائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکومتی اموال قوم کے اموال ہیں' مجہول المالک

اموال نہیں ہیں ۔اور ان اموال کو حاکمِ شرع کی جانب پلٹانا مجہول المالک اموال پر اسکی ولایت کی بنا پر نہیں بلکہ ملت اور قوم پر اسکی ولایت کی بنیاد پر ہے۔

(۸)

طبابت (علاج معالجے) کے احکام

طبابت (علاج معالجے) کے احکام

سوال: کیا ڈاکٹر کیلئے اپنے مریضوں کے راز افشا کرنا جائز ہے؟
جواب: اگر مریض اپنے اسرار بطورِ امانت ڈاکٹر کے سامنے بیان کریں اور اسے اپنے رازوں کا امین سمجھیں، تو اِن اسرار کی حفاظت بالکل اِسی طرح واجب ہے جس طرح امانت کے طور پر سپرد کئے جانے والے اموال کی حفاظت واجب ہوا کرتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو اِن اسرار کی حفاظت، مال کی حفاظت سے بھی کہیں زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا افشا ہونا متعلقہ شخص کیلئے انتہائی منفی اثرات کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ:
المجالس بالا مانات وليس لا حدٍان يحدث بحديث يكتمه صاحبه الاان يكون ذكرا له بخير (نجی نشستوں میں ہونے والی باتیں امانت ہوتی ہیں اور کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کے بارے میں کوئی ایسی بات بولے جسے وہ مخفی رکھنا چاہتا ہو، ماسوا یہ کہ اچھائی کے ساتھ اُسکا ذکر کرے)

لٰہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مریض اپنے راز کو چھپا کے رکھنا چاہے، اور اس نے ضرورت کے تحت اپنے اس راز سے ڈاکٹر کو آگاہ کیا ہو، لیکن اسے یہ بات پسند نہ ہو کہ اسکا

یہ راز فاش کیا جائے' تو ڈاکٹر کو یہ راز افشا کر کے اُسے رسوا کرنے کا حق حاصل نہیں۔ بالخصوص جبکہ راز کی وہ بات عیب شمار کی جاتی ہو۔ اس صورت میں یہ عمل غیبت بھی ہوگا۔ کیونکہ ایک تعریف کی رو سے اپنے (دینی) بھائی کے پوشیدہ عیب کو ظاہر کرنا غیبت ہے۔ چاہے یہ عیب جسمانی ہو' اخلاقی ہو یا کوئی اور۔

سوال: کیا عورت کو اس بات کی اجازت ہے کہ جہاں خاتون ماہرِ امراضِ نسواں موجود ہو' وہاں وہ ایسے مرد ڈاکٹر سے رجوع کرے جو اُس سے زیادہ قابل اور ماہر ہو؟

جواب: اگر خاتون اور مرد ڈاکٹر وسائل و آلات اور علمی اور معالجے کی صلاحیتوں کے لحاظ سے یکساں ہوں اور خاتون ڈاکٹر تک آسانی کے ساتھ پہنچا بھی جاسکتا ہو' تو ایسی صورت میں عورت کیلئے مرد ڈاکٹر کو اپنا جسم دکھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر مرد ڈاکٹر کے پاس زیادہ جدید آلات ہوں' یا اسکا طریقۂ علاج خاتون ڈاکٹر سے بہتر اور مریض کیلئے زیادہ موافق ہو اور بیمار عورت کو اس مرد ڈاکٹر کی ہم پلہ خاتون ڈاکٹر سے رجوع کرنے میں نقصان کا خوف ہو' تو اسکے لئے خاتون ڈاکٹر کی موجودگی کے باوجود' مرد ڈاکٹر سے رجوع کرنا جائز ہے۔

اس بارے میں ہمارے پاس ایک حدیث ہے' جس سے یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ اگر مرد ڈاکٹر خاتون ڈاکٹر سے زیادہ مہربان اور ہمدرد ہو' تو عورت کے مرد ڈاکٹر سے رجوع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث' جسے ابو حمزہ ثمالیؒ نے روایت کیا ہے' اس میں ابو حمزہ ثمالیؒ نے امامؑ سے دریافت کیا: اگر کسی مسلمان عورت کے جسم کو کوئی نقصان پہنچا ہو' جیسے اُسکے جسم کے اس حصے پر جس پر نامحرم کی نگاہ ڈالنا درست نہیں ٹوٹ پھوٹ ہوگئی ہو' یا زخم لگا ہو اور اسکے علاج کیلئے مرد ڈاکٹر خاتون ڈاکٹر سے زیادہ موزوں ہو' تو کیا وہ مرد ڈاکٹر اس عورت کے بدن پر' نگاہ ڈال سکتا ہے؟ امامؑ نے جواب دیا: **اذا اضطرت الیہ فلیعالجھا ان شاءت** (اگر اس عورت کے پاس کوئی چارہ نہ ہو' تو مرد ڈاکٹر معالجے کی

غرض سے ایسا کرسکتا ہے۔وسائل الشیعہ ۔ج ۲۰۔ص ۲۳۳۔روایت ۲۵۵۱۲)

شہید ثانی علیہ الرحمہ نے اس حدیث اور بعض دوسری احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ معالجہ طبی ضروریات کے مصادیق میں سے ہے اور عقلا کو اس قسم کی ضرورتوں کیلئے مناسب ترین' ہمدردترین اور ماہر ترین طبیب کی تلاش ہوتی ہے تا کہ اطمینان کے ساتھ اُس سے علاج کرا سکیں۔

سوال: وہ کیا شرعی حدود اور احکام ہیں جن کا مرد ماہرِ امراضِ نسواں کو پابند ہونا چاہیے؟

جواب: نہ ہی امراضِ نسواں کے ماہر مرد کو اور نہ ہی کسی دوسرے مرد کو نامحرم عورتوں کے بدن کے ایسے مقامات کو دیکھنے کی اجازت ہے جن پر نگاہ ڈالنا حرام ہے' ماسوا اُس صورت کے جب عورت کے علاج کی ضرورت اِس کا تقاضا کرے۔

لہٰذا عورت کیلئے اپنے بدن کے جتنے حصے کو نامحرم مردوں کے سامنے کھولنے کی اجازت ہے' اُتنے ہی حصے کو مرد ڈاکٹر کے سامنے کھولنے کی بھی اجازت ہے۔اس میں ڈاکٹر اور غیر ڈاکٹر کے درمیان کوئی فرق نہیں۔کیونکہ ضرورت کے سوا' نامحرم عورت کے بدن پر نگاہ ڈالنا جائز نہیں۔علاج کے علاوہ نامحرم عورت کو ڈوبنے سے بچانا' یا آگ سے نکالنا اور اِسی طرح کے دوسرے مواقع پر بھی ضرورت صادق آتی ہے۔

سوال: کیا عورت' دایہ کی موجودگی میں زچگی کیلئے مرد ڈاکٹر سے رجوع کرسکتی ہے؟ اگر مرد ڈاکٹر براہِ راست یا ٹیلی وژن اسکرین کے ذریعے نظر رکھے تو اسکا حکم کیا ہے؟

جواب: زچگی کا حکم بھی علاج کے حکم ہی کی مانند ہے۔اگر عورت کیلئے کسی نقصان یا خطرے کے خوف کے بغیر خاتون ماہرِ امراضِ نسواں کے ذریعے زچگی کرانا ممکن ہو' تو اسکے لئے مرد ماہر سے رجوع کرنا جائز نہیں' جو اسکے بدن کو چھوئے اور اسکی شرمگاہ کو دیکھے۔لیکن اگر زچگی کے دوران دایہ کے کام پر مرد کی سرپرستی اور نظارت اس حد تک ضروری ہو کہ اسکی غیر

موجودگی کی وجہ سے ناگوار صورتحال پیش آنے کا خطرہ ہو تو ضرورت کے تقاضے کے تحت زچگی کے عمل پر اسکی نگرانی میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال: کیا روزہ رکھنے یا نہ رکھنے اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کیلئے بیمار کی حالت کی جو تشخیص ڈاکٹر کرتے ہیں اسکی پابندی ضروری ہے؟ اگر بیمار کو ڈاکٹر کی دینداری اور اسکے پابندِ شرع ہونے کے بارے میں شک ہو تو اسکی ذمے داری کیا ہے؟

جواب: کوئی مضائقہ نہیں، اگر ڈاکٹر ماہر اور قابلِ اعتماد ہو تو اسکی تشخیص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یعنی بیمار کی حالت کے بارے میں اس کی تشخیص بیمار کیلئے حجتِ شرعی ہے۔ لیکن اگر ڈاکٹر قابلِ اعتماد نہ ہو اور بیمار روزے یا ایسے ہی دوسرے اعمال (جنہیں انجام دینے کیلئے شرط ہے کہ وہ بدن کیلئے نقصان دہ نہ ہوں) کے سلسلے میں اسکی ممانعت کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھے، تو اسکی درج ذیل دو مفروضہ صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ اسے ڈاکٹر کی بات سے نقصان کا احتمال اور خوف لاحق ہو جائے۔ ایسی صورت میں اسے چاہئے کہ روزہ افطار کرلے یا سرے سے رکھے ہی نہیں۔ کیونکہ اگر بدن کیلئے نقصان کا اندیشہ ہو تو روزہ چھوڑ دینا جائز ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ انسان کو واقعی کوئی نقصان پہنچے (تب وہ روزہ چھوڑے)۔

دوسرے یہ کہ بیمار شخص اپنی سلامتی کے بارے میں ڈاکٹر کی بات سے خوفزدہ نہ ہو، اسے نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ ایسی صورت میں اسکے لئے روزہ چھوڑنا جائز نہیں۔

سوال: کیا ڈاکٹر کیلئے جائز ہوگا کہ وہ بیمار کی تکلیف کم کرنے کی غرض سے اس کیلئے کوئی ایسی دوا تجویز کرے جو اسکی سلامتی کیلئے نقصان دہ ہو؟

جواب: اگر تکلیف بیمار کیلئے ناقابلِ برداشت حد تک شدید ہو، اور اُسکی تکلیف کم کرنے کا فائدہ اس نقصان سے زیادہ ہو جو اس دوا کے نتیجے میں پیدا ہوگا، تو ایسا کرنا جائز ہے۔ لیکن

اگر یہ دوا بیمار کے جسم کیلئے قابلِ ذکر نقصان کا سبب ہو اور اسکی زندگی کیلئے خطرہ بن جائے یا اسکے لئے کوئی روگ پیدا کردے، تو ایسی صورت میں یہ دوا تجویز کرنا جائز نہیں۔

سوال: پابندِ شرع اور متدین ڈاکٹر کو ایسے آپریشنوں میں، جن کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے (جیسے رحم بند کرنے کا آپریشن) اپنے مرجع تقلید کے فتوے پر عمل کرنا چاہئے، یا جس کا وہ آپریشن کر رہا ہے اسکے مرجع تقلید کے فتوے پر؟

جواب: ظاہر بات ہے کہ ڈاکٹر کو اپنے مرجع تقلید کا تابع ہونا چاہئے، کیونکہ یہ اُسکا عمل ہے اور اُسے اپنے اِس عمل کا جواب دینا ہے۔ مثلاً ایسا مجتہد جو ایک عورت کے دوسری عورت کی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کو جائز سمجھتا ہے، اُسکی تقلید کرنے والی کوئی عورت کسی ایسی خاتون ڈاکٹر سے رجوع کرے جس کا مجتہد اِس عمل کو جائز نہیں سمجھتا، تو ایسی صورت میں اِس خاتون ڈاکٹر کا غیر اضطراری حالت میں اِس عورت کی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنا جائز نہیں۔ لیکن اگر خاتون ڈاکٹر کسی ایسے مجتہد کی مقلد ہو، جس نے اس قسم کا فتویٰ نہ دیا ہو، تو وہ ایسا آپریشن کرسکتی ہے۔

سوال: ڈاکٹر، حاکمِ شرع یا خود مریض میں سے کون اذیت سے نجات دلانے کی خاطر از راہِ رحم موت کے گھاٹ اتارنے (mercy killing) کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟

جواب: اگر اذیت سے نجات دلانے کی خاطر از راہِ رحم موت کے گھاٹ اتار دینے سے مراد، غیر معمولی تکلیف میں مبتلا کسی مریض کو اذیت سے نجات دلانے کی خاطر مار دینا ہے، تو یہ عمل جائز نہیں۔ کیونکہ کسی انسان کو اُس کی ہمدردی میں بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

اور اگر اِس سے مراد مریض کی زندگی سے ناامید ہو جانے والے اور دو تین روز بعد اپنے عزیز کی یقینی موت سے باخبر اہلِ خانہ کی زحمتوں کو کم کرنیکی خاطر مریض کو مار دینا ہو تو بھی یہ عمل جائز نہیں۔ کیونکہ اگر مریض کی زندگی کا ایک بھی لمحہ باقی ہو، تب بھی کسی کیلئے جائز نہیں کہ اُسے اِس سے محروم کرے۔

لیکن اگر ازراہِ رحم مار دینے سے مراد' دماغی موت کی حالت میں مار دینا ہو۔ مثلاً مریض طبی لحاظ سے مرچکا ہو۔ یعنی اسکا دماغ ناکارہ ہوچکا ہو' اور اسکے دوبارہ فعال ہونے کی ایک فیصد امید بھی نہ ہو' تو ایسی صورت میں ہماری رائے یہ ہے کہ اُسے سانس لینے کی ایسی مشین پر رکھنا واجب نہیں جو اسکی جسمانی مدتِ حیات' یا دل کی فعالیت کو بڑھا دے۔ اور ایک ایسا مریض جس کا دماغ فوت ہوچکا ہو' اسکے منہ سے ایسی مشین ہٹا لینا حرام نہیں ہے۔ اس مسئلے کی تشخیص اُس ڈاکٹر کے ذمے ہے جو مریض کا علاج کر رہا ہو۔ مریض کے اہلِ خانہ کا فرض یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر کی رائے مان لیں۔ یعنی صرف ڈاکٹر کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ کسی کی زندگی یا ایسے حالات میں کسی کی زندگی کا خاتمہ کرے۔ ڈاکٹر کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایسا کرنے کیلئے مریض کے ولی سے اجازت حاصل کرے۔ اور ولی ڈاکٹر کی تشخیص کا نتیجہ جاننے کے بعد اسے اس کام کی اجازت دے سکتا ہے۔

اس فتوے کی بنیاد یہ ہے کہ مریض کی زندگی بچانے کے واجب ہونے کے بارے میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں' اُن میں اس قسم کی زندگی شامل نہیں ہے' ایک ایسی زندگی جو بے ثمر ہے' ایک ایسی زندگی جو مرے ہوئے سانپ کی دم میں پائی جانے والی زندگی کے آثار کی مانند ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ دلیل جو انسان کی زندگی ختم کردینے یا اسے قتل کردینے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے' اُس میں یہ مورد شامل نہیں ہے۔ اِس فتوے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ دماغی موت (brain death) پر موت کا عنوان صادق آتا ہے۔ کیونکہ یہ امر شرعی دلائل سے حاصل نہیں ہوا ہے۔ واللہ العالم۔

سوال: مذکورہ بالا دو حالتوں میں کیا مریض اپنی زندگی کیلئے کسی حد کا تعین کرسکتا ہے؟ اور کیا ڈاکٹر کو یہ ہدایت دے سکتا ہے کہ وہ معینہ حد گزر جانے کے بعد اسے مار ڈالے؟

جواب: مریض کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں' کیونکہ اسے اپنی زندگی ختم کرنے کا اختیار نہیں۔

پوسٹ مارٹم

سوال: تعلیم کی غرض سے یا موت کی وجہ جاننے جیسے مقاصد کیلئے پوسٹ مارٹم کے بارے میں آپ کی فقہی رائے کیا ہے؟

جواب: بنیادی طور پر مسلمان کی میت کا پوسٹ مارٹم جائز نہیں۔ کیونکہ مسلمان میت کی حرمت بھی ویسے ہی ہے جیسے زندہ مسلمان کی حرمت ہے۔ اور خداوند عالم نے زندہ مسلمان کے بارے میں جس جس طرزِ عمل کو حرام قرار دیا ہے مردہ مسلمان کیلئے بھی اُسے حرام کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض احادیث کے مطابق شریعتِ اسلامی میں مردے کا سر یا ہاتھ قلم کرنے کی دیت بھی مقرر کی گئی ہے۔

لیکن اگر طبی تعلیم مسلمان میت کے پوسٹ مارٹم پر موقوف ہو، تو یہ عمل جائز ہے۔ اِسی طرح اگر کسی انسان کی موت کا سبب معلوم ہونا، یا قاتل کی تشخیص کے ذریعے مرنے والے یا اسکے ورثا کا حق ثابت کرنا، یا موت کے طبیعی ہونے، عمدی ہونے یا خطائی ہونے، یا موت کا سبب بننے والی بیماری کی تشخیص (جس کے نتیجے میں حفاظتی اقدامات کے ذریعے بہت سے لوگوں کی زندگیوں کو بچایا جا سکتا ہے) پوسٹ مارٹم پر موقوف ہو، تو یہ عمل جائز ہے۔

ایسے مواقع جن میں خاطر خواہ منفعت اور مصلحت موجود ہو، اُن میں مسلمان میت کے پوسٹ مارٹم کی حرمت کا حکم اٹھا لیا جاتا ہے اور اس عمل کے جواز کی وجہ کم تر مفسدے پر اہم تر مصلحت کو مقدم رکھنا اور اس عقلی حکم کا تقاضا ہے جو تزاحم کی صورت میں حکمِ شرعی دریافت کرتا ہے۔

سوال: پوسٹ مارٹم کو حرام قرار دینے والی بہت سی فقہی آراء کی سند وہ احادیث ہیں جن میں مثلہ کرنے (مردے کے جسم کو کاٹنے پیٹنے) حتیٰ پاگل کتے تک کا مثلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ واضح ہے کہ آج کل جس طرح پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے اُس میں اور مثلہ کرنے

میں نمایاں فرق ہے۔ لہٰذا جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟
جواب: بعض فقہا کی رائے میں میّت کے عضوِ بدن کو کاٹنا ہی اسکا مثلہ کرنا ہے۔ چاہے اسے نیک نیتی کے ساتھ ہی کیوں نہ کاٹا گیا ہو۔ بعض دوسرے فقہا کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ مثلہ انتقام لینے، سزا دینے اور دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک طریقہ ہے۔ ہمارا جھکاؤ اِسی دوسری رائے کی طرف ہے۔ اور ہم اِس بات کے قائل ہیں کہ اگر پوسٹ مارٹم کسی اچھے مقصد کے تحت کیا جائے، تو یہ مثلہ شمار نہیں کیا جائے گا۔

اعضا کو عطیہ کرنا

سوال: موت کے بعد اعضائے بدن کو عطیہ کرنے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟
جواب: موت کے بعد اعضائے بدن کو عطیہ کرنے میں شرعی طور پر کوئی ممانعت نہیں۔ کیونکہ اعضائے بدن کو کاٹنے اور علیحدہ کرنے کی حرمت اِس احترام کی وجہ سے ہے جو انسان کی ذات کو حاصل ہے۔ اگر انسان خود وصیت کے ذریعے مرنے کے بعد اپنے بدن کے احترام سے دستبردار ہو جائے تو یہ عمل جائز ہوگا۔

ایسا انسان اِس قسم کی وصیت کے ذریعے دوسرے انسان کو مزید کام، خدمت اور فعالیت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ عمل ایک قسم کا ایثار اور احسان ہے اور شرعی لحاظ سے ایک پسندیدہ عمل ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت فرماتا ہے: وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (اور جو اپنی ذات پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں، چاہے خود انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ سورۂ حشر ۵۹۔ آیت ۹)

اس آیت سے ہمیں ایثار و احسان جس میں زیرِ بحث موضوع بھی شامل ہے کے جواز اور خدا کی نظر میں اسکے پسندیدہ ہونے کا پتا چلتا ہے۔

سوال: اگر کسی انسان کی زندگی، میّت کے کسی عضو سے استفادے پر موقوف ہو، تو اسکا کیا حکم

ہے؟
جواب: یہ عمل صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ حتیٰ اگر مرنے والے نے اِس بارے میں وصیت نہ بھی کی ہو۔ کیونکہ تزاحم کی صورت میں مسلمان کی زندگی کی حفاظت کا واجب ہونا میّت کے کسی عضو کو جدا کرنے کے حرام ہونے پر مقدم ہے۔

سوال: جانتے بوجھتے اسقاط کرانے کا حکم کیا ہے؟ اور جو ڈاکٹر اس عمل کو انجام دیتا ہے اسکا حکم کیا ہے؟
جواب: نطفہ ٹھہرنے اور رحمِ مادر میں بچے کی زندگی کے آغاز کے بعد اِسے دانستہ ساقط کرنا حرام ہے۔ لیکن جب بچہ ماں کی زندگی کیلیئے خطرے کا باعث ہو اور اِسی طرح کے دوسرے خصوصی حالات میں، عورت کیلیئے اِس خطرے سے بچنا اور اپنی حفاظت کرنا جائز ہے۔ حتیٰ اگر اس قسم کا خطرہ کسی ایسے کی جانب سے ہو جو عقل و فہم نہیں رکھتا۔ مثلاً انسان کسی ایسے دیوانے کو قتل کر سکتا ہے جس نے اس پر حملہ کیا ہو اور اسے مار ڈالنا چاہتا ہو۔ البتہ صرف اِس صورت میں جب اِس خطرے سے نجات اسے قتل کرنے پر موقوف ہو۔

سوال: کیا میں ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے کسی مریض کی ایسی بیماری کو اس سے چھپا سکتا ہوں جس سے اسے آگاہ کرنا اسکے لئے نفسیاتی لحاظ سے نقصان دہ ہو؟ اور کیا اِسکا حوصلہ بڑھانے کیلیئے اسے جھوٹی امید دلانا میرے لئے شرعاً جائز ہو گا؟
جواب: اگر مریض کو اسکی بیماری سے آگاہ کرنا، اسکی جلد موت کا باعث ہو، تو یہ عمل جائز نہیں ہے۔ ہاں، مگر یہ کہ ضرورت اس کا تقاضا کرے۔ یعنی باخبر ہونے کی صورت میں وہ شخص وصیت اور اسی طرح کے جن دوسرے اہم معاملات کو ضروری سمجھتا ہے، اُنہیں نمٹا لے اور اپنی موت سے مطلع نہ ہونے کی صورت میں وہ ان امور کو انجام نہ دے سکے جن کے نتیجے میں مشکلات پیدا ہوں گی، تو اِیسی صورت میں اسے آگاہ کر دینا چاہیئے۔

ایسے مریض میں قوتِ مدافعت پیدا کرنے اور اُسے خوش باش اور آسودہ خاطر رکھنے کی غرض سے توریے سے کام لیتے ہوئے اُسے جھوٹی امید دلانا اجر و ثواب کا باعث ہے۔

سوال: ایسی لڑکی جس کی بکارت (کنوار پن) کسی حادثے یا غلطی کی وجہ سے زائل ہو جائے جبکہ وہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کرتی ہو جہاں اس غلطی کو نا قابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہو اور ایسے ماحول میں رہتی ہو جہاں ایسی لڑکی کی زندگی بھی خطرے میں ہو، تو اگر وہ لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کو غفلت میں رکھنے کی خاطر بکارت کی بحالی کا آپریشن کرائے، تو اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اگر بکارت کا نہ ہونا، ایسی ذلت سمجھا جائے جس کا برداشت کرنا عام طور پر ممکن نہ ہو، اسکی رسوائی کا باعث ہو اور اسکے لئے سخت شدید حالات یا اسکے قتل کا خوف پیدا کر دے، تو ایسی صورت میں بکارت کی بحالی کا آپریشن کرانا جائز ہے۔ البتہ اِس عمل میں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور شدید ضرورت کے سوا اسے انجام نہیں دینا چاہئے۔

اس مسئلے میں فیصلہ کرتے ہوئے بکارت سے محروم ہونے والی عورت کی جذباتی کیفیت پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اِس معاملے میں تساہل اور بے توجہی سے کام لینا، بہت سی لڑکیوں کی گمراہی کی جانب حوصلہ افزائی کا موجب اور حتیٰ شرعی تعلقات جیسے ازدواجِ موقت (متعہ) میں سہل انگاری کا باعث ہو گا۔ جس کے نتیجے میں بعض اخلاقی بُرائیاں اور سماجی مشکلات جنم لیں گی۔

البتہ اگر شوہر کو اِس معاملے کا پتا چل جائے تو وہ خیار تدلیس (۱) کے عنوان سے عقد کو ختم کر سکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ عقد نکاح سے پہلے، شوہر کو اِس مسئلے سے آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ میاں بیوی باہمی اعتماد کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز کریں۔ کیونکہ زوجین کا

۱۔ دھوکہ دہی کی صورت میں معاملے کو ختم کرنے کے اختیار کو خیارِ تدلیس کہتے ہیں۔

باہمی اعتماد مستحکم ازدواجی زندگی کی بنیاد ہے۔

سوال: ایک ایسی لڑکی، جو کسی بھی وجہ سے بکارت سے محروم ہوگئی ہو' کیا اس پر اس عورت کا حکم لاگو ہوگا جس کی بکارت شادی کے بعد زائل ہوئی ہو؟ کیا شادی کے سبب بکارت کے زائل ہونے اور شادی کے بغیر بکارت کے زائل ہونے کے درمیان کوئی فرق ہے؟

جواب: ہمارے خیال میں محض بکارت زائل ہونے پر' اُس پر غیر باکرہ کے احکام جاری ہوں گے۔ کیونکہ بکارت سے محرومی کی وجہ کچھ بھی ہو' بکارت زائل ہونے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگرچہ کچھ علما اِس بات کے قائل ہیں کہ غیر باکرہ وہ ہے جس کی بکارت (کسی بھی) قربت کی وجہ سے زائل ہوئی ہو۔ کچھ کا کہنا ہے کہ غیر باکرہ وہ ہے جس کی بکارت شرعی نکاح کے ذریعے ختم ہوئی ہو۔ اور ایسی عورت جو زنا کی وجہ سے اپنی بکارت سے محروم ہوئی ہو' وہ اسے غیر باکرہ نہیں سمجھتے۔

لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اپنی بکارت سے محروم ہونے والی دوشیزہ غیر باکرہ ہے' اب چاہے بکارت سے محرومی کا سبب کچھ بھی ہو (مثلاً اچھل کود کی وجہ سے' آپریشن کی وجہ سے' یا قربت کی وجہ سے) کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ باکرہ اور غیر باکرہ کے احکام میں معیار و ملاک صرف بکارت کا محفوظ ہونا یا اسکا زائل ہو جانا ہے اور یہ ایک ایسی صورت ہے جس کا احساس ہو جاتا ہے۔

سوال: ایسی عورت جو کسی حرام ذریعے' یا خفیہ شادی' جیسے متعہ کی صورت میں حاملہ ہوئی ہو' اگر اُسے سخت مشکل محسوس ہو' یا معاشرے کی طرف سے خطرے کا احساس ہو' تو کیا وہ بچہ ضائع کرا سکتی ہے؟

جواب: یہ عمل اُس صورت میں جائز ہے جب حمل کا باقی رہنا اسکی زندگی کو خطرے سے دوچار کر دے' یا اسکے لئے شدید ذلت کا باعث ہو اور ایسی مشکل کھڑی کر دے جسے

برداشت کرنے کی اُس میں طاقت نہ ہو۔ اِس میں بھی شرط یہ ہے کہ بچہ ابھی اُس مرحلے میں نہ پہنچا ہو جس میں اُس کے اندر روح داخل ہو جاتی ہے۔ روح داخل ہونے کے بعد اسقاط جائز نہیں، ماسوا اُس صورت کے جب عورت کی زندگی کو کوئی یقینی خطرہ لاحق ہو۔

سوال: اگر ماں یا بچے میں سے کسی ایک کی جان بچنے کا امکان ہو، تو اِن میں سے کون زندہ رکھے جانے کا زیادہ حقدار ہے؟ اس مسئلے میں فیصلے کا اختیار کسے حاصل ہے؟ ماں کو، باپ کو، ڈاکٹر کو یا حاکمِ شرع کو؟

جواب: فیصلے کا اختیار صرف ماں کو حاصل ہے۔ وہ بچہ ضائع کر کے اپنی جان بچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر یا بچے کا ولی یا کوئی اور اس سلسلے میں فیصلے کا حق نہیں رکھتا۔ حاکمِ شرع بھی صرف اِس عمل کے حلال ہونے کا فتویٰ دینے کے ذریعے اِس میں دخل دے سکتا ہے۔ جب عورت اِس صورتحال سے دوچار ہو اور اسکی زندگی کا تحفظ بچہ ضائع کرنے سے مشروط ہو، تو ڈاکٹر کیلئے اِس عمل کو انجام دینا جائز ہے۔ اسکے باوجود اِس قسم کے امور میں محتاط رہنا چاہیے۔

کلوننگ

سوال: کلوننگ کے بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟ اسی طرح وہ موافق اور مخالف آراء جو اسے ایک شیطانی عمل اور خداوندِ سبحان کے کاموں میں مداخلت قرار دیتی ہیں، اِن کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ہماری رائے میں یہ دریافت خداوندِ عالم کے کاموں میں مداخلت نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے انہوں نے تناسل کے عمل کے بارے میں خدائی راز کو اس کے بارے میں خدا کے وضع کردہ قوانین تک رسائی حاصل کر کے دریافت کیا ہے۔ اس تجربے نے کوئی نیا قانون یا طریقہ ایجاد نہیں کیا ہے، بلکہ انسانی جسم کے کچھ اسرار کو دریافت کیا ہے اور انسان یا حیوان کی کلوننگ (duplicate) کے سلسلے میں ان اسرار کے عمل اور ان سے

استفادے کے امکان کا پتا لگایا ہے۔ یہ بات دین کے کسی فکری اصول اور عقیدے سے اختلاف نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ انسان کو خدا کے ساتھ خالقیت کی مسند پر نہیں بٹھاتی۔ بلکہ اس کے ذریعے انسان نے انسانی بدن کے بارے میں الٰہی قوانین سے استفادے کا طریقہ دریافت کیا ہے۔

البتہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے اس مسئلے کے مثبت اور منفی نتائج پر تحقیق و تجزیے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اِس بات کا قوی امکان ہے کہ اِس طریقے کے ذریعے ایسے انسان پیدا ہوں جن کی صرف ماں ہو باپ نہیں۔ اِس صورت میں شرعی، قانونی اور اخلاقی لحاظ سے بعض ایسے مسائل جنم لے سکتے ہیں، جن کا حل پیش کیا جانا ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے امور میں کوئی براہِ راست اور جامع حکم نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس موضوع کے اطراف و جوانب اور متعلقات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔

ہم سائنس پر یقین رکھتے ہیں، کیونکہ سائنس ہم پر کائنات کے راز آشکار کرتی ہے۔ جب ہم اسرارِ ہستی دریافت کرتے ہیں تو ہم پر خدا کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سائنس کبھی تو انسانی مفاد و مصلحت کی مخالف ہوتی ہے اور کبھی اسکے مفاد و مصلحت کے موافق۔ لہٰذا اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان نت نئی سائنسی ایجادات سے کس طرح تخریبی کی بجائے تعمیری فائدے اٹھائے۔

شاید یہ بات آپ کیلئے دلچسپی کا باعث ہو کہ بعض نے اس مسئلے کے بارے میں ہمارے اس قول پر تنقید کی ہے، جس میں ہم نے کہا تھا کہ: ''اسلام سائنس کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور یہ خود سائنس ہے۔'' لیکن غیر ذمے دارانہ اور علمی امانتداری سے بعید اِس تنقید کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہوں نے ہمارے اِس قول کو اپنے کچھ حاشیہ نشینوں سے سنا ہو، اور ہماری رائے کو خود پڑھنے کی زحمت نہ کی ہو۔ ہمارا جواب یہ تھا کہ سائنسی انکشافات، صرف اور صرف خدا کو خالقِ کائنات سمجھنے والے دینی عقیدے اور فکر سے متصادم نہیں ہیں۔ حکمِ شرعی کے حوالے سے بھی ہم نے اسکے مثبت و منفی نتائج کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ لیکن جو

صاحب ہمارے پیش نظر ہیں وہ انسانی کلوننگ کو چند دلائل کی رو سے حرام سمجھتے ہیں۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ ہم انسان اپنے اور دوسروں کے بدن کے مالک نہیں ہیں، بجز یہ کہ ہمارے پاس اسکی کوئی دلیل موجود ہو۔ اور انسانی کلوننگ کا عمل عناوین ثانویہ کی بنیاد پر مفید یا مضر ہونے کے لحاظ سے کوئی دلیل نہیں رکھتا۔

اس استدلال کو مسترد کرتے ہوئے ہمارا کہنا ہے کہ ''قبح عقاب بلا بیان'' (۱) کے عقلی حکم کے تقاضے اور ''برائتِ شرعیہ'' کے حکمِ شرع کی رو سے اصلِ اوّلی اس عمل کا مباح ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا اس عمل کو حرام قرار دینے کیلئے دوسروں کو قابلِ ذکر نقصان پہنچانے، یعنی انہیں ہلاک کرنے یا انہیں اسکے نزدیک ضرر پہنچانے کی حرمت کو استدلال بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور آیتِ قرآن: وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۵) سے استفادہ کرتے ہوئے، اِس عمل کی حرمتِ شرعی پر اسے بطورِ سند پیش کرتے ہیں۔

دوسری دلیل جسے وہ کلوننگ کی حرمت کیلئے سند قرار دیتے ہیں، وہ یہ آیت ہے کہ: وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (اور ایسے احکام دوں گا کہ وہ جانوروں کے کان کاٹ ڈالیں گے، اور پھر حکم دوں گا تو اللہ کی مقررہ خلقت کو تبدیل کر دیں گے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۱۹) اور کلوننگ بھی خدا کی مقررہ خلقت میں تبدیلی کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا سلسلۂ نسب وجود میں لاتی ہے جو خاندان کی تشکیل کے بارے میں اسلام سمیت کسی بھی دین کے رائج طریقۂ کار سے ہم آہنگ نہیں۔

اس استدلال کے مقابل ہمارا جواب یہ ہے کہ ''خدا کی مقررہ خلقت میں تبدیلی'' کی تعبیر صرف انسان کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ پوری کائنات کیلئے ہے۔ اور اگر ہم اس پر مطلق عمل کرنا چاہیں تو اسکا لازمہ یہ ہوگا کہ کائنات کی تمام موجودات، بلکہ موجودات سے

۱۔ حکم اور قانون بیان کئے بغیر اُسکی نافرمانی پر سزا دینا عقلاً کی نظر میں قباحت رکھتا ہے۔

لے کر حالات و کیفیات تک میں تبدیلی کو حرام سمجھیں۔ جبکہ کوئی اِس بات کو قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس صورت میں بہت زیادہ تخصیص پیش آتی ہے۔ لہٰذا بہت سے فقہا نے داڑھی کاٹنے کی حرمت کیلئے مذکورہ آیت سے استدلال کو باطل سمجھا ہے۔ پس ہم اِس آیت کی وہ تفسیر قبول کرنے پر مجبور ہیں جو متعدد روایات میں کی گئی ہے اور جس میں خدا کی مقررہ خلقت سے مرادٗ دینِ الٰہی یا اوامرِ الٰہی کو قرار دیا گیا ہے۔

اِس استدلال پر ہمارا دوسرا جواب یہ ہے کہ کلوننگ عمومی معنی میں خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی جسم میں خلیوں کے نظام میں پائے جانے والے خدا کی خلقت کے عجائب سے استفادہ ہے' جو اس کے خلقتِ الٰہی سے ہم آہنگ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیونکہ خلقتِ الٰہی میں تبدیلی کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انسان کو جس شکل وصورت اور خصائص کے ساتھ خلق کیا ہے' اُس میں تغیر و تبدل کے ذریعے انسانی جسم میں دخل و تصرف کیا جائے۔ جیسے انسان کا اختہ کرنا اور اسی طرح کی دوسری تبدیلیاں اس میں پیدا کرنا۔ لیکن کسی ایک خاص جگہ سے کوئی خلیہ (cell) لے کر جین کے ساتھ اسکی تلقیح (پیوندکاری) اور اسے رحم میں رکھنا خلقتِ الٰہی میں تبدیلی کرنا نہیں۔ بلکہ یہ خدا کے خلق کئے ہوئے اندرونی نظام سے استفادہ کرنا ہے' جیسے رحم سے باہر تلقیح کرنا جس سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش کیلئے استفادہ کیا جاتا ہے۔

وہ تیسری دلیل جو ان موصوف نے کلوننگ کی حرمت کے بارے میں بیان کی ہے' وہ آیت ہے جو کہتی ہے کہ: فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهِ (مگر وہ (اُن سے وہ) باتیں سیکھتے تھے جن سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالوا دیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۰۲) موصوف نے اس آیت سے یہ مراد لی ہے کہ گھرانے کی شکل کو تبدیل کرنا ایک غیر شرعی اور حرام عمل ہے۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد میاں بیوی کے درمیان عملی اور واقعی صورت میں جدائی ڈالنا ہے۔ جس کے نتیجے میں

خاندان اور ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور انہوں نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ آیت کے ظاہر حتیٰ اسکے اشارات کے لحاظ سے بھی کسی بنیاد کی حامل نہیں۔

۹

فن اور ہنر کے احکام

فن اور ہنر کے احکام

سوال: ذرائع ابلاغ (ریڈیو، ٹیلی ویژن، پکچر وغیرہ) کس صورت میں جائز ہیں اور کس صورت میں نا جائز؟

جواب: ذرائع ابلاغ کے بارے میں حکم، اُس نشریاتی مواد اور مضمون کے اعتبار سے جدا جدا ہوتا ہے جو اِن سے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اِن سے نشر ہونے والے پروگراموں کا مضمون اور مواد، اسلام کی خدمت اور انسانوں میں علم و دانش، ادب و اخلاق کے فروغ کیلئے ہو، اور ان انسانی مقاصد کو جامۂ عمل پہنانے والا ہو جنہیں خداوندِ عالم انسانی حیات کیلئے پسند کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اِن ذرائع کا استعمال ضروری ہے۔ بلکہ لوگوں کو شعور دینے، ان کی اصلاح و رہنمائی اور انہیں خدا کی طرف دعوت دینے کیلئے واجب ہے۔

لیکن اگر ان کا مواد باطل امور، کفر اور فسق و فجور پر مشتمل ہو، اور انسانوں کے اندر سے معنویت اور انسانی شخصیت کے خاتمے کا باعث اور ظلم و ظالمین اور استکبار اور مستکبرین کی مدد کا ذریعہ ہو، تو ظاہر ہے کہ ان ذرائع و وسائل سے استفادہ حرام ہے۔

اسلام جدید ذرائع و وسائل کے بارے میں نہ ہی مطلق منفی موقف اختیار کرتا ہے اور

نہ ہی مطلق مثبت موقف اپناتا ہے۔ کیونکہ ضروری نہیں کہ اِن وسائل و ذرائع کی خاصیت حرام ہی ہو' بلکہ اِن سے نشر ہونے والے پروگراموں کے لحاظ سے اِن کے بارے میں مختلف حکم دیئے جاتے ہیں۔

سوال: کیا ایک دیندار شخص کیلیئے فنکاروں کے ایک ایسے گروہ کے ساتھ مل کر کام کرنا جائز ہے جو فسق و فجور میں مشہور ہے؟ یعنی اِس طرح کہ وہ فقط اپنا کردار ادا کرے اور اِس گروہ میں موجود خرابیوں میں حتیٰ الامکان مبتلا نہ ہو؟

جواب: یہاں دو نکتے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ: ایسا شخص گمراہ کن ماحول اور فسق و فجور سے قربت کی صورت میں اِن سے اپنے متاثر ہونے کے امکان کا جائزہ لے۔ اگر اُسے اِس بات کا خوف محسوس ہو کہ اِس گمراہ ماحول کے زیر اثر وہ بھی گمراہی کا شکار ہو جائے گا' تو اُسکا ایسے ماحول میں جانا جائز نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ: فلم یا ڈرامے وغیرہ میں جو کردار اس کے سپرد کیا گیا ہے اُس کا جائزہ لے' اسکے متعلق چھان بین کرے۔ اگر وہ صحیح' تعمیری' اصلاحی اور رہنمائی کرنے والا کردار ہو' تو اُسے ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اگر اس کردار میں اُسکا کام کرنا فلم یا ڈرامے سے ابھرنے والے تاثر کے نتیجے میں اسلامی فکر اور اسکی تعلیمات سے متصادم فکری' روحانی یا عملی فساد میں مددگار بنتا ہو' تو اِس عمل میں شرکت جائز نہیں' چاہے اُسکا اپنا کردار مختصر اور مثبت ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: اس پہلے سوال کی روشنی میں' کیا ایسے کردار کی اداکاری کی جاسکتی ہے جو اسلامی عقیدے کا مخالف ہو؟

جواب: اگر یہ کردار دوسرے فرد کے مثبت کردار کو مکمل کرتا ہو' تو اِسے ادا کرنے میں کوئی

مضائقہ نہیں۔ جیسے فلم یا ڈرامے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوجہل کے درمیان ہونے والی گفتگو میں آنحضرتؐ سے گفتگو کیلئے بالآخر کسی کو ابوجہل کا کردار کرنا پڑے گا۔ یہ عمل درحقیقت اسلامی تعلیمات کی زندہ تصویر پیش کرنا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی کافرانہ تعلیمات کی تائید اور اُن کی تاکید کیلئے کافر کا کردار ادا کرے، تو یہ عمل جائز نہیں ہے۔

سوال: کیا فلم یا ڈرامے میں انبیاؑ یا ائمہؑ کا کردار ادا کرنا جائز ہے؟ بالخصوص جب یہ اسلام کی خدمت اور اسکی طرف لوگوں کو دعوت دینے کی غرض سے ہو؟

جواب: یہ عمل عنوانِ اوّلی کے لحاظ سے کسی طرح شرعی طور پر ناپسندیدہ نہیں ہے۔ یعنی بنیادی طور پر کسی بزرگ دینی شخصیت کی شکل وصورت کو مصوری یا اُن کا کردار ادا کر کے مجسم کرنا، حرام نہیں ہے۔ کیونکہ اِس عمل کی حرمت کے بارے میں ہمارے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ لیکن یہ مسئلہ عنوانِ ثانوی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں جس مسئلے کا ہمیں سامنا ہے، وہ یہ ہے کہ کیا اِن مقدس شخصیات کے چہروں کی تصویر بنانا، لوگوں کو انہیں دکھانا اور عام معاشرے میں ان کا کردار ادا کرنا ان شخصیات کی اہانت اور بے ادبی شمار ہوتا ہے؟ کیا یہ معاشرے میں ان کے تقدس واحترام کو کم کرنا قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا کسی متعین فنکار کا پیغمبر اسلامؐ یا امامِ معصومؑ کا کردار ادا کرنا عام لوگوں کی نظر میں اِن ہستیوں کی ہتکِ حرمت کا موجب ہے؟ اگر یہ عمل اُن کی ہتکِ حرمت کا باعث ہو، تو عنوانِ ثانوی کی بنیاد پر جائز نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان کا کردار ادا کرنا عنوانِ اوّلی کی رو سے حرام نہیں ہے۔ البتہ مسئلہ یہ ہے کہ فلاں فلم یا ڈرامے میں پیغمبر کی شخصیت کا اظہار ان کی اہانت شمار ہوگا یا نہیں؟ اگر عرفِ عام میں اہانت شمار ہو، تو اسے ادا کرنا جائز نہیں، حتیٰ اگر حقیقت میں بے ادبی اور اہانت نہ ہو، تب بھی۔

سوال: فلم میں مرد کے ذمے کردار کے تقاضے کے تحت' کیا اسکا نامحرم عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے؟

جواب: واضح بات ہے کہ یہ عمل حرام ہے۔ اور اگر مصلحت اس کی انجام دہی کا تقاضا کرے' تو نائلون کا ایسا شفاف (transparent) دستانہ استعمال کرنا چاہئے جس سے یہ ظاہر ہو کہ براہِ راست بغیر کسی رکاوٹ کے مصافحہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو درمیان میں رکھے بغیر مصافحہ کرنا حرام ہے۔ اور اگر مصافحے میں ایک دوسرے کا ہاتھ براہِ راست نہ ملے اور کوئی عنوانِ ثانوی بھی حرمت کا موجب نہ ہو' تو حرام نہیں۔

مجسمہ سازی اور مصوری

سوال: مجسمہ سازی کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ مجسمہ خریدنے اور اسے رکھنے کے بارے میں حکم کیا ہے؟

جواب: مجسمہ سازی کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ احتیاطِ واجب ہے کہ اسے ترک کیا جائے۔ ہم نے اِس عمل کی حرمت کے بارے میں فتویٰ نہیں دیا ہے۔ اِس عمل کی حرمت احتیاطِ واجب کی حد تک ہے۔ لیکن اِنہیں رکھنے' اِن سے کھیلنے اور اِن سے کسی بھی قسم کا استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ ہمیں نصوص اور دلائل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صرف مجسمہ سازی حرام ہے' مجسموں سے کسی بھی قسم کا استفادہ حرام نہیں ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ: بان من صور صورة او مثّل مثالاً كُلف ان ينفخ فيه يوم القيامة وليس بنا فخ (ایسا شخص جو کسی چہرے کی تصویر بنائے' یا کسی جسم کا مجسمہ تراشے روزِ قیامت اُسے حکم دیا جائے گا کہ وہ اِن میں روح پھونکے۔ لیکن وہ ان میں روح نہیں پھونک سکے گا) اِس قسم کی احادیث جسم تراش اور مجسمہ ساز افراد کے بارے میں ہیں۔ کیونکہ یہ عمل خالق سے ایک قسم کی شباہت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اور ایسا شخص جب یہ دیکھتا ہے کہ اِسکے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز' فن و ہنر کے اختراعی نمونے کے طور پر پہچانی جارہی

ہے، تو اِس میں خالقیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے اِن اشیا کی خرید وفروخت، انہیں اپنے پاس رکھنے اور اِن کے شرعی استعمال کی اجازت کا فتویٰ دیا ہے، اور ہمارا فتویٰ بھی یہی ہے۔

سوال: کیا آدھے جسم کا مجسمہ بنانے کا حکم بھی وہی ہے جس کا اظہار آپ نے اوپر بیان شدہ مسئلے میں کیا ہے؟

جواب: جو چیز حرام ہے وہ مکمل انسان کا مجسمہ بنانا ہے۔ البتہ آدھے جسم کا مجسمہ، جس میں انسان کو بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہو، یا جو اُسکے آدھے جسم کو چھپا ہوا ظاہر کرے، گویا وہ دیوار کے پیچھے یا پانی میں یا کسی اور چیز کے پیچھے چھپا ہوا ہے، تو یہ بھی حرمت یا اُسکے ترک کرنے میں احتیاطِ واجب میں شامل ہے۔

لیکن اگر انسان کے آدھے جسم یا اُس کے کسی جز کو مجسے کی صورت میں بنائیں، جیسے سر کا مجسمہ یا تن سے اوپری حصے کا مجسمہ۔ اور وہ مجسمہ ایسا ہو کہ پورے انسان کا مجسمہ نہ سمجھا جائے، بلکہ عرفاً اسے انسان کا نامکمل جسم شمار کیا جائے، تو اسے بنانے میں کوئی حرج نہیں۔

سوال: مصوری، کیمرے کے ذریعے کھینچی گئی تصاویر اور وہ اسلامی نقوش جن پر آیاتِ قرآنی اور اسمائے الٰہی تحریر ہوں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: ہم ہاتھ سے بنائی ہوئی، کیمرے سے کھینچی گئی یا کسی اور طرح بنائی گئی تصویر کو حرام نہیں سمجھتے۔ کیونکہ حرمت کی دلیلیں اِس قسم کی تصاویر کو اپنے دائرے میں نہیں لیتیں۔ لیکن وہ نقوش جو تصویر سے یکسر کوئی ربط نہیں رکھتے، وہ ہر شکل میں جائز ہیں اور اُن میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

فنکاروں کا پرستار (fan) ہونا

سوال: جوان اور نوجوان عام طور پر فنکاروں کیلئے محبت اور پسندیدگی کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں' ان کے کاموں پر تعجب ظاہر کرتے ہیں' ان کی تصویریں اپنے پاس رکھتے اور اپنے کمرے کی دیواروں پر لگاتے ہیں۔ اس حوالے سے آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ہم اِس عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے' ہر چند اگر ایسا کرنے میں کسی حرام عمل کی حوصلہ افزائی اور تائید نہ ہو رہی ہو' تو اِسے حرام بھی نہیں سمجھتے۔

ہماری طرف سے اس عمل پر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حرام کاموں کے مرتکب ہونے والے افراد کے بارے میں ایسے جذباتی اور والہانہ احساسات کا اظہار انسان کے نفس کو حرام عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: ان لکل ملک حمی' وحمی اللہ محارمه' فمن وقع حول الحمی' اوشک ان یقع فیه (ہر ملک کی ممنوعہ سرحد ہوتی ہے' حرامِ خدا اسکی ممنوعہ سرحد ہے' جو کوئی خدا کی اس ممنوعہ سرحد کے اردگرد گھومے گا' اسکے اس سرحد میں داخل ہو جانے کا امکان ہے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۲۷۔ ص ۱۶۷۔ روایت ۳۳۵۰۷)

اس سے بھی ہٹ کر دیکھیں تو مومن پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے اور نہی عن المنکر کا ایک ذریعہ بُرائی پر ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اور اِن افراد کے بارے میں پسندیدگی اور اِن سے والہانہ محبت کے احساسات کا اظہار' ان کے عمل سے ایک طرح کی خوشی اور یگانگت ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ لوگ حرام موسیقی کی وجہ سے (حرام گانے والے) گلوکاروں کو پسند کرتے ہیں اور غیر شرعی پروگراموں کے ذریعے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لہٰذا اِس قسم کے افراد کی تصویریں اپنے پاس رکھنا اور اِن کی تعریف وستائش کرنا' برائی یعنی منکر کی تائید کے مترادف ہے۔

فلاحی مقاصد کیلئے پروگراموں کا انعقاد

سوال: بعض فنکار رقص وموسیقی کی ایسی محفلوں یا ڈراموں کا انعقاد کرتے ہیں جن کی آمدنی فلاحی کاموں یا آفات میں مبتلا لوگوں کی مدد کیلئے صرف کی جاتی ہے۔اس بارے میں شرع کا حکم کیا ہے؟

جواب: حرام ذرائع سے خیر کا حصول جائز نہیں ہے۔اگر موسیقی وغیرہ حرام ہو تو حتیٰ اچھے مقصد کیلئے بھی اسکی محفل کا انعقاد جائز نہیں۔ کیونکہ جس عمل سے خدا کی نافرمانی ہوتی ہو اس کے ذریعے اسکی اطاعت ممکن نہیں۔

لیکن جو موسیقی حلال ہے۔یعنی جس موسیقی کا مضمون حلال ہے اور جو فسق وفجور کے ماحول اور محفل سے مناسبت نہیں رکھتی اور جس کے ہمراہ کوئی حرام عمل انجام نہ دیا جائے، وہ جائز ہے، چاہے محفل فلاحی کاموں کیلئے منعقد کی گئی ہو یا کسی اور مقصد کیلئے۔

فنکار خواتین اور پردہ

سوال: ان دنوں فنکاروں کے تائب ہونے اور ان کے پردے کا پابند ہونے کا رجحان عام ہوا ہے۔بعض لوگ اس مسئلے کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہیں۔ اِس بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے اور توبہ سے پہلے کی اِن فنکاروں کی فلموں اور تصویروں کو دیکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: اسلامی تعلیمات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان مرد یا عورت تائب ہونے کا اظہار کرے اور اسکا حال اسکے نیک ہو جانے کی نشاندہی کرے، تو شرعی لحاظ سے اس کے ایمان اور پابندِ دین ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا ظاہری اچھائی کو انسان کی عدالت کے ثبوت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ حدیث میں بھی آیا ہے: من عامل الناس فلم یظلمهم، ووعدهم فلم یخلفهم، وحدثهم فلم یکذبهم،

فھو ممن کملت مروءته وظھرت عدالته' ووجبت اخوته' وحرمت غیبته... (جس کسی نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ انصاف کیا' اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہ کی' اور راست گو رہا' تو ایسے شخص کی مردانگی کامل' عدالت آشکارا ہے اور اس سے بھائی چارگی کا برتاؤ واجب اور اسکی غیبت حرام ہے۔ وسائل الشیعہ ۔ج ۲۷۔ص ۳۹۶۔روایت ۳۴۰۴۶)

لہٰذا اِس مسئلے کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہونے اور اِس اچھے رجحان کے حوالے سے منفی موقف اپنانے کی کوئی وجہ نہیں ۔ بلکہ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ خراب اور گندے ماحول کے بیچوں بیچ رہنے والے انسان کیلئے بھی اِس بات کا امکان موجود ہے کہ اسکے دل میں ایمان بیدار ہو جائے۔ایسا شخص فریب اور گمراہی کا پردہ چاک کر کے اپنی حالت تبدیل کرسکتا ہے' بیہودگی اور گمراہی کے خلاف بغاوت کر کے خدا کی طرف پلٹ سکتا ہے۔ہماری ذمے داری ہے کہ ہم اِس رجحان کی حوصلہ افزائی کریں اور حوصلہ افزائی کے مختلف طریقے اختیار کر کے ایسے لوگوں کی معاونت کریں۔

ہاں' انسان اس عمومی فضا میں کچھ احتیاط سے کام لے سکتا ہے' تا کہ ان کی حالت اور کیفیت کے بارے میں جو کمزور احتمالات پائے جاتے ہیں اُن سے اجتناب کرے۔(البتہ اپنے اِس احتیاط کو اُن سے بے اعتمادی کی صورت میں ظاہر نہ کرے) اسلئے کہ بے اعتمادی اور احتیاط کے درمیان فرق ہے۔

رہی بات توبہ اور پردے کی پابندی کے بعد ان کی پرانی فلموں اور تصویروں کو دیکھنے کی' تو اِن فلموں کی دو قسمیں ہیں۔یا تو وہ بیہودہ مناظر پر مشتمل ہیں' جنہیں دیکھنا اگر ہیجان انگیز اور گمراہی کا باعث ہو تو مطلقاً حرام ہے۔اور اِس مسئلے میں فنکاروں کے توبہ کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا یہ کہ وہ بیہودہ مناظر پر مشتمل نہیں لیکن اِن میں وہ اداکارائیں معمولی یا غیر معمولی اور غیر ہیجان انگیز انداز میں بے حجاب حالت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ایسی فلموں کو دیکھنا جائز ہے' کیونکہ پردہ دار عورت کی بے پردہ تصویر اس صورت میں

دیکھنا حرام ہے جب اِس عمل سے اِس کی ہتکِ حرمت ہوتی ہو۔ لیکن جب ہم اِس قسم کی خواتین کی اِن کی توبہ سے پہلے کی تصویر دیکھتے ہیں اور توبہ سے پہلے اور توبہ کے بعد اِن کی حالت کا موازنہ کرتے ہیں، تو ہماری نظر میں اِن کے احترام اور قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

سوال: اِس قسم کی گلوکاراؤں کی آوازوں کو سننے کا کیا حکم ہے؟
جواب: اصولاً فسق و فجور اور لہو ولعب کے ماحول سے مناسبت رکھنے والے گانے سننا جائز نہیں، چاہے گلوکاراؤں نے توبہ کر لی ہو یا توبہ نہ کی ہو۔

سوال: ڈراموں اور فلموں میں عورتوں کے کام کرنے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اِس بارے میں آپ گھرانوں کو کیا نصیحت کریں گے۔
جواب: اصولاً ہم اِس عمل کو حرام نہیں سمجھتے، اگر اداکاری کا ماحول، ملبوسات اور جس کردار کو ادا کیا جا رہا ہے وہ شرعی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ کیونکہ دعوت کی راہ میں ایسی مصلحتیں موجود ہیں جن کا تقاضا ہے کہ صدرِ اسلام میں اسلام کی طرف دعوت دینے والی خواتین اور اسلام کی دعوتی تحریک کے مناظر اور اِسی طرح کی دوسری چیزوں کی تصویر کشی کی جائے۔ اِن موضوعات پر ویڈیو فلمیں بنا کے اُن کی نمائش کے ذریعے لوگوں سے ارتباط قائم کیا جا سکتا ہے اور لوگوں میں اسلامی عقیدہ پیدا اور اسے قوی بنایا جا سکتا ہے۔

اسلامی معاشرے کے بنیادی مسائل و مشکلات کے بارے میں لوگوں کے درمیان آگہی پیدا کرنے کی غرض سے ڈرامے اور فلمیں تیار کر کے، نیز معاشرے کو اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے آگاہ کرنے کیلئے ابلاغ کے دوسرے موثر ذرائع سے استفادہ کر کے عظیم نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں بعض حالات میں عورتوں کی موجودگی ضروری دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ فنی سرگرمیوں کے میدان میں عورتوں کی

ذمے دارانہ موجودگی میں کوئی حرج نہیں ۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ تربیتی' ثقافتی اور اجتماعی ضروریات ان میدانوں میں خواتین کی موجودگی کا تقاضا کرتی ہیں' اور ان کی موجودگی کے بغیر مثبت نتائج کا حصول ممکن نہیں ہم خواتین کی (مذکورہ شرائط کے ساتھ) اِن میدانوں میں موجودگی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

طرب و غنا

سوال: اسلامی مفہوم میں ''طرب'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: اسلام کی نظر میں ''طرب'' بذاتہ حرام نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی انسان کیلئے نہروں' دریاؤں اور چشموں سے بہنے والے پانی کی آواز' پرندوں کی نغمہ سرائی اور کبھی کوئی ادبی فن پارہ طرب ناک ہو جاتا ہے۔

فضول (لہو) بیہودہ اور انسانی نفس کو بھڑکانے والی موسیقی کے ذریعے انسان میں پیدا ہونے والا طرب حرام ہے۔ طرب سے مراد وہ غیر شعوری حرکت ہے' جو کبھی کبھی انسانی بدن سے سرزد ہوتی ہے اور اِس حال میں انسان محسوس کرتا ہے کہ اسکے حواس' احساسات اور اعضائے جسمانی اِس طرح حرکت میں ہیں گویا وہ رقص کر رہے ہیں۔

ہم بعض دوسرے لوگوں کے برخلاف طرب کو غنا (موسیقی) کے حلال اور حرام ہونے کے درمیان حدِ فاصل نہیں سمجھتے۔ اور صرف اس غنا (موسیقی) کو حرام سمجھتے ہیں جس کا مضمون و مواد گمراہی اور فساد سے مناسبت رکھتا ہو۔ لہٰذا اگر انسان میں کسی ایسے نغمے سے خفیف یا شدید طرب پیدا ہو جس کے اشعار کلامِ حق پر مشتمل ہوں' مثلاً جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح کی گئی ہو یا اسلامی تحریک' جہاد و شہادت اور سیاسی شعور کے بارے میں گفتگو ہو' تو ایسا طرب حرام نہیں ہے۔

سوال: صوفیا جن محافل کا انعقاد کرتے ہیں وہ اسی طرح کی ہوتی ہیں جن کا آپ نے تذکرہ

کیا ہے۔ کیا آپ سماع کی ان محفلوں کو اسلامی فن (art) سمجھتے ہیں جس کی حوصلہ افزائی اور جس کے ساتھ تعاون کیا جانا چاہیے؟

جواب: اگر اسلامی فن (art) سے مراد کتاب و سنت اور دوسرے شرعی مصادر (sources) سے ماخوذ فن ہو، تو ہمیں اسلام کی طرف سے کوئی ایسی تعلیم نظر نہیں آتی جو اِس انداز سے عبادتِ الٰہی کی تاکید کرتی ہو۔ پس اِن محفلوں کو اصولِ شرع کے تابع ہونا چاہیے اور انہیں چاہیے کہ اپنی ہر قسم کی سرگرمیوں کو شرعی اصولوں سے ہم آہنگ کریں۔

البتہ جو کچھ ہم ان محفلوں کے بارے میں جانتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اِن اعمال میں کوئی شرعی مضائقہ نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اِن اعمال اور ایسی محفلوں کی حوصلہ افزائی میں احتیاط سے کام لیں۔ کیونکہ اِن میں سے کچھ اعمال انسان سے صادر ہونے والی حالت، اسکی پسماندگی اور لاشعوری طور پر بے خودی کی علامت ہے اور یہ حالت خداوندِ عالم کی بارگاہ میں تضرع وزاری کی حالت میں بھی شعور و آگہی (کی تاکید) سے مطابقت نہیں رکھتی۔

سوال: بعض غیر معمولی مشقوں جیسے جسم میں شیشہ داخل کر لینے جیسے کاموں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ہمارے خیال میں یہ امور حقیقت نہیں رکھتے اور ایک قسم کی نظر بندی ہے۔ بہر حال ایسے اعمال اسلام کی معنوی فضا اور معتدل و متوازن حالت سے مناسبت نہیں رکھتے۔

سوال: اسمائے جلالہ اور آیاتِ قرآنی کو زیب و زینت کے ساتھ لکھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ ان کو چھونے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ زیب و زینت دینے والے ذرائع کا استعمال اِن مفاہیم کی جانب انسان کی توجہ اور رغبت میں اضافہ کرتا ہے۔ اِن کو چھونے کا حکم بھی غیر تزئین شدہ حالت میں اِن کے چھونے کے حکم سے مختلف نہیں۔

سوال: آواز کو لچکدار بنا کر اور ہیجان انگیز انداز میں تجوید اور قرأتِ قرآن کے آج کل رائج طریقوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ہماری رائے میں تجوید اور قرأتِ قرآن کے تمام طریقے، حتیٰ غنا کے انداز میں بھی جائز ہیں۔ کیونکہ ہم اِس غنا کو حلال سمجھتے ہیں جس کا مضمون حق پر مشتمل ہو۔ چہ جائیکہ غنا کا مضمون کلامِ الٰہی ہو۔ البتہ موسیقی کا آہنگ ہیجان انگیز ماہیت کا حامل نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ یہ چیز قرآنِ مجید کے تقدس سے مناسبت نہیں رکھتی۔

ہمارے خیال میں لچکدار (گٹکری دار) آواز میں چھپی موسیقی اِس کے فکری مضمون کو انسان کے شعور کی گہرائیوں میں بٹھا دیتی ہے۔ جس قدر آواز اور لحن خوبصورت، دل نشین اور موثر ہوں گے اسی قدر ان کے معنی و مفہوم کا انسان کو گہرا ادراک ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم کلامِ باطل پر مشتمل (غنا) موسیقی کو حرام سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اسکے باعث انسان کے احساس اور شعور میں باطل جڑ پکڑتا ہے۔ جبکہ کلامِ حق پر مشتمل موسیقی (غنا) انسان کے احساس و شعور میں حق کے جڑ پکڑنے کا باعث ہوتی ہے۔

ہم اِس اسلامی فن کے فروغ اور اس کے مقابلوں کے انعقاد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ حتیٰ ان سرگرمیوں میں ہمکاری اور تعاون کی استطاعت بھی رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ لحن اور آواز کلام اور مضمون پر حاوی نہ ہو جائے اور ایسے مقابلوں کی فضا، قرآنی فضا ہو۔

سوال: کیا شرعی قوانین کی پابندی کے ساتھ مرد یا عورت کا موسیقی یا رقص کو اپنا پیشہ بنانا جائز ہے؟

جواب: رقص کے مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ کچھ علما رقص کو اس وجہ سے حرام سمجھتے ہیں کہ یہ لہو ہے اور ہر لہو حرام ہے۔ کچھ علما کے خیال میں غنا بھی ہر صورت میں حرام ہے، چاہے کلامِ حق پر مشتمل ہو یا باطل کلام و مضمون پر مشتمل۔

جبکہ بعض علما رقص کو اس شرط کے ساتھ حلال قرار دیتے ہیں کہ اِس سے نفسانی

خواہشات نہ بھڑکیں اور غنا کو اِس صورت میں حلال سمجھتے ہیں جب وہ کلامِ حق پر مشتمل ہو۔

لہٰذا آراء و نظریات میں اس اختلاف کے پیشِ نظر، عورتوں کے اجتماع میں عورت کے رقص کرنے اور مردوں کے سامنے مرد کے رقص کرنے کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ بعض فقہا اسے حلال سمجھتے ہیں، البتہ اِس بات پر تاکید کے ساتھ کہ اِن دونوں کا خود اپنے اپنے اجتماع میں رقص کرنا بھی شہوانی خواہشات کو بھڑکانے والا نہ ہو۔ اس سلسلے میں ہماری رائے بھی یہی ہے، جو بنیادی طور پر ہمارے استاد آیت اللہ خوئیؒ کی رائے کے موافق ہے۔

رہی بات رقص کو پیشہ بنانے کی، تو عمومی اسلامی مزاج کی بنیاد پر یہ عمل کچھ حضرات کی نظر میں شرعی مبانی اور عمومی اسلامی فضا سے سازگار اور ہم آہنگ نہیں۔ کیونکہ ہم بعض امور کو ان کی حرمت پر کوئی دلیل نہ رکھنے کی وجہ سے حلال سمجھتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے یہی امور معاشرتی حالات اور خاص صورتحال میں عنوانِ ثانوی کے تحت حرام ہو جائیں۔ اسی طرح ہم نے اسلامی سیرت کے مطالعے کے دوران کسی ایسے مرد یا عورت کو نہیں پایا جس نے رقص کو اپنا پیشہ بنایا ہو۔ اسلئے ایسے اعمال ہمارے زمانے میں بھی عناوین ثانوی کے تابع ہیں۔ لہٰذا ممکن ہے اِس مرحلے میں ان کی حرمت کے متعلق رائے دی جائے۔

ممکن ہے مستقبل میں مسلمانوں کے حالات اِس نہج پر پہنچ جائیں کہ ایسے اعمال معاشرے میں قبولیت پیدا کرلیں، یا مسلمان غیر شرعی فنون سے مقابلے کی خاطر ایسے فنون کو حدودِ شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے اختیار کریں۔ اور اِن کی دلیل یہ ہو کہ اس میدان میں موجود خلاء انحراف اور گمراہی کا موجب ہو رہا ہے۔

لہٰذا بعض مراحل اور حالات میں مذکورہ موضوع کے حلال قرار دیئے جانے کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن اِس بارے میں مطلق اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ اِس مسئلے اور دوسرے مسائل میں اسلام کے عظیم تر مفادات اور مصلحتوں کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

سوال: شادی یا سالگرہ کی مناسبت سے خوشی کی محفلوں کے انعقاد کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے' جبکہ ان محفلوں کے دوران موسیقی اور غنا بھی ہو؟

جواب: ہمارا کہنا ہے کہ خوشی اور سرور کی ایسی محفلیں جن میں لوگ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں' ہماری ضرورت ہیں۔ ہم (ایسی تقریبات کے جواز کے فتوے سے ہٹ کر) ایسی محفلوں میں شرکت پر لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' جو چند لمحوں کیلئے ہی سہی اُن کے غم واندوہ اور مصائب کو کم کرتی ہیں۔ البتہ اِس شرط کے ساتھ کہ خوشی کی اِن محفلوں میں ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جن سے خدا ناراض نہ ہو۔

اسلامی تاریخی واقعات پر مبنی ڈراموں کی تیاری

سوال: واقعہ عاشورا کو اسٹیج کرنے اور ایسی فلمیں بنانے کا حکم کیا ہے جن میں کچھ افراد اس واقعے میں موجود شخصیات کا کردار ادا کریں؟

جواب: ظاہر بات ہے کہ عوام کی دینی روح' ثقافتی ذہنیت اور سیاسی تحرک سے تعلق رکھنے والی ہر مناسبت (مثلاً عاشورا) کو زمانے کی ترقی اور ابلاغ کے جدید ذرائع کی مناسبت سے پیش کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ کسی بھی نظریے کو انسانی وجدان اور اسکے شعور کی گہرائیوں میں اتارنے کیلئے اُسے ایسے ذرائع سے پیش کرنا چاہیے جو انسانی شعور' ادراک اور اسکے وجدان سے تعلق رکھتے ہوں۔ کیونکہ انسان کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ زمانے کے ترقی یافتہ ذرائع کے ذریعے دوسروں کے افکار اسکی عقل میں داخل ہوتے ہیں' اور اس راستے سے اسکے عقائد بنتے ہیں۔

لہٰذا ہم مجالسِ عزائے حسینؑ (جو ہر دور میں اور ہر خطہ زمین پر عوامی سطح پر عظیم مثبت نتائج کی حامل رہی ہیں) کے روایتی طریقوں سے انعقاد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ عزاداری کو اسکے طریقوں اور پیغام رسانی وغیرہ کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ بنانے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ واقعۂ عاشورا کو اسٹیج کرنے کا جو طریقہ رائج ہے' اُس میں اکثر مواقع پر انتہائی خام صورت میں اس واقعے کو صرف ایک حادثے کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جس میں نہ گہرائی ہوتی ہے نہ آفاقیت وتحرک اور نہ ہی عاشورا کے مفاہیم اور پیغامات۔ اور انہیں دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اِن میں واقعات کو اِن کی روح کے بغیر پیش کیا گیا ہے۔ اور اگر کسی پر یہ اسٹیج اثر انداز ہوتا بھی ہے' تو صرف اسکے مصائب کی وجہ سے۔

لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ عاشورا کو ہمارے دور سے متعلق (relate) کیا جائے۔ عاشورا جن اقدار کی طرف دعوت دیتا ہے اُن کے ذریعے معاصر انسان سے اسکا رابطہ قائم کیا جائے اور عاشورا میں موجود مصائب کے ذریعے اِن اقدار کو انسانی شعور کی گہرائیوں میں اتارا جائے۔

واضح سی بات ہے کہ اِس قسم کے نتائج کے حصول کیلئے جو عاشورا کو شیعی اور اسلامی پہلو کے علاوہ اسے انسانی اور آفاقی رخ بھی دیں ہمیں عاشورا سے متعلق اسٹیج ڈراموں اور فلموں کیلئے ڈائیلاگ' اسکرپٹ' ڈائریکشن اور اداکاری کے شعبوں میں تخلیقی اور فنی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔

سوال: ایسی مشہور فنکارہ جس نے فلموں میں خلافِ شرع کردار ادا کئے ہوں' کیا وہ حضرت زینبؑ کا کردار (role) ادا کر سکتی ہے؟ یا اِس کردار کیلئے اداکارہ کا خاص صفات اور خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے؟

جواب: ہاں' یقیناً کر سکتی ہے' بالخصوص اس وقت جب وہ اس کردار میں ایسی اداکاری کرے جس میں حضرت زینبؑ کی شخصیت کی ایک ایسی شیر دل مسلمان خاتون کے بطور حفاظت کی گئی ہو جس کے بارے میں انسانی شعور و وجدان میں انتہائی قدر و تعظیم پائی جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اس کردار کو کس انداز سے ادا کرتی ہے۔

سوال: آپ دیندار فنکاروں کو شعائر حسینی کے موضوع پر فلموں، ڈراموں اور اسٹیج پروگراموں کی تیاری کی دعوت دیتے ہیں۔ کیا آپ کی اس دعوت کو بعض فقہا کے شدید اعتراض کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، جو اِن چیزوں کو ایک طرح سے عرف و عادت کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں؟

جواب: ہم نہیں سمجھتے کہ ایسے آگاہ اور عصری تقاضوں سے باخبر فقہا، جو جانتے ہیں کہ اسلامی افکار، اسلامی تحریک اور اسلامی شریعت کی ترویج و اشاعت کیلئے جدید ذرائع و وسائل سے استفادہ کیا جانا چاہئے، وہ ایسے فنی ذرائع و وسائل اور انداز و اسالیب کی مخالفت کریں گے جو اسلامی روح سے ہم آہنگ ہوں۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ بعض افاضل، یا حتیٰ عام لوگ ایسے ہیں جنہیں ہر نئی چیز گراں گزرتی ہے اور ہر نیا قدم انہیں مضطرب کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ یہ نئی چیزیں ان کے حالات کو دگرگوں کر دیں گی یا انہیں زحمت میں ڈال دیں گی۔ لیکن ہم اِس بات کے معتقد ہیں کہ نئی فکر اور نیا ماحول پیدا کرنے والوں کو مخالفین کے حملوں کے مقابل صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عرف ہی سب کچھ نہیں اور بذاتہ اسے کوئی قداست حاصل نہیں۔ خداوندِ عالم قرآنِ مجید میں انسانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ عادات کے اسیر نہ ہوں، ان کے بارے میں غور و فکر کریں، اور اگر انہیں نامناسب پائیں تو مسترد کر دیں، اور اگر مناسب سمجھیں تو قبول کریں اور انہیں گہرائی دیں: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ. قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اِس پر پیغمبر نے کہا کہ چاہے اس سے بہتر ہدایت لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے پیغام کے ماننے والے نہیں ہیں۔ سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۳، ۲۴)

لہٰذا ہم اِن رسومات کو مقدس نہیں سمجھتے جن کا لوگوں نے خود کو عادی بنا لیا ہے۔ لیکن ہم پر لازم ہے کہ اسلامی اصولوں سے اختلاف نہ رکھنے والی پیشرفت اور جدّت کو قبول

کریں، اسکے قدم سے قدم ملا کے چلیں۔ اور ہم نہیں سمجھتے کہ تحریکِ عاشورا کی پیشکش کے طریقوں میں یہ جدّت اسلامی اصولوں سے کوئی تصادم اور ٹکراؤ رکھتی ہے۔

سوال: شعائرِ حسینی کے احیا کے ساتھ ساتھ زمانے کے مطابق ان کے انداز اور طریقوں میں تبدیلی لانا ایک اہم اقدام ہے۔ لیکن کیا اس بات کا امکان نہیں کہ تبدیلی کے اس عمل کو آئندہ نسل اس طرح آگے بڑھائے کہ اس میں افراط اور حد سے گزر جائے اور دوسرے اسلامی مفاہیم میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے لگے؟
جواب: ہماری گفتگو شعائرِ حسینی کو پیش کرنے کی صورتوں کے بارے میں ہے، اسلامی افکار کے بارے میں نہیں۔ اسلامی افکار کا حقیقی اور اصلی مضمون و مواد ثابت اور لامتغیر ہے۔ لیکن اس میں بھی اجتہادی عمل جاری ہے۔ یعنی مضمون و مواد کے فہم و ادراک اور فکر کے سامنے نئے دریچے کھل جانے کے باعث موضوع متغیر ہو جانے کے نتیجے میں ممکن ہے نئے عناوین پیدا ہوں۔ لہٰذا ہم صرف اس وجہ سے تغیر و تبدل اور جدّت سے خوف نہیں کھاتے کہ اس کا باب کھلنا ممکن ہے اسلام کے بنیادی خطوط سے تجاوز پر منتہی ہو۔ کیونکہ ہم اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر بیدار اور عصری مسائل سے آگاہ اور ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھنے والے علما کا ایک گروہ ہر دور میں اپنے فریضے پر عمل کرے، تو ان کی یہ فعالیت انحراف سے بچاؤ کی ضمانت ہوگی۔

سوال: ڈرامے کی فنی ضروریات تقاضا کرتی ہیں کہ اسکا اسکرپٹ معمول سے زیادہ بڑھا چڑھا کر تحریر کیا جائے اور یہ عمل اصل متن میں تبدیلی کو لازم کر دیتا ہے۔ اِس مقام پر ڈرامے کے ڈائریکٹر کو تاریخی نص میں تغیر اور فنی لحاظ سے کمزور پیشکش میں سے کسی ایک چیز کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس مشکل کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟
جواب: جب نص کو پیش کرنے کا مقصد اِس نص کے مالک کی فکر اور نظریے کی بالیدگی اور

اسکی آفاقیت کو سامنا لانا ہو، تو ہم نص میں تبدیلی لانے کیلئے آزادیٔ عمل کے اِس حد تک قائل ہو سکتے ہیں جس حد تک اس فکر کے اصل مضمون اور مواد کے منافی نہ ہو۔

سوال: طویل زمانوں سے فقہا ڈرامے کو حرام قرار دیتے رہے ہیں، اب آپ اس کی دعوت دے رہے ہیں۔ کیا گزشتہ فقہا غلطی پر تھے؟

جواب: میں نہیں سمجھتا کہ فقہا نے ڈرامے کو ایک فنی کاوش کے معنی میں حرام قرار دیا ہو۔ شاید آپ کو ڈرامے اور مجسمہ سازی کے درمیان غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہاں، کچھ شیعہ اور سنّی فقہا نے مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ اس عمل کو (ہر چند غیر شعوری طور پر) دوگانہ پرستی سمجھتے ہیں۔ لیکن ڈرامے کو کسی نے حرام نہیں سمجھا ہے۔

سوال: اگر ڈائریکٹر غلط فنکاروں کا انتخاب کرے، تو کیا فنکار جن شخصیات کا کردار ادا کر رہا ہے، اُن سے اسکا مناسبت نہ رکھنا لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوگا؟ جیسے کوئی مقبول فنکار کسی بُری شخصیت کا کردار ادا کرے، تو کیا ڈرامے میں پیش کی گئی اچھی شخصیت سے زیادہ لوگوں کے درمیان پسندیدہ نہیں ہوگا؟

جواب: واضح بات ہے کہ جب ہم واقعۂ عاشورا کو ڈرامے یا فلم کی صورت میں پیش کرنے کی بات کرتے ہیں، تو بنیادی طور پر ہماری مراد ایک ایسا فن ہے جو تمام عناصر کے ساتھ مل کر اس تاریخی واقعے کی روح، حقیقت اور اسکے مثبت تاثرات کی تصویر کشی کرے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ فنکار کے انتخاب اور فنی کام کی کیفیت پر گہری نظر رکھی جانی چاہئے۔

سوال: آپ دوسروں کو عصری روح کے ساتھ ہمقدم ہو کے چلنے اور جدید تمدن سے ارتباط رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ اس حدیثِ رسول کی کیا تفسیر کریں گے جو کہتی ہے کہ حلالِ محمد تا قیامت حلال ہے اور حرامِ محمد تا قیامت حرام؟

جواب: یہ حدیث کہتی ہے کہ جس چیز کے حلال ہونے کا اعلان حضرت محمدؐ نے کیا ہے وہ روزِ قیامت تک حلال ہے اور جس چیز کو آنحضرتؐ نے حرام قرار دیا ہے وہ تا قیامت حرام ہے۔ لیکن بحث اس بارے میں ہے کہ ہم کسی چیز کے حلال ہونے کو کس طرح معلوم کریں۔ نص میں پوشیدہ مقصود و معنی کو سمجھنے کیلئے مجتہدین جو کوشش کرتے ہیں، اجتہاد کا یہ عمل مسلسل ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔

علاوہ از ایں، نئے پیدا ہونے والی عناوین موضوع کو تبدیل کر سکتے ہیں اور موضوع کے بدل جانے کے نتیجے میں اس کا حکمِ شرعی بدل جاتا ہے۔ مثلاً ہم سب جانتے ہیں کہ پانی پینا مباح ہے۔ لیکن اگر اِس پانی کا پینا انسانی زندگی کیلئے باعثِ خطر ہو، تو اِسے پینا حرام ہے۔ لہٰذا نص سے مراد اخذ کرنا ایک مسلسل جاری و ساری عمل ہے اور اجتہاد اسی عمل کو انجام دیتا ہے۔

پس نص کو سمجھنے اور اس سے مراد اخذ کرنے میں مجتہدین کا اختلاف اور موضوع پر اثر انداز ہونے والے عناوین کا مسلسل تغیر پذیر ہونا، عصری تقاضوں سے باخبر ہونے اور زمانے کی روح کے ہمقدم ہونے کی ضرورت پر دلیل ہے۔

سوال: اسلامی ڈراموں میں فنکار خواتین کے کردار کیلئے شرعی قواعد و ضوابط کیا ہیں؟ مثلاً اگر اسکے کردار کا تقاضا ہو کہ وہ نامحرم سے ہاتھ ملائے یا اس سے محبت بھری باتیں کرے، تو ایسی صورت میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: اسلامی ڈراموں، میں شریعت کے احکام و قوانین کی پابندی کی جانی چاہئے۔ لہٰذا کسی عورت کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر حجاب کے، یا گہرے میک اپ، زیب و زینت اور ناز و ادا کے ساتھ ڈرامے میں ظاہر ہو۔ اجنبی افراد سے ہاتھ ملانا بھی حرام ہے۔ لیکن محبت بھرے جملے ادا کرنا اور ہنسی مذاق، اگر معمول کی حد سے نہ بڑھیں اور عشق بازی اور شہوت انگیز ہونے کی حد تک نہ ہوں، تو جائز ہیں۔

کھیل کود کے احکام

سوال: کیا کھیل کود اور سرگرمیوں (activities) کی کوئی شرعی حدود ہیں، جن کے ذریعے ان کے حلال و حرام ہونے کے درمیان تمیز کی جا سکے؟

جواب: ہمارے خیال میں سرگرمیوں (activities) کے حلال اور حرام ہونے کا تعین کرنے والے خاص تفصیلی قواعد معین کرنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک کلی اصول ہے اور وہ یہ کہ سرگرمیوں کو دین کے منافی اور اسے نقصان پہنچانے والی نہیں ہونا چاہئے۔ یعنی وہ ایسی نہ ہوں جن کی لت انسان میں یادِ خدا اور نماز سے غفلت کا موجب ہو جائے اور جن میں مشغول ہونے کی وجہ سے انسان اپنی گھریلو، معاشرتی اور دینی ذمے داریوں کی ادائیگی سے دور رہے۔

اسی طرح ان سرگرمیوں کی جزیات، انسان میں بدی اور گمراہی کی جانب رغبت پیدا نہ کریں۔ اگر ان امور کو ملحوظ رکھا جائے تو کھیل کود اور سرگرمیوں میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ چاہے یہ بغیر داؤں (شرط) لگائے جوئے کے آلات سے کھیل کھیلنا ہو، چاہے شطرنج اور دوسرے کھیل اور سرگرمیاں ہوں جو ہر زمانے اور قوموں کے حالات و شرائط اور رسوم و ثقافت کی مناسبت سے ایجاد کی جاتی ہیں۔ البتہ کھیل کود اور سرگرمیوں میں داؤں (شرط) لگانا حرام ہے۔

سوال: کھیل کود اور سرگرمیوں میں افراط، یعنی حد سے زیادہ تجاوز کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس قسم کے کھیلوں میں لت اور نشے کی حد تک افراط کے نتیجے میں عنوانِ ثانوی پیدا ہو جاتا ہے، جس کے تقاضے کے تحت یہ کھیل حرام ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ انسان کو اہم معاملات و مسائل اور شرعی اور اجتماعی فرائض سے دور کر دیتے ہیں۔

سوال: بعض فقہا کا اعتراض یہ ہے کہ ان کھیلوں کے دوران رقابت پیدا ہو جاتی ہے' اور یہ رقابت کھلاڑیوں کے درمیان بغض و عداوت اور دشمنی کا موجب بنتی ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ظاہر ہے کہ جب کھلاڑی کی اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں جوحتیٰ کسی غیر بحرانی صورتحال میں بھی کنٹرول سے باہر ہو سکتی ہے بلکہ کھیل اور مقابلے کی ماہیت و نوعیت ایسی ہو جو کھلاڑیوں کے درمیان بغض و عداوت پر منتہی ہو' تو عنوانِ ثانوی کی رو سے ایسا کھیل کود حرام ہے۔ یہ اس صورتحال کی مانند ہے جس کا خداوندِ عالم نے شراب وقمار کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ: اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان بغض و عداوت پیدا کر دے اور تمہیں یادِ خدا سے روک دے' تو کیا تم واقعاً رک جاؤ گے؟ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۹۱)

اسکے باوجود ہماری رائے یہ ہے کہ کھیل کود کے وسائل از خود حرام نہیں ہیں' جب تک وہ کسی حرام عمل کے ارتکاب کا سبب نہ بنیں' یا عنوانِ ثانوی کے تحت حرام نہ ہو جائیں۔

سوال: بعض کھیلوں میں کھیل میں گرمی اور مقابلے میں شدت پیدا کرنے کی غرض سے جیتنے والے کیلئے بطورِ معاوضہ ایک بڑی انعامی رقم مقرر کی جاتی ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اس قسم کے کھیلوں میں کسی بھی قسم کا بدلہ یا ڈنڈ حتیٰ علامتی صورت میں بھی ہو' اگر بازی (شرط کی رقم) شمار کیا جاتا ہو' تو جائز نہیں۔ لیکن اگر انعام کے طور پر ہو' یعنی یہ کہیں کہ جو کوئی جیتے گا وہ انعام کے طور پر فلاں چیز حاصل کرے گا۔ بدلے یا ڈنڈ کے طور پر کھلاڑیوں کو جو انعام دیا جاتا ہے' وہ ان کی کارکردگی کے اجر کے طور پر دیا جاتا ہے' ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے دو افراد رقم لیکر ایک طرف رکھتے ہوں اور ان میں سے جو کوئی کامیاب ہو وہ ساری رقم لے

جاتا ہو اور اس طرح شکست پانے والا شکست کا تاوان ادا کرتا ہو، جیسے جوئے یا سٹے میں ہوتا ہے۔ وہ انعام جو کھلاڑی کو دیا جاتا ہے، مثلاً جو کوئی شطرنج کے کھیل میں جیتے اسے دیا جانے والا انعام جائز ہے۔

سوال: بعض کھیلوں میں، روپے کی جگہ کھیل کے حصے کے طور پر طبع شدہ (printed) کاغذ استعمال کیئے جاتے ہیں۔ جیسے ''مونوپولی'' میں۔ اس کھیل کے ضمن میں بازی بھی لگائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقی روپے کے ذریعے نہیں بلکہ اِنہی کاغذوں کے ذریعے۔ ان کاغذوں کے ذریعے کھیلنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: اہم بات یہ ہے کہ حقیقی طور پر کسی کو نفع یا نقصان نہ پہنچے۔ یعنی بازی لگا کر اور شرط لگا کر نہ کھیلا جائے۔ لہٰذا اگر کھیل کی نوعیت ہار اور جیت کے عمل پر مشتمل ہو۔ لیکن (علامتی طور پر بھی) کوئی مادّی نتیجہ اس پر مرتب نہ ہو، تو جائز ہے۔ یعنی جب کھیل ختم ہو جائے تو کسی کو کھیل کے نتیجے میں حقیقی مادّی فائدہ حاصل نہ ہو اور کسی کو مالی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

سوال: حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث، جو انسان کے اوقات کی تقسیم کے بارے میں ہے، اس میں اس عبارت کے کیا معنی ہیں کہ: **وساعة لملذتكم في غير محرم** (اور کچھ وقت غیر حرام لذتوں کیلئے مخصوص کرو)

جواب: شاید اس سے مراد وہ تمام حالات و شرائط ہوں جن میں انسان اپنے آپ کو جسمانی اور نفسانی ضروریات کے حوالے کر دیتا ہے اور کھیل کود اور جنسی خواہشات سے لذت کے حصول یا اپنے دوست احباب کے ساتھ ہم نشینی میں مشغول ہوتا ہے۔

وہ روایت جو کہتی ہے کہ: **وساعة يخلي بين نفسه وبين لذتها فيما يحل و يجمل فانها عون على تينك الساعتين** ... (اور کچھ وقت کو حلال اور پسندیدہ لذتوں کیلئے مخصوص کریں۔ کیونکہ یہ عمل ان دو اوقات (عبادت اور کام کاج کے اوقات)

میں ان کا مددگار ہوگا)۔اس سے پتا چلتا ہے کہ لذت سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو راحت وسکون پہنچائے اور کام کاج اور عبادت سے فراغت کا احساس اس میں پیدا کرے۔ کیونکہ انسان کام کاج اور عبادت کے دوران جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے جد و جہد میں مصروف ہوتا ہے۔لہٰذا حلال لذت میں کھیل کود کے تمام وسائل' حلال موسیقی اور مطالعہ شامل ہیں جو انسان کے ذہنی دباؤ کو کم کرتے ہیں۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی عرف میں ''اوقاتِ فراغت'' نام کی کوئی چیز نہیں۔یہ لوگ آیتِ قرآن: فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (لہٰذا جب آپ فارغ ہو جائیں تو نصب کر دیں۔سورۂ الشرح ۹۴۔آیت ۷) کو اسکی دلیل قرار دیتے ہیں۔اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: آیت سے یہ مراد لیتے وقت گہرے غور وفکر سے کام نہیں لیا گیا۔کیونکہ مذکورہ آیت سے ایک خاص حالت مراد ہے'اس کے ذریعے انسانوں کے روزمرہ کیلئے کوئی پروگرام دینا مقصود نہیں (واللہ العالم)۔ کیونکہ اوقاتِ فراغت کا مقصد یہ ہے کہ انسان زندگی کی مصروفیات سے کچھ دیر کے لئے ہاتھ کھینچ لے' خواہ اِن مصروفیات کا تعلق عبادات سے ہو'چاہے وہ معیشت اور روزگار کی سرگرمیوں سے تعلق رکھتی ہوں۔تاکہ یہ فرصت عملی ذمے داریوں کے اس دباؤ میں کمی کا سبب بنے جو انسان کے جسم اور اسکی روح کو تھکا دیتا ہے۔لہٰذا فراغت کے اوقات وہ زمانہ ہیں جس میں انسان عباداتِ الٰہی' واجبات کی انجامدہی اور معیشت سے متعلق کاموں (جس کیلئے خدا نے اسے ذمے دار قرار دیا ہے) سے فارغ ہو۔

اس وضاحت کی رو سے اللہ رب العزت انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے کام کے اوقات کو ضروری اور سنجیدہ کاموں اور مخلصانہ عباداتِ الٰہی کے ساتھ گزارے اور اپنے اوقاتِ فراغت کو خدا کے غضب اور ناراضگی کا موجب نہ بننے دے۔

سوال: بعض روایات میں متعین طور پر نرد (چوسر) اور شطرنج کا نام لیا گیا ہے۔ اور واضح طور پر کہا گیا ہے کہ یہ کھیل حرام ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اِن روایات کے تجزیے و تحلیل کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِن میں اُن کھیلوں کے بارے میں بات کی گئی ہے جن میں اُس دور میں ''جوا'' معمول تھا جس دور میں یہ احادیث صادر ہوئیں۔ کسی حدیث میں آیا ہے کہ ''شطرنج جوا ہے'' یا ''چوسر جوا ہے''۔ واضح ہے کہ ان کھیلوں کو حرام کرنے کی وجہ ان کے ساتھ جوا کھیلا جانا قرار دی گئی ہے۔ یعنی جس دور میں یہ احادیث صادر ہوئیں اُس زمانے میں شطرنج اور چوسر سے جوا کھیلا جاتا تھا۔

سوال: آپ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس موضوع کے بارے میں شبہ پایا جانے کے باوجود آپ کیوں اس پر گفتگو کرتے ہیں؟ کیا بہتر نہیں ہے کہ آپ ان کھیلوں کو حرام قرار دے دیں، یا کم از کم شبہ سے دور رہنے کی خاطر اِن کے بارے میں احتیاط کا فتویٰ دیں؟

جواب: اگر انسان کو کسی چیز کے بارے میں حرمت کا احتمال نظر آئے، اور وہ اسکے بارے میں خود احتیاط سے کام لے، یا تمام ہی امور میں احتیاط کو بنیاد قرار دے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ نیز اگر یہ عمل اِس انسان کی زندگی پر کوئی منفی اثر مرتب نہ کرے، تو ایک اچھی چیز ہے۔ لیکن جب ہم حکمِ شرعی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ یعنی (کسی چیز کی) حرمت کے بارے میں جو دلیل قائم کی گئی ہے، وہ اس قدر مضبوط ہے جس سے حرمت کو ثابت کیا جاسکے، یا یہ کہ اِس (دلیل) میں اتنی قوت نہیں پائی جاتی۔ اِس موقع پر مجتہد کا فریضہ یہ ہے کہ اس نے استنباط کے معروف قواعد کی بنیاد پر اپنے اجتہاد سے جس چیز کے حلال یا حرام ہونے کو دریافت کیا ہے، اسے لوگوں کے سامنے بیان کرے اور لوگوں کو بتائے کہ یہ عمل حلال ہے یا حرام۔ اسکے بعد خود لوگوں پر ہے کہ وہ احتیاط کرتے ہیں یا نہیں۔

لہٰذا اگر ہم عمل کے سلسلے میں احتیاط کو شیوہ اور بنیاد قرار دیں، تو ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اکثر فقہی مسائل کے بارے میں مختلف اقوال و آراء پائی جاتی ہیں۔

اس صورت میں اگر ہمارے عمل کا اصول احتیاط ہو تو ہمیں چاہئے کہ خدا نے ہمیں جو سہولتیں اور گنجائشیں دی ہیں، ہم اُن سب سے دستبردار ہو جائیں اور وہ تمام امور جن کے بارے میں ایک دوسرے کی مخالف آراء پائی جاتی ہیں (اس دلیل کی بنیاد پر کہ نہ جانے ان میں سے کونسی رائے درست ہو) ان میں احتیاط پر عمل کریں۔

فقہا جو بیشتر اختلافی اور احتمالی امور میں احتیاط کے قائل ہوتے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ (وہ چاہتے ہیں کہ) انسان اپنے حقیقی اور واقعی فریضے کی ادائیگی کے نزدیک نزدیک ہو جائے اور اِس عمل کی حقیقی مصلحت سے مستفیض ہو اور اسکے حقیقی مفسدے سے محفوظ رہے۔ یہ وہ عمل ہے جس میں ہماری دانست میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن فتوؤں میں تفصیلی صورت میں احتیاط کے اصول کو اِس انداز سے داخل کر دینا، کہ جس چیز کے بارے میں ہم مشہور کی رائے کے برخلاف حلال ہونے کی دلیل رکھتے ہوں یا اسکے بارے میں شبہ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، اسکے بارے میں بھی احتیاط سے کام لیں، تو یہ رویہ انسان کے اندر ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اُس چیز کو حرام قرار دے دیتا ہے جو حرام نہیں ہوتی اور جو چیز واجب نہیں ہے، اسے لوگوں پر واجب کر دیتا ہے۔ یہ امر عام لوگوں کے ذہن میں شرعی اصولوں کو غیر حقیقت پسندانہ ظاہر کرتا ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں جن کے بارے میں استدلال کرتے ہوئے فقہا انہیں ''ارتکاز متشرعة'' کہتے ہیں ان کی بنیاد معصومؑ کے قول، عمل یا تائید جو حجت کا درجہ رکھتی ہے کی بجائے فقہا کی احتیاطاً حرام قرار دینے کی ذہنیت اور احتیاطِ واجب پر مبنی فتاویٰ ہیں۔

ممکن ہے کہ احتیاط کا حکم بعض امور میں مثبت پہلوؤں کا حامل ہو۔ لیکن ممکن ہے بعض اوقات اسکے منفی پہلو (انسان کی زندگی کو پیچیدہ کرنے اور اس ذہنیت کے پیدا ہونے کے لحاظ سے جو اکثر پیچیدہ نتائج کی حامل ہوتی ہے) زیادہ ہوں۔

لہٰذا مجتہد کو چاہئے کہ وہ فتویٰ دیتے وقت لوگوں کی ضروریات اور ان کی پیچیدہ مشکلات کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود کو اپنے فتوے پر ہر پہلو سے غور و فکر کا پابند سمجھے۔ ایسا نہ ہو

کہ احتیاط کی جانب اپنے ذاتی رجحان کی وجہ سے ایسا فتویٰ دینے سے خوفزدہ ہو جس کے اثبات پر اسکے پاس دلیل موجود ہو۔

تقاریب اور اجتماعات کے احکام

سوال: حرام محفلوں کے نقصانات جاننے کیلئے' یا ان کی روک تھام کیلئے اِن کے اسباب کا علم حاصل کرنے کی خاطر' تا کہ اس سلسلے میں راہِ حل وضع کی جا سکے' یا ان محفلوں کے نعم البدل تلاش کرنے کی غرض سے کیا ان میں شرکت جائز ہوگی؟

جواب: اگر انسان آیۂ قرآن: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے حالات سے خوب باخبر ہے' چاہے وہ کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کرے۔ سورۂ قیامت ۷۵۔ آیت ۱۴' ۱۵) کے مضمون کی بنیاد پر اپنے پروردگار اور خود اپنے آپ سے سچا ہو اور وہ خود اور اُسکا خدا جانتا ہو کہ وہ فقط تحقیق و مطالعے کی غرض سے اور لوگوں کو اِن محافل سے اجتناب کی تلقین کیلئے اِن کے منفی عناصر اور نقصانات سے آگاہ ہونے کی غرض سے ایسی محافل میں جاتا ہے اور اُسے اِس قسم کی فضا میں جذب اور ہضم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو' تو ممکن ہے اسکے ایسی محافل میں شرکت کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہو۔ لیکن انسان کیلئے ضروری ہے کہ اپنے محرکاتِ عمل اور مقاصد کا اچھی طرح چھان پھٹک کر جائزہ لے۔ کیونکہ محرماتِ خدا کی طرف سے ممنوعہ علاقے ہیں اور جو اِن کے نزدیک جاتا ہے اُسکے اِن میں داخل ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔

سوال: مردوں اور عورتوں کی مخلوط محفلوں کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

جواب: اگر اِن محفلوں میں انجام دیئے جانے والے اعمال کے لحاظ سے یا اُس فضا کی کیفیت کے اعتبار سے جس میں وہاں عورت اور مرد موجود ہوتے ہیں' وہاں مردوں اور عورتوں کا اختلاط گمراہ کن ماحول ایجاد کر دے' یا اسلام کی غلط تصویر پیش کرے' یا کچھ مدت

بعد ہی سہی حرام نتائج پر منتہی ہو تو ایسی مخلوط محفلیں جائز نہیں۔

سوال: عورت کس قدر بناؤ سنگھار کے ساتھ غیر مردوں کے سامنے آ سکتی ہے؟
جواب: اسکے چہرے پر کوئی ایسا میک اپ نہ ہو جو چہرے کی قدرتی زیبائی کے علاوہ اسکی خوبصورتی میں اضافہ کرے، اور جس کی وجہ سے لوگوں کی نظریں اسکی طرف متوجہ ہوں۔ نیز اس نے کوئی ایسی آرائش نہ کی ہوئی ہو جو عام طور پر مردوں کیلئے ہیجان انگیز ہوتی ہے۔

سوال: کیا مسلمان عورت، خواتین اور بچوں کیلئے مخصوص محفلوں میں مختصر اور ہیجان انگیز لباس پہن سکتی ہے؟
جواب: بنیادی طور پر تو یہ عمل حرام نہیں ہے، بشرطیکہ اِس کے ساتھ کوئی دوسرا حرام عمل انجام نہ دیا جائے۔ کیونکہ اسلام نے عورت کو اپنی زینتوں کو دوسری عورتوں اور ایسے بچوں کے سامنے ظاہر کرنے سے منع نہیں کیا ہے جو ابھی عورتوں کے پردے کی بات سے باخبر نہیں ہوئے ہیں۔ اور ایسے ماحول اور فضا میں اِسے خوشی اور نفسیاتی آسودگی فراہم کرنے والی نسوانی خواہشات کے اظہار کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔

سوال: کیا کمسن نابالغ بچیوں کا، مردوں کے سامنے اور عام محفلوں میں رقص کرنا جائز ہے؟
جواب: اس مسئلے کے دو رُخ ہیں:

پہلا رُخ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو ابھی بالغ نہیں ہوئی ہیں، اُن پر تکلیفِ شرعی عائد نہیں ہوئی ہے (یعنی اُن پر شرعی احکام کی پابندی لازم نہیں ہے) اور اجنبی مردوں کے سامنے اُن کا بے حجاب آنا، یا اُن کے سامنے رقص کرنا حرام نہیں ہے۔

دوسرا رُخ یہ ہے کہ (مثلاً گھر کے بڑوں یا والدین کے ذریعے) اُنہیں اِس عمل کی ترغیب دی جا رہی ہو، اِس عمل کی اُن میں عادت ڈالی جا رہی ہو، اور اِس کے نتیجے میں اُن کے

گمراہ ہونے کا راستہ ہموار ہوتا ہو اور اگر ایسی لڑکی بڑی ہونے پر فسق و فجور کے ماحول کی عادی ہو جائے گی، تو ایسی صورت میں عنوانِ ثانوی کے تحت (گھر کے بڑوں اور والدین کا) اپنی لڑکیوں کو ایسے عمل کی ترغیب دینا حرام ہے۔

سوال: کیا مردوں کی محفل میں، مرد کا رقص کرنا جائز ہے؟ کیا عورتوں کے سامنے علاقائی عرب رقص (دبکۃ) کرنا حرام ہے؟

جواب: آقائے خوئیؒ کی طرح ہماری رائے بھی یہ ہے کہ مردوں کی محفل میں مردوں کا رقص کرنا اور عورتوں کے اجتماع میں عورتوں کا رقص کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اِس رقص میں بے حیائی نہ ہو۔ اور مردوں کی محفل میں عرب علاقائی رقص جائز ہے، بشرطیکہ اسکے ساتھ کوئی اور حرام کام نہ کیا جا رہا ہو۔

سوال: آپ کی رائے میں شادی بیاہ کے موقع پر خواتین کا گانا جائز ہے۔ اِس بنیاد پر کیا عورت موسیقی کے ساتھ علاقائی نغمے گا سکتی ہے؟

جواب: اِس مسئلے میں حلال قرار دیئے جانے کی ایک وجہ موجود ہے۔ لیکن ہم یہاں احتیاط کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی ایسی موسیقی کا استعمال جائز نہیں سمجھتے جو گمراہ اور گناہگار لوگوں کے گانے بجانے سے مناسبت رکھتی ہو۔ لیکن حلال اور آرام بخش موسیقی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سوال: کیا مرد کا عورتوں کی ایسی محفل میں تصویر کھینچنا یا موو ی بنانا جائز ہے جس میں وہ مختصر حجاب کے ساتھ موجود ہوں؟

جواب: یہ عمل بذاتِ خود حرام نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی عورتوں کو دیکھنا حرام نہیں ہے جنہیں بے حجابی سے روکا جائے تو وہ اس پر توجہ نہیں دیتیں۔ لیکن اگر حجاب کی پابند عورتیں اِس محفل میں

بے پردہ موجود ہوں، تو انہیں دیکھنے میں اشکال ہے۔

سوال: عورتوں کی بے حجاب تصویروں کی ڈیولپنگ اور پرنٹنگ وغیرہ کا کیا حکم ہے، جبکہ یہ عمل انجام دینے والا شخص ان عورتوں سے واقف نہ ہو؟
جواب: اگر معاشرتی لحاظ سے یہ عمل ان عورتوں کی ہتک حرمت کا باعث نہ ہوتا ہو، تو حرام نہیں ہے۔ فلم کو دیکھنا بھی حرام نہیں ہے، بشرطیکہ عام طور پر اور معاشرتی رسم و رواج کے مطابق (جس معاشرے میں پردہ دار عورت کی بے پردہ تصویر دیکھنے کو اسکی بے عزتی سمجھا جاتا ہو) اسے عورت کی ہتکِ حرمت قرار نہ دیا جاتا ہو۔

سوال: کیا دلہن کے، عروسی جوڑے میں مکمل زیب و زینت کے ساتھ سر پر ایک مختصر رومال ڈالے، گلی کوچے میں لوگوں کے سامنے آنے میں کوئی حرج ہے؟
جواب: عورت نے جو لباس پہنا ہوا ہے، اگر اُس نے اسکے اعضائے ضروری کو ڈھانکا ہوا ہو، تو وہ واجب پردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سوال میں دلہن کے جس لباس کا ذکر کیا گیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ یعنی تحریک انگیز میک اپ اور آرائش وغیرہ کے ساتھ، مذکورہ لباس ناکافی ہے۔

سوال: عام طور پر جب دولہا دلہن کے کمرے میں جاتا ہے، تو وہاں میک اپ کیئے ہوئے خواتین موجود ہوتی ہیں، جنہوں نے صرف اپنا سر ڈھانکا ہوا ہوتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟
جواب: یہ عمل بذاتِ خود حرام نہیں ہے۔ دولہا، دوسری خواتین کی موجودگی کے باوجود دلہن کے کمرے میں جانے کا مجاز ہے۔ لیکن عورتوں کے مکمل میک اپ کے ساتھ اسکے سامنے آنے میں اشکال ہے۔ اور دولہا کیلیئے بھی انہیں دیکھنا جائز نہیں۔ لیکن اگر عورتیں مناسب حالت میں ہوں، تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال: حوصلہ افزائی اور تحسین وتعریف وغیرہ کیلئے تالی بجانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟
جواب: کسی بھی صورت میں تالی بجانا جائز ہے۔ چاہے کسی کے استقبال کیلئے ہو' چاہے خوشی و مسرت کے اظہار کیلئے۔ البتہ کسی حرام کام پر حوصلہ افزائی کیلئے تالی بجانا حرام ہے۔

سوال: کیا شادی بیاہ کی تقریبات میں اسراف اور فضول خرچی' شرعی طور پر حرام ہیں؟
جواب: ظاہر ہے' اسلام اسراف اور فضول خرچی کی مذمت کرتا ہے' اور اس سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ خداوند عالم انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے اموال کو معقول انداز میں اپنی فطری ضروریات کی تکمیل کیلئے خرچ کرے۔ اگر وہ اس حد سے تجاوز کرے' تو حرام فعل کا مرتکب ہوگا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ: ان القصد امرٌ یحبه الله عزّوجلّ' وان السرف امرٌ یبغضه الله عزّوجلّ' حتیٰ طرحک النواة فانها تصلح لشیء وحتیٰ صبک فضل شرابک (یقیناً میانہ روی وہ عمل ہے جسے خداوند عزوجل پسند کرتا ہے اور فضول خرچی وہ عمل ہے جس سے اللہ رب العزت ناراض ہوتا ہے۔ حتیٰ یہ فضول خرچی قابلِ استعمال دانے کو پھینکنے کے ذریعے ہو یا پینے کے اضافی پانی کو پھینک کر ہو۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۲۱۔ ص ۵۵۱۔ روایت ۲۷۸۴۲)۔ لہٰذا اگر شادی بیاہ کی تقریبات میں اسراف اور فضول خرچی کی جائے' تو اس کا حرام ہونا بعید نہیں۔
لیکن اگر عام معاشرتی آداب' بانیٔ تقریب کو اِس قسم کی فضول خرچی کی اجازت دیتے ہوں اور اِسکے بغیر مناسب دکھائی نہ دیتا ہو' تو جائز ہے۔ البتہ ہر صورت میں (چاہے جائز ہو یا حرام) مومنین کیلئے بہتر ہے کہ ایسی مناسبتوں میں غیر معمولی فضول خرچی اور اسراف سے پرہیز کریں۔

سوال: کیا آپ خوشی اور شادی بیاہ کی تقریبات کو زیادہ سے زیادہ مطابقِ شرع بنانے کیلئے کچھ نصیحتیں کریں گے؟

جواب: ہمارے خیال میں اگر ممکن ہو تو سماجی محافل اور شادی بیاہ کی تقریبات میں ایسے پروگرام وضع کیے جائیں جو ان محافل کو خوشی و شادمانی کی عمومی فضا سے دور کیے بغیر اور تفریح کے حلال ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے، شرکائے محفل کے اذہان میں اسلامی مفاہیم منتقل کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عمل اِس بات کی عکاسی کرے گا کہ اسلام فی نفسہٖ ایسی فضا اور محافل کا مخالف نہیں ہے، وہ ایسی محافل کی فضا کو اسلامی رنگ دے کر لوگوں کیلئے معنوی مسرت کا دریچہ کھولتا ہے۔

سالگرہ کا جشن

سوال: آج کل اکثر لوگ اپنے بچوں کی ولادت کے دن کی مناسبت سے، اِن کی سالگرہ کا جشن مناتے ہیں۔ اِس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: سالگرہ کا جشن منانا ہماری روایت نہیں ہے۔ اسلام میں اس بات کی ہدایت نہیں کی گئی ہے کہ انسان اپنی ولادت کی تاریخ کو جشن منائے۔ حتیٰ ہم نے اپنی تاریخ میں بھی بزرگ شخصیات کا یومِ ولادت منانے کا ذکر نہیں دیکھا۔ اسی طرح ہمیں عرب اور مشرقی معاشرے میں بھی اس قسم کے مراسم اور روایات (traditions) نظر نہیں آتیں۔ اللہ رب العزت نے بھی صرف اپنے دو انبیاؑ کی ولادت کا تذکرہ کیا ہے اور اس بارے میں کچھ اور نہیں فرمایا۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں، ان پر اپنے خاص لطف و کرم کو بیان کرتے ہوئے، جس کے تحت انہیں فرعون سے نجات دلائی اور ان کے گھر کے ماحول میں ان کی پرورش کی: فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (پھر فرعون والوں نے اسے اٹھا لیا کہ انجامِ کار ان کا دشمن اور ان کیلئے باعثِ رنج والم بنے۔ سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۸) اور دوسرے، خدا کے مظاہر قدرت کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو بیان فرمایا ہے۔ لیکن خداوند عز و جل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اپنے انبیاؑ میں سے کسی ایک بھی نبی کی ولادت کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ ایک خاص دن کسی انسان کا

پیدا ہونا' اسکے لئے کسی فضیلت کی بات نہیں ہے۔اس بنیاد پر اسلامی شریعت میں کوئی ایسی تلقین دکھائی نہیں دیتی جس میں لوگوں کو (پیغمبر' امام اور دوسرے) بزرگوں کی ولادت پر جشن منانے کا کہا گیا ہو۔

اس بارے میں مسلمان ان غیر اقوام کی تقلید کرتے ہیں جو اپنے نبی کی پیدائش پر جشن مناتی ہیں۔جیسے عیسائی حضرات ہر سال اپنے اکابرین' ادیبوں اور فنکاروں کے روزِ ولادت پر جشن مناتے ہیں۔حتیٰ انہوں نے اپنے کلینڈر کا آغاز بھی حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کیا ہے۔جبکہ مسلمانوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کی بجائے آنحضرت کی ہجرت سے اپنے کلینڈر کی ابتدا کی ہے۔

البتہ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اس بارے میں کوئی منفی موقف رکھتے ہیں۔بلکہ ہمیں اس قسم کی رسوم اور اکابرین کے یومِ ولادت پر جشن منانے کے سلسلے میں غیروں کی تقلید میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔کیونکہ یہ عمل اکابرین کی فکر' جدوجہد' پیغام اور اخلاق کے ذکر پر مشتمل اس مناسبت کے ذریعے اُمت کو اپنے بزرگوں سے جوڑتا ہے' اور ان بزرگوں کے کردار کے تذکرے کے ذریعے اُمت اور قوم میں نئی روح پیدا کرتا ہے اور پورے سال اور زندگی کے ہر پل ان کے کردار کو اپنے سامنے رکھنے کا مقدمہ بنتا ہے۔

لہٰذا ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا جشن منانے کو بدعت اور حرام سمجھنے والے بعض مسلم علما کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔کیونکہ وہ بدعت' جسے حرام قرار دیا جاتا ہے' اُس میں وہ امور شامل نہیں ہوتے جن کے متعلق لوگ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں شارع مقدس کی طرف سے کوئی حکم موجود نہیں ہے۔

جشنِ ولادت کی رسم مفید اور مثبت نتائج کی حامل ہے۔کیونکہ اس طرح قوم اور اسکے اکابرین کے درمیان تعلق کا قیام اس بات کا موجب بنتا ہے کہ لوگ ان بزرگوں کی زندگی سے آشنا ہوں' انہیں اپنے قریب محسوس کریں اور اُن کی سیرت جوامت کی دینی فکر و عمل کو غذا فراہم کرتی ہے' اُسے اپنی زندگی اور طرزِ عمل کی بنیاد قرار دیں۔جس طرح خدا نے زندگی میں

جدید وسائل کے حصول کو حرام قرار نہیں دیا ہے' اسی طرح اُس نے تقریبات اور محفلوں میں جدّت کو بھی حرام نہیں کیا ہے۔

سالگرہ کا جشن انسان کیلئے ایک پسندیدہ حالت ہے' جس میں انسان دنیا میں اپنے قدم رکھنے اور بیتے ہوئے سال کو یاد کرتا ہے۔ ہم اِس نئی رسم کے مخالف نہیں' اگرچہ دوسروں کی رسوم ورواج کی اندھادھند تقلید کو ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اِس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسوم ورواج کو اُمت کی فکروشعور میں گہری جڑوں کا حامل ہونا چاہئے۔ لیکن اس قسم کی رسوم ورواج کے عام ہوجانے کے بعد ہمیں چاہئے کہ اِن کو صاف ستھرا کر کے اِن میں بہتری لانے کی کوشش کریں۔ مثلاً اپنی یا اپنے بچوں کی سالگرہ مناتے ہوئے' انسان نعمتِ وجود سے نوازنے اور زندہ سلامت رکھنے کے سلسلے میں خدا کا شکرادا کرے' اور اِس موقع پر اس طریقے سے خدا کی حمد وثنا کرے جس کی تعلیم صبح وشام کے استقبال کی دعا کے ذریعے امام زین العابدین علیہ السلام نے دی ہے۔ آپؑ نے فرمایا ہے: وھذا یومٌ حادث جدید' وھو علیناشاھد عتید' ان احسنا ودّعنا بحمد ' وان اسانا فارقنا بذم (اور یہ نیا اور تازہ وارد ہونے والا دن ہم پر ایسا گواہ ہے جو ہمہ وقت حاضر ہے۔ اگر ہم نے اچھے کام کیے تو وہ ہماری توصیف وتعریف کرتے ہوئے ہم سے رخصت ہوگا۔ اور اگر ہم نے بُرے کام کیے تو ہماری مذمت اور بُرائی کرتا ہوا ہم سے جدا ہوگا۔ (دعاءالصباح والمساء صحیفۂ کاملہ۔ دعا نمبر ٦) اور جس طرح بدھ کے دن کا استقبال کرتے ہوئے آپؑ فرماتے تھے کہ: لک الحمد ان بعثتنی من مرقدی' ولوشئت لجعلته سرمداً' حمداًدائماًلا ینقطع ابداً (تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے مجھے میری خوابگاہ سے اٹھایا' اگر تو چاہتا تو مجھے ہمیشہ کیلئے سوتا چھوڑ دیتا۔ میں تیری ایسی حمد کرتا ہوں جس کا سلسلہ تا ابد نہ ٹوٹے۔ دعائے یومِ اربعا۔ مفاتیح الجنان۔ص ٤٧)

یعنی انسان کا یومِ ولادت اسکے لئے ایک ایسی مناسبت بن جائے جس روز وہ اِس بات پر خدا کا شکرادا کرے کہ اُس نے اِسے اِس دن تک سلامت رکھا' جو اسکا یومِ ولادت

اور دنیا میں قدم رکھنے کا دن ہے۔ یہ دن اسکے لئے ایک ایسا موقع بن جائے جس میں وہ اس بات پر غور وفکر کرے کہ اس نے اب تک اپنی عمر کن کاموں میں بسر کی ہے' طاعتِ الٰہی کے ساتھ گزاری ہے یا معصیتِ پروردگار میں مشغول رہا ہے۔ اور آج کے دن وہ آئندہ زندگی میں اپنی راہ وروش کی تصحیح اور کردار کی اصلاح کا عزم کرے۔

یوں اس رسم میں ایسی تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں کہ اپنی سالگرہ کے دن انسان اپنے مقصدِ حیات کو یاد کرے' اس دن کو ذکرِ خدا کے ساتھ بسر کرے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کرے کہ: **اللھم اجعل مستقبل امری خیراً من ماضیہ' وخیر اعمالی خوا تیمھا' وخیر ایامی یوم القاک فیہ** (پروردگار! میرے مستقبل کے امور کو ماضی سے بہتر' میرے بہترین عمل کو اس کا انجام اور اپنے دیدار کے دن کو میرا بہترین دن قرار دے)

ایامِ عید

سوال: ان لوگوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے جو عید کو فسق وفجور اور گناہ وعصیان کی مناسبت سمجھتے ہیں؟

جواب: اسلام میں عید کے تصور کا جائزہ لیا جائے تو وہ دو مناسبتوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور یہ دونوں ہی مناسبتیں پروردگارِ عالم کی اطاعت وفرمانبرداری' اسکی بارگاہ میں اخلاص وتسلیم اور اسکی راہ میں نصیحت وخیر خواہی کی بنیاد پر قائم ہیں۔

مردِ مسلمان ماہِ رمضان کے روزوں کے شرعی فریضے کی ادائیگی کے بعد (شوال کی پہلی تاریخ کو) عیدِ فطر کا جشن مناتا ہے۔ کیونکہ وہ خداوندِ عزوجل کی اطاعت اور ماہِ رمضان کے روزوں کی صورت میں خداوند عالم کی طرف سے عائد فریضے کی ادائیگی میں کامیاب ہوا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام عید الفطر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **انما ھو عید لمن قبل اللہ صیامہ و قیامہ' وکل یوم لا یعصیٰ اللہ فیہ فھو عید...** (یہ دن اُس شخص کیلئے عید ہے جس کے روزے اور عبادت کیلئے قیام کو خدا نے قبول فرمایا ہے' اور

ہر وہ دن عید کا دن ہے جس میں خدا کی نافرمانی نہ ہو)

لہٰذا یہ عید، جو اطاعت اور حکمِ خدا کی تعمیل میں کامیابی کا جشن ہے، اِسے اس طرح منانا چاہئے کہ اسکی ایک ایک چیز اطاعتِ الٰہی کی روح کے مطابق ہو۔ ایسا شخص جو اِس عید پر خدا کی معصیت اور نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہو، وہ عید کی روح اور اسکے مفہوم سے ناآشنا ہے۔

رہی بات عید الاضحیٰ کی، جو عیدِ قرباں ہے، تو اِس دن خداوند عالم انسان سے چاہتا ہے کہ وہ خدا کی قربت کی نیت سے جانور ذبح کر کے اسکا تقرب حاصل کرے۔ یہ عید حضرت ابراہیمؑ اور اِن کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے واقعے کی جانب اشارہ کرتی ہے، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں اس طرح کیا گیا ہے کہ: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ. وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۙ. قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ. اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ. وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ. وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ. سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ. كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (پھر جب وہ فرزند اِن کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کے قابل ہو گیا، تو انہوں نے کہا کہ: بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ فرزند نے جواب دیا کہ: بابا! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اُس پر عمل کیجئے، انشاءاللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا۔ اور ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم اسی طرح حسنِ عمل کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔ بے شک یہ بڑا کھلا ہوا امتحان ہے اور ہم نے اِس کا بدلہ ایک عظیم قربانی کو قرار دیدیا ہے، اور اِسکا تذکرہ آخری دور تک باقی رکھا ہے۔ سلام ہو ابراہیم پر، ہم اسی طرح حسنِ عمل والوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۲ تا ۱۱۰)

اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ عید اُسی قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے، جسے حضرت ابراہیمؑ

نے خدا کا قرب حاصل کرنے کیلئے اُسکی بارگاہ میں پیش کیا اور اُسکی راہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور اسماعیل علیہ السلام جیسی محبوب ہستی کی قربانی پر آمادگی کا اعلان کرکے اِس بات کا اظہار کیا کہ وہ راہِ خدا میں اپنی جان فدا کرنے پر بھی تیار ہیں۔

لہٰذا عیدِ قرباں ٗ یعنی عیدِ تسلیم و رضا اور بارگاہِ الٰہی میں اُسکے تقرب کے حصول کیلئے سرِ تسلیم خم ہو جانا۔ قدرتی بات ہے کہ ایسی عید کو اِس انداز سے منانا چاہئے کہ وہ انسان کی پوری زندگی پر ٗ اسکے گفتار میں ٗ اسکے کردار میں اسلامی تعلیمات کو اجاگر کرے۔ اِس بنیاد پر عید مناتے ہوئے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے جو ایسی معنوی اور انسانی فضا سے مناسبت رکھتا ہو جو انسان کو خدا سے دور نہیں کرتی ' بلکہ اسے خدا کے نزدیک لیجاتی ہے۔ اِس موقع پر خوشی و شادمانی کا احساس خدا کی نعمتوں اور سعادت و کامیابی کے اُن عناصر کا حامل ہونے کی وجہ سے ہونا چاہئے جنہیں خدا نے انسانوں کو عطا کیا ہے۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے عید کو خوشی و شادمانی اور روزمرہ زندگی کی دوڑ دھوپ سے فراغت کا دن قرار دیا ہے۔ کیا آپ کی یہ بات عید کے دن کے بارے میں ان ہدایات سے متصادم نہیں جو عید کے دن محاسبۂ نفس ٗ سعی و کوشش اور موت اور آخرت کو یاد کرنے کے بارے میں کی گئی ہیں؟

جواب: اسلام زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کے بارے میں انسان کے اندر توازن و اعتدال قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی وہ چاہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی ایک پہلو ٗ ایک رُخ دوسرے پہلو اور اور دوسرے رُخ پر حاوی نہ ہو ٗ اسے کچل نہ ڈالے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان خوش و خرم مسرور و شاداں رہے۔ البتہ یہ بات پسند نہیں کرتا کہ انسان خوشیوں کے ہنڈولے میں بیٹھ کر اپنے فرائض و ذمے داریوں سے غافل ہو جائے اور اعتدال و میانہ روی کا راستہ چھوڑ بیٹھے۔ بعض دینی نوشتوں میں ہے کہ: لیکن خروجکم من بیوتکم کخروجکم من قبورکم الیٰ لقاء اللّٰہ و لیکن وقوفکم بین یدی ربکم فی

الصلاۃ کو قوفکم بین یدی اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ یوم القیامۃ... (تمہیں گھر سے اِس طرح نکلنا چاہئے جیسے تم اپنی قبر سے نکل کر خدا سے ملاقات کو جارہے ہو اور اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہورہے ہو۔ اور تمہیں نماز میں اِس طرح کھڑے ہونا چاہئے جیسے روزِ قیامت خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہوئے ہو۔۔۔۔)

نمازِ عید ایک ایسے دن کے آغاز کا مظہر ہے جس میں انسان اپنے فریضے اور ذمے داری کی ادائیگی پر ایمانی سرور و شادمانی محسوس کرتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ خوشی و مسرّت کو نفسانی خواہشات اور لہو ولعب کی محدودیت سے نکال کر اسکے دائرے کو وسعت دے۔ اور انسان اپنے فریضے کی ادائیگی، اطاعتِ الٰہی اور پروردگار کی نافرمانی سے پرہیز کی وجہ سے خوشی محسوس کرے، اور یہی اُسکی عید ہو۔

نمازِ عید کے ذریعے، اسلام چاہتا ہے کہ اسکے ماننے والے پروردگارِ عالم سے ملاقات، اس سے ارتباط اور اسکی مادّی اور معنوی نعمتوں پر شکر کی ادائیگی کے ساتھ اپنے اِس دن کا آغاز کریں۔ اور خدا سے ان کا ربط و تعلق ان کی خوشی و انبساط کا باعث ہو۔ وہ محسوس کریں کہ اُن پر خدا کی نظر ہے، اور ان کے سرور و شادمانی کی وجہ اس مسئلے سے اُن کی آگہی ہو۔ وہ ہرزگی اور بیہودگی کا شکار نہ ہوں۔ بلکہ اپنے انسانی دائرے میں رہیں۔ جیسے کہ حضرت علی علیہ السلام نے وقت کی تقسیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ: **وساعۃ یخلی بین نفسہ وبین لذاتھا فی غیر محرم، فانھا عون علیٰ تینک الساعتین**.... (اور کچھ وقت کو ایسی لذتوں کے لئے مخصوص کریں جو حرام نہ ہوں۔ کیونکہ یہ عمل ان دو (عبادت اور کام کاج کے) اوقات میں ان کا مددگار ہوگا)

لہٰذا اسلام چاہتا ہے کہ عید کے دن انسان اپنی مذہبی اور انسانی ذمے داریوں کو ادا کرنے کی وجہ سے خوش ہو۔ اور یہی عامل اُسے اللہ رب العزت اور آخرت کے حساب و کتاب جیسی چیزوں کی یاد دلائے گا۔ اپنی زندگی کی روزمرہ مصروفیات اور ماحول کا جو بوجھ انسان لادے پھرتا ہے، اُس دن اِس میں تخفیف اسکی اس فطری خوشی کا سرچشمہ ہو۔ اور اسکے

لئے ایسی تفریح ہو جو اسکی روح کو نقصان نہ پہنچائے۔

عید کے دن انسان کا اپنے دوست احباب' اعزہ واقربا کی قبور پر جانا' وہاں ان کو آیاتِ قرآنی کا نذرانہ پیش کرنا' صدقہ دینا نیز اپنے احباب اور رشتے داروں سے ملاقات کو جانا مستحب ہے۔ اسے چاہئے کہ اس دن ہر قسم کی روحانی' اجتماعی' جسمانی اور جذباتی خوشی سے مستفیض ہو۔ یہی اسلام کے اعتدال اور توازن کا راز ہے۔

یہاں دنیاوی اور اُخروی خوشی و مسرت اور دنیاوی ضرورتوں اور اُخروی ذمے داریوں کی مناسبت سے امام علیؑ کے اِس قول کا ذکر مناسب نظر آتا ہے' جس میں آپؑ نے فرمایا ہے کہ: اعمل لدنیاک کانک تعیش ابداً' واعمل لآخرتک کانک تموت غداً (اپنی دنیا کیلئے اس انداز سے کام کرو جیسے اُس میں ہمیشہ رہنا ہے اور آخرت کیلئے ایسے عمل کرو جیسے کل ہی تمہاری موت واقع ہونے والی ہے)

انسان کو چاہئے کہ اپنی ذمے داریوں کو پیش نظر رکھے اور یہ بات ذہن نشین رکھے کہ موت اور روزِ حساب اسکے منتظر ہیں اور اُس دن کی سرخروئی کیلئے اپنے عمل اور توانائیوں سے استفادہ کرے۔

سوال: فسق و فجور کے عادی بہت سے افراد' دیندار اور مومن لوگوں کے روز و شب پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ تفریح اور خوشی و مسرت فسق و فجور کے ساتھ ہے اور مومنین اور اہلِ دیانت کی زندگی میں ایسی تفریحات کا کوئی گزر نہیں۔ اِس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: خوشی و مسرت کے ساتھ ہونے والا وہ آغاز جس کا اختتام گریہ وزاری پر ہو اور خوشی و شادمانی کے ہمراہ ہونے والا وہ اختتام جس کا آغاز ممکن ہے گریہ وزاری کے ساتھ ہوا ہو کے درمیان فرق ہے۔

اسلام انسان کے بارے میں اُن گہرے نتائج کو پیش نظر رکھتا ہے جن میں اسکی

مصلحت ہو اور جو آخر کار انسان کیلئے خوشی و مسرت لئے ہوئے ہوں۔ معروف مثل ہے کہ: جو زیادہ ہنستا ہے وہ آخر کار روتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو زنا کرتے ہیں، شراب نوشی کے مرتکب ہوتے ہیں اور دوسرے حرام کام انجام دیتے ہیں، وہ ایک مختصر وقت کیلئے اپنی خوشی و مسرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اِن اعمال کی وجہ سے اُن کی عقلی و اجتماعی حیات اور اُن کی خود اعتمادی پر مرتب ہونے والے منفی نتائج، اُن کو حاصل ہونے والی اس خوشی کو زائل کر دیتے ہیں۔

ایسا انسان جو شراب پیتا ہے اور اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے، وہ مستی اور مدہوشی کا مزہ اٹھاتا ہے۔ لیکن اسکے بدن اور ذہنی صلاحیتوں پر مرتب ہونے والے منفی آثار اسکی ساری خوشی کو ملیا میٹ کر دینے کیلئے کافی ہیں۔ اسی طرح جو شخص جنسِ مخالف سے ناجائز تعلقات قائم کرتا ہے، ممکن ہے وہ ان تعلقات کے ذریعے جنسی تسکین حاصل کر لے لیکن اس عمل کے منفی نفسیاتی و روحانی اثرات اور بعض اوقات معاشرے میں اسکے مقام کو پہنچنے والا نقصان اِس عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والی اسکی لذت کو تلخی اور کڑواہٹ میں بدل دیتا ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنی خوشی و مسرت کے آغاز ہی میں، اِن کی انتہا اور انجام کے بارے میں غور و فکر کرے۔ تاکہ آغاز میں اسکو حاصل ہونے والی خوشی، آخر تک اسکے ساتھ رہے اور اسکی کوئی خوشی ایسی نہ ہو جس کے بعد حزن و ملال اسکے حصے میں آئے۔

خوشی و شادمانی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور خدا نے بھی اسے حرام نہیں کیا ہے۔ لیکن انسان اپنی خوشی و مسرت کو اپنے اعتقادات اور فکری اصولوں سے ہم آہنگ کر سکتا ہے اور حلال سرگرمیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کا دل اور اسکے غرائز آسودگی کے محتاج ہیں، اِسی طرح عقیدے اور شرع کی ذمے داریوں کی ادائیگی بھی اسکی ضرورت ہے۔

سوال: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خداوند عالم خوشی و مسرت کی مناسبتوں (جیسے پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ معصومینؑ کے ایامِ ولادت کے موقعوں) پر اپنے بندوں کے نامۂ اعمال کی تحریر کا کام

رکوادیتا ہے اور اُن کے بُرے اعمال کی ذمے داری کا بوجھ بھی انکے کاندھوں پر نہیں ڈالتا۔ بالکل اسی طرح جیسے عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے روزِ ولادت کی رات میں ہر قسم کی عیاشی جائز ہے۔ بعض مسلمان فرقوں کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ خداوند عالم بعض ایام اور عیدوں پر اپنے بندوں سے دینی احکام کی پابندی اٹھالیتا ہے اور وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اِن لوگوں کے اِس دعوے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: خداوند عالم نے صرف اُن لوگوں پر سے تکلیف اور اپنی طرف سے عائد ہونے والی ذمے داریوں کو اٹھایا ہے جو ابھی عقل وشعور اور شخصیت تشکیل دینے والے عناصر کے لحاظ سے حدِ بلوغ تک نہ پہنچے ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ: اما علمت ان القلم یرفع عن ثلاثہ: عن الصبی حتیٰ یحتلم، وعن المجنون حتیٰ یفیق، وعن النائم حتیٰ یستیقظ (کیا تم نہیں جانتے کہ خداوند عالم نے تین طرح کے لوگوں سے تکلیف کو اٹھایا ہوا ہے۔ ایک بچے سے، جب تک اسے احتلام نہ ہو جائے، دوسرے دیوانے سے، جب تک وہ صحیح نہ ہو جائے اور تیسرے سوئے ہوئے سے، جب تک وہ جاگ نہ جائے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۔ ص ۴۵۔ روایت ۸۱)

ان تین طرح کے لوگوں کے سوا کسی اور سے تکلیف نہیں اٹھائی گئی ہے۔ خداوند عالم انسان کے ہر عمل کا، ہر صورت میں محاسبہ کرے گا: اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ. مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (جبکہ دو لکھنے والے اسکی حرکتوں کو لکھ لیتے ہیں، جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے ہیں، وہ کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا ہے، مگر یہ کہ ایک نگہبان اسکے پاس موجود رہتا ہے۔ سورۂ ق ۵۰۔ آیت ۱۷، ۱۸)

بعض مناسبتوں پر رفع تکلیف (یعنی وقتی طور پر دینی احکام کی پابندی اٹھا لینا) کا خیال صرف ایک وہم ہے، جو احادیث کے مطالعے اور جائزے کے دوران گہرے غور وفکر کے فقدان کی باعث پیدا ہوا ہے۔ خداوند عالم نے ہر بالغ اور باشعور انسان کو اپنے اعمال کا ذمے دار قرار دیا ہے اور کسی بھی مناسبت اور کسی بھی موقع پر اسے اس ذمے داری کی ادائیگی

سے مستثنا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روزِ ولادت اور حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مولودِ مسعود کا دن انسان کی ذمے داری کو اور شدید کر دیتا ہے۔ کیونکہ ان مناسبتوں کا پیغام یہ ہے کہ انسان اپنی حیات اور اپنے دور میں اپنی ذمے داری اور فرائض کو اچھی طرح پہچانے۔

لہٰذا انسان کو تمام مناسبتوں میں اپنی ذمے داریوں کی جانب متوجہ رہنا چاہئے اور اسکی خوشی، مسرت، تفریح اور کھیل کود بھی ذمے دارانہ اور دنیا اور آخرت میں انسان کو خدا تک پہنچانے والی راہ پر انسان کے توازن اور ثابت قدمی کے ضامن ہونے چاہئیں۔

١٠

جنسی امور کے احکام

جنسی امور کے احکام

سوال: کیا ایسے مرد یا عورت کیلئے ہیجان انگیز فلمیں دیکھنا جائز ہوگا جن میں جنسی تعلقات کی خواہش سرد پڑ گئی ہو اور وہ ازدواجی تعلقات کی جانب سے بے رغبتی محسوس کرتے ہوں؟

جواب: ہم نہیں سمجھتے کہ علمی لحاظ سے یہ بات ثابت شدہ ہو کہ جنسی ہیجان پیدا کرنے والی فلمیں، جنسی بے رغبتی کا علاج ہیں۔ بلکہ بہت سے مواقع پر یہ فلمیں برعکس اور اُلٹا اثر دکھاتی ہیں۔ اِن فلموں کو دیکھنا اکثر و بیشتر اخلاقی ضعف کا سبب ہوتا ہے اور جب مرد ایسی فلموں میں کام کرنے والی عورت سے صادر ہونے والی حرکات وسکنات اپنی بیوی میں نہیں دیکھتا' تو اُس سے دوری اور بے رغبتی محسوس کرتا ہے۔ یہی حال عورت کا ہوتا ہے' کہ جب وہ فلم میں کردار ادا کرنے والے مرد جیسی حرکات اپنے شوہر میں نہیں دیکھتی' تو اُس سے بے رغبت ہو جاتی ہے۔

واضح بات ہے کہ جو لوگ فلموں میں دکھائے جانے والے بے شرمانہ جنسی تجربات کی پیروی کرتے ہیں' وہ ان ہیجان انگیز عناصر کو وجود میں لانے کی کوشش کرتے ہیں جن سے بد چلن اور زنا کار افراد استفادہ کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ بہت سے مواقع پر ایسی فلمیں دیکھنے

والے مرد کے اپنی زوجہ سے تعلقات پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے اور اسی طرح اسکے برعکس بھی ہوتا ہے یعنی ایسی فلمیں دیکھنے والی عورت کے اپنے شوہر سے روابط و تعلقات پر منفی اثر ڈالتا ہے۔

یہ مسئلہ ناجائز جنسی تعلقات رکھنے والے مردوں کے یہاں پیش آتا ہے۔ عصمت فروشی کی عادی، عشوہ گر اور ہیجان انگیز ناز و ادا دکھانے والی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھنے والے مرد اپنی جائز زوجہ سے بے توجہی برتتے ہیں، جو انہیں لبھانے کی ایسی مہارت نہیں رکھتی۔ فقہا نے زنا کیلئے مشہور عورت سے ازدواجِ موقت (متعہ) کو حرام قرار دیا ہے، شاید اس کی یہی وجہ ہو۔

ہمارے خیال میں عریاں فلمیں، حیا سوز اور ہیجان انگیز تصاویر انسان کی روح، اسکے اخلاق اور اسکے ازدواجی تعلقات پر منفی اثرات مرتب کرتی ہیں اور ہم میاں بیوی کیلئے بھی ایسی چیزوں کو دیکھنا جائز نہیں سمجھتے۔

لیکن اگر میاں یا بیوی یا یہ دونوں ہی جنسی تعلقات میں بے رغبتی کا شکار ہوں۔ اور کوئی ایسا طبیعی طریقہ موجود نہ ہو جس کے ذریعے میاں یا بیوی اپنے شریکِ حیات کو ان تعلقات پر ابھار سکے۔ اِس سلسلے میں کوئی دوا بھی موثر نہ ہو اور اِس بیماری سے نجات کا راستہ اس قسم کی فلمیں دیکھنا ہی رہ گیا ہو، تو صرف بقدرِ ضرورت ایسی فلموں کا دیکھنا جائز ہے۔(۱) بالکل اسی طرح جیسے بقدرِ ضرورت دوا استعمال کی جاتی ہے۔ اِس بقدرِ ضرورت کا جواز بھی صرف اِس صورت میں ہے جب وہ پہلی حالت اِن کیلئے ناقابلِ برداشت ہو۔ اور اِن کی اس حالت پر حرج (یعنی شدید سختی) کا عنوان صادق آتا ہو، اور اِن کی ازدواجی زندگی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔

سوال: بعض لوگ، عریاں فلموں کو دیکھنے کی توجیہ کرتے ہوئے، یہ استدلال پیش کرتے ہیں

۱۔ بشرطیکہ کوئی مستند ماہر جنسیات یہ علاج تجویز کرے۔

کہ اِس قسم کی فلموں کو دیکھنا جنسی عمل کے دوران میاں بیوی کی ہم آہنگی اور اِس عمل کی لذت وشہوت میں اضافہ کرتا ہے۔ اور میاں بیوی کے باہمی عشق ومحبت کو بڑھانے کا باعث ہوتا ہے۔ اور یہ بات ازدواجی تعلقات کو تقویت پہنچاتی ہے' جو ایک صحت منداور سالم معاشرے کی بنیاد ہے۔ اِس توجیہ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: جب ہم دینی نصوص (احادیثِ پیغمبرؐ) کا مطالعہ کرتے ہیں' تو وہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ اِن احادیث میں مرد کو اِس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو جنسی عمل پر آمادہ کرنے کیلئے فضا تیار کرے اور اپنی بیوی کی شہوت ابھارنے کے بعد یہ عمل انجام دے اور خشک' بے روح اور ٹھنڈے جذبات کے ساتھ جنسی عمل انجام نہ دے۔(۱) حتیٰ ایسی احادیث بھی ہیں جن میں مرد کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب تک عورت کی تسکین نہ ہو جائے اُس وقت تک اس سے جدا نہ ہو اور عورت کو اُسکی خواہش کی تسکین کے بغیر تشنہ نہ چھوڑے۔ بلکہ اُس وقت تک توقف کرے جب تک اِس عمل کے ذریعے عورت کی آتشِ شہوت ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

ہماری رائے ہے کہ اِس سلسلے میں جنسی فلمیں دس فی صد سے زائد مثبت اثر نہیں رکھتیں' جبکہ اِن کے منفی اثرات اَسّی فی صد یا اس سے بھی زیادہ ہیں۔ لہٰذا اِن فلموں کے کچھ مثبت نکات ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم اِس قسم کی فلموں کو جائز قرار دیں۔ کیونکہ اِن کے منفی اثرات زیادہ ہیں۔

سوال: کیا منی خارج کئے بغیر صرف دخول' وہ نجاست اور گندگی پیدا کرتا ہے' جسے پانی وغیرہ سے پاک کرنا ضروری ہے؟

جواب: اگر مرد' دخول کئے بغیر صرف منی خارج کرے' تو جس مقام پر نجاست پہنچی ہے اُسے

۱۔ رجوع کیجئے وسائل الشیعہ جلد ہفتم کتاب النکاح۔

دھویا جائے اور غسل صرف مرد پر واجب ہے۔ اگر منی خارج نہ بھی ہو تب بھی صرف دخول کی وجہ سے غسل واجب ہو جائے گا۔

سوال: زمانۂ حیض میں عورتوں کے ساتھ کیا صرف فرج کی جانب سے مباشرت ناجائز ہے۔ نیز اِس مدت میں عورتوں سے کس حد تک نزدیک ہونا جائز ہے؟

جواب: واضح ہے کہ زمانۂ حیض میں عورتوں کے ساتھ مباشرت کا حرام ہونا صرف فرج سے دخول کیلئے ہے۔ البتہ دوسری کسی بھی قسم کی جنسی لذت کے حصول میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں، دُبُر کی جانب سے دخول کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ علما دُبُر سے دخول کو اصولاً حرام قرار دیتے ہیں۔ لیکن جو اِسے جائز سمجھتے ہیں اُن میں سے بعض زمانۂ حیض میں بھی اِسے جائز سمجھتے ہیں۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اس زمانے میں حیض کے مقام (یعنی فرج سے) سے دخول کو منع کیا ہے: فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ (اور زمانۂ حیض میں عورتوں (کے ساتھ مباشرت) سے پرہیز کرو۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۲۲)

لیکن بعض دوسرے علما اِس آیت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اِس میں ہر قسم کے ایسے جنسی عمل کی ممانعت کی گئی ہے جو زمانۂ حیض کے علاوہ دنوں میں جائز ہے۔ اور نتیجہ لیتے ہیں کہ حیض کی حالت میں دونوں اطراف (فرج اور دُبُر) سے مباشرت حرام ہے۔ بعض علما دُبُر کی جانب سے دخول سے مطلق پرہیز کے بارے میں احتیاطِ واجب کے قائل ہیں اور ہم عام صورت میں دُبُر سے دخول کے جواز کے بارے میں احتیاطِ واجب کے قائل ہیں، البتہ بعض چیزوں کو مدنظر رکھنے کے بعد۔

سوال: کیا مباشرت کی کوئی شرعی حدود مقرر کی گئی ہیں؟

جواب: عورت اور مرد مباشرت کے دوران، اُن تمام وسائل سے استفادہ کر سکتے ہیں جنہیں

شرعاً حرام قرار نہیں دیا گیا ہے۔ صرف دُبُر سے دخول، جسے بعض فقہا حرام سمجھتے ہیں کے علاوہ اس حوالے سے کوئی ایسا عمل نہیں جسے شرعاً حرام قرار دیا گیا ہو۔

اسکے باوجود عورت پر واجب نہیں ہے کہ وہ مرد کی جانب سے اختیار کئے جانے والے اُن طریقوں کو قبول کرے جو اُسکے لئے نقصان، اذیت اور تکلیف کا باعث ہوں۔

سوال: جس زمانے میں عورت مباشرت کی قدرت یا خواہش نہ رکھتی ہو، یا کسی نا مناسب نفسیاتی کیفیت کا شکار ہو، تو کیا ایسے موقع پر مباشرت سے گریز کرسکتی ہے؟

جواب: اگر مباشرت کے نتیجے میں عورت کو شدید نقصان پہنچے، تو اس سے پرہیز جائز ہے۔ کیونکہ خداوند عالم کا قول ہے کہ: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (اور تمہارے لئے دین میں کوئی سختی اور زحمت نہیں رکھی گئی ہے۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۷۸)

لیکن صرف مباشرت کی خواہش نہ ہونے کی بنا پر، اِس سلسلے میں شوہر کی درخواست مسترد کرنا جائز نہیں۔

سوال: اگر مرد اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے بعد عورت کو تسکین پہنچائے بغیر تشنہ چھوڑ دے، تو اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: جنسی تعلق کے دوران اس طرح کا طرزِ عمل ایک غیر اخلاقی اور غیر انسانی طرزِ عمل ہے۔ ہر چند اِس عمل کے ذریعے مرد گناہ کا مرتکب تو نہیں ہوتا، لیکن شرعی طور پر ایک مکروہ عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ: اذا جامع احدکم اھلہ فلا یاتیھنّ کمایاتی الطیر، لیمکث و لیلبث قال بعضھم: و لیتلبث (جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے مجامعت کرے تو اسے یہ عمل پرندوں کی طرح انجام نہیں دینا چاہئے۔ بلکہ اِسے چاہئے کہ کچھ دیر ٹھہرے اور توقف کرے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۲۰۔ ص ۱۱۷۔ روایت ۲۵۱۸۱)

ایک اور روایت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ :ان احدکم لیاتی اهله فتخرج من تحته فلو اصابت زنجیاً لتشبثت به' فاذااتی احدکم اهله فلیکن بینهما ملاعبة (ومداعبة) فانه اطیب للامر (تم میں سے کچھ لوگ اِس انداز سے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کرتے ہیں کہ فراغت کے بعد عورت تشنہ رہتی ہے۔ اِس موقع پر اگر کوئی سیاہ فام غلام اِس کے سامنے آجائے تو وہ اُس کے ذریعے اپنی آتشِ شہوت بجھانے پر تیار ہو جائے۔ جب بھی اپنی زوجہ کے ساتھ مجامعت کا ارادہ کرو تو (اِس سے پہلے) آپس میں خوش فعلی کرو۔ کیونکہ یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔ وسائل الشیعہ ۔ج ۲۰۔ص ۱۱۸۔ روایت ۲۵۱۸۳)

حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں آیا ہے کہ :اذااراداحدکم ان یاتی زوجته' فلا یعجلها فان للنساء حوائج (جب تم میں سے کوئی اپنی زوجہ کے ساتھ جماع کا ارادہ کرے' تو اُسے چاہئے کہ اِس عمل میں جلد بازی نہ کرے' کیونکہ عورتوں کی بھی حوائج ہوتی ہیں۔ وسائل الشیعہ ۔ج ۲۰۔ص ۱۱۸۔ روایت ۲۵۱۸۴)

سوال: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ منی کا اسکی مخصوص جگہ کے سوا کسی اور جگہ اخراج' مثلاً خوش فعلی اور ہم آغوشی کے دوران اِسکا نکل جانا' استمنا ہے؟

جواب: وہ استمنا جسے حرام قرار دیا گیا ہے' وہ ہے جس میں انسان اپنے ہاتھ یا کسی بھی دوسرے ذریعے سے تنہا از خود منی خارج کرتا ہے۔ لیکن اپنی زوجہ کے ہاتھ' یا اسکی ران' یا اِسکے ساتھ خوش فعلی کے دوران کسی بھی ذریعے سے استمنا جائز ہے۔

سوال: کیا مرد اپنی دو یا دو سے زیادہ بیویوں سے' اُن کی رضامندی کی صورت میں یا اپنے خیال میں زیادہ لذت وشہوت کی غرض سے' ایک ہی وقت میں ہمبستری کرسکتا ہے؟

جواب: یہ عمل بذاتِ خود حرام نہیں ہے۔ لیکن بعض علما ایک عورت کے دوسری عورت کی

شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کی حرمت کے بارے میں احتیاط کے قائل ہیں۔ سوال میں جس صورت کو فرض کیا گیا ہے' اگر اُسکے دوران اِن عورتوں کی نگاہ' ایک دوسرے کی شرم گاہوں پر پڑے تو ان علما کی رائے کے مطابق یہ عمل جائز نہیں۔

ہم اضطراری حالت میں' بوقتِ ضرورت' جیسے گواہی دینے' نسوانی حالت کا جائزہ لینے اور رحم بندی وغیرہ کے مواقع پر ایک عورت کا دوسری عورت کی شرم گاہ پر نظر ڈالنا جائز سمجھتے ہیں۔ ہماری اِس رائے میں سوال میں مذکور صورت شامل نہیں۔ لہٰذا یہ مذکورہ صورت اگر عورتوں کے ایک دوسرے کی شرم گاہ پر نگاہ پڑنے کا باعث ہو' تو احتیاط کرنا چاہئے۔

ہم اِس قسم کے عمل کے شرعی جواز کے بارے میں بھی احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ عمل شرعی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں۔ لہٰذا مردِ مومن کو چاہئے کہ وہ اِس قسم کے عمل سے احتیاط اور بچاؤ کے طور پر پرہیز کرے۔

سوال: کیا ایسی جوان عورت پر طلاق کی عدت گزارنا ضروری ہے' جو کسی بیماری یا ایسے آپریشن کی وجہ سے جو ہمیشہ کیلئے بانجھ پن پر منتج ہوتا ہے' بانجھ ہے؟

جواب: اِس کیلئے عدت گزارنا لازماً ضروری ہے۔ کیونکہ عدت کے مسئلے میں رحم کا صاف ہو جانا پیش نظر ہے۔ لہٰذا یہ احتیاط کے لحاظ سے عمومیت کا حامل مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ بعض اوقات اسکی حکمت تمام لوگوں کو نظر نہیں آتی۔

ہم جانتے ہیں کہ احکامِ شرع عام حالات کے لحاظ سے وضع کئے گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر صورت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ نسخہ وضع کیا گیا ہو۔ اِس بنیاد پر ہماری رائے یہ ہے کہ عدت اُن تمام حالات کیلئے ہے جن میں حمل ٹھہرنے کا امکان اور احتمال پایا جائے۔ ہر چند بعض حالات میں بیرونی عوارض کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو۔ لہٰذا شریعت نے تمام حالات میں عدت کو واجب قرار دیا ہے۔ عدت کے حکم میں جس چیز کو پیش نظر رکھا گیا ہے وہ نوعی حالات ہیں' انفرادی اور شخصی حالات نہیں۔ عدت سے صرف یائسہ اور ایسی خواتین مبرہ ہیں

جن سے مباشرت نہ کی گئی ہو۔

جنس کی تبدیلی

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ جنس کی تبدیلی کو جائز سمجھتے ہیں۔ کیا ہم آپ کی اس رائے کی تفصیلات جان سکتے ہیں؟ جن فقہی اصولوں سے آپ نے اپنی اِس رائے میں استفادہ کیا ہے، وہ کیا ہیں؟

جواب: اس موضوع کا تعلق کئی حالات سے ہے:

ایک تو وہ حالت ہے جس نے حال ہی میں مغربی معاشروں میں رواج پایا ہے۔ جس میں ہوتا یہ ہے کہ آپریشن کے ذریعے مردانہ عضو کو نکال کر اسکی جگہ (عورت کے جنسی عضو کے طور پر) ایک سوراخ بنا دیا جاتا ہے۔ اور ایسے مرد میں نسوانی علامات نمایاں کرنے کی غرض سے اسکے اندر زنانہ ہارمونز داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ آپریشن مرد کو اسکی شکل و صورت اور اسکے جسم و ہیکل کی مردانہ صفات سے محروم نہیں کرتے۔ ایسے شخص کی حالت بڑی حد تک ''زنخوں'' سے مشابہ ہوتی ہے، اِس اضافے کے ساتھ کہ اِن کا مردانہ عضوِ تناسل ختم کر دیا جاتا ہے اور ان میں بعض نسوانی علامات، جیسے آواز کا باریک ہو جانا، سینے کا ابھر جانا اور چہرے سے بالوں کا ختم ہو جانا وغیرہ ظاہر ہوتی ہیں۔

واضح بات ہے کہ اِس قسم کے کاموں نے کسی چیز کو تبدیل نہیں کیا ہے اور مردوں کے ساتھ اُن کے جنسی تعلق کے قیام کو مباح قرار نہیں دیا ہے۔ کیونکہ اِس قسم کا تعلق ایک مرد کا دوسرے مرد کے ساتھ تعلق ہے، جس طرح اس پر عائد ہونے والے دوسرے شرعی احکام مردوں پر عائد ہونے والے احکام ہی کی مانند ہیں۔ یہ عمل ایک قسم کا حیلہ اور بہانا ہے، جو جنسی گمراہی کا شکار افراد نے اختیار کیا ہے، تاکہ لواط کو قانونی حیثیت دینے کی خاطر اِس سے استفادہ کریں۔ کیونکہ اب بھی اکثر معاشروں میں لواط اور اس میں مبتلا لوگوں کو بُری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اُن کی مذمت کی جاتی ہے۔

اِس قسم کے عمل کا حرام ہونا بعید نہیں ہے۔ کیونکہ بغیر کسی مصلحت کے اپنے جنسی عضو کو علیحدہ کر دینا' اپنے بدن کو نقصان پہنچانا ہے اور دانستہ اپنے بدن کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

دوسرے حالات بھی ہیں جن میں جنس کی تبدیلی کا عمل انجام پاتا ہے۔ جیسے مخنث کو عورت بنانا۔ جس کا آج کل بھی رواج ہے۔ اور اگر کسی زمانے میں یہ امکان فراہم ہو جائے کہ عورت کو تمام مردانہ خصوصیات اور صلاحیتوں کے ساتھ مثلاً مردانہ عضوِ تناسل' عورتوں کے ساتھ مباشرت کی صلاحیت اور دوسری مردانہ علامات پیدا کر کے ایک مکمل مرد میں تبدیل کیا جا سکے' اور اِسی طرح اگر مستقبل میں اس بات کا امکان پیدا ہو جائے کہ مرد کو ایک مکمل عورت میں تبدیل کیا جا سکے' جس کے بارے میں کہہ سکیں کہ یہ عورت ہے اور طبی اور جسمانی لحاظ سے اسکا شمار دوسری عورتوں میں ہونے لگے اور عرفی اعتبار سے بھی زنانہ عضوِ تناسل کا مالک ہو جائے اور مباشرت کے دوران اسکے وہی احساسات و جذبات ہو جائیں جو عام طور پر ایک عورت کے ہوتے ہیں۔ الغرض اِس میں اور دوسری عورتوں میں ''رحم'' کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ قدرتی طور پر اِس میں رحم موجود نہیں اور وہ حاملہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور بعض اوقات عام عورتیں بھی حاملہ نہیں ہوتیں۔

اِس مذکورہ صورت میں' ہمارے پاس کوئی ایسی شرعی دلیل نہیں جس کی بنیاد پر اِس عمل کے حرام ہونے کا حکم دیا جا سکے۔ اور جب تک عنوانِ اوّلی کے طور پر جنس کی تبدیلی کے حرام ہونے پر مبنی کوئی شرعی دلیل ہمارے پاس موجود نہ ہو' اُس وقت تک یہ عمل جائز ہے اور اس غرض سے آپریشن میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا' اگر وہ واقع ہو جائے' تو جس کسی پر یہ تمام نئے اثرات مرتب ہوں گے وہ حقیقتاً ایک مرد یا ایک عورت بن جائے گا اور نئی حالت اور نئے احکامِ شریعت اِس پر جاری ہوں گے۔

اِس عمل کے حلال اور جائز ہونے کی دلیل کے بارے میں عرض ہے کہ ہمارے پاس شرع میں ایک اصول ہے' جو کہتا ہے کہ جب کبھی کسی چیز کی حرمت' یعنی اسکے حرام ہونے

کے بارے میں ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہ ہو اور اِس چیز کے حرام یا حلال ہونے کے بارے میں ہمیں شک ہو، تو اصولاً ایسی چیز حلال ہو گی۔ یہ صرف ہماری ہی رائے نہیں، امام خمینیؒ نے بھی تبدیلی جنس کو جائز قرار دیا ہے، اِسی طرح آقائے خوئیؒ اِس عمل کے جواز کے قائل تھے۔ اِس بارے میں آپ کی رائے کتاب ''منیۃ السائل'' میں موجود ہے۔

جو حضرات تبدیلی جنس کو حرام سمجھتے ہیں، اُن میں سے کچھ لوگ اِس آیہ قرآن سے استدلال کرتے ہیں کہ: وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (پھر حکم دوں گا تو اللہ کی مقرر کردہ خلقت کو تبدیل کر دیں گے۔ سورۂ نساء۴۔ آیت ۱۱۹)۔ اِس آیت میں شیطان کے ارادے اور اُس کی قسم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اور یہ حضرات استدلال کرتے ہیں کہ جنس کی تبدیلی بھی خدا کی خلقت میں تبدیلی ہے۔

اِن کو ہمارا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں خَلْقَ اللّٰهِ سے مراد انسان نہیں ہے۔ کیونکہ خَلْقَ اللّٰهِ عمومی معنی کا حامل لفظ ہے، اور اِس میں خدا کی تمام مخلوقات شامل ہیں۔ ان علما نے اِس آیت کی جو تفسیر کی ہے، اُسکی بنیاد پر اگر ہم خدا کی خلقت میں تبدیلی کے حرام ہونے کو مان لیں، تو پھر ہمیں چاہئے کہ کائنات کی تمام چیزوں درخت، پودے، زمین، پہاڑ، دریا وغیرہ کو اُن کی قدرتی حالت میں برقرار رکھیں، اُن میں کوئی ردو بدل نہ کریں، جو چیز جہاں، جس طرح ہے، اُسے بالکل اُسی طرح رہنے دیں۔ واضح ہے کہ کوئی اس بات کو قبول نہیں کرے گا۔ اور اگر ہم اِن تمام چیزوں کو آیت کی شمولیت سے مستثنا قرار دے دیں، تو ایسی صورت میں استثنائے اکثر واقع ہوگا، جو عقلا کی نظر میں ایک معیوب بات ہے۔

ہم اِس نکتے کی جانب بھی توجہ دلانا چاہیں گے کہ اکثر علما خدا کی تخلیقات میں تغیر و تصرف اور انسانی جسم کو خوبصورت بنانے کی خاطر، اِس میں تبدیلیوں کو جائز سمجھتے ہیں۔

پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر خَلْقَ اللّٰهِ (خدا کی خلقت) سے کیا مراد ہے؟

جواباً عرض ہے کہ ایک آیت میں اِس نکتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، ارشادِ باری ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۖ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِکَ الدِّیْنُ

الْقَيِّم (یہ وہ فطرتِ الٰہی ہے جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے' اور خلقتِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے۔ سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۳۰)۔ لہٰذا خدا کی خلقت سے مراد ''فطرت'' ہے۔ کیونکہ انسان کو فطرت پر' یعنی توحید پر' خلق کیا گیا ہے' اور کچھ لوگ ہیں جو انسان کی فطرت کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی اُسے توحید سے شرک کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ یہ ایک شیطانی عمل ہے' جو مسلسل اس بات کیلئے کوشاں ہے کہ انسان کو خدا اور توحید سے دور کردے۔ اس بنیاد پر وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللهِ کے معنی یہ ہوں گے' کہ شیطان نے عہد کیا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو اس بات کا حکم دے گا کہ وہ لوگوں کی اس فطرت کو تبدیل کریں جو توحید پر استوار ہے۔ بعض احادیث کا مضمون بھی یہی ہے کہ اس آیت میں خلق اللہ سے مراد' فطرت ہی ہے۔ اور اس بات کیلئے تو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ شیطان کا بنیادی کردار طبی' جسمانی اور جنسی لحاظ سے انسان کو تبدیل کرنا نہیں ہے' اسکا اس قسم کے تغیرات سے کوئی تعلق نہیں۔

رہی بات انسان کے خود اپنے بدن کو نقصان پہنچانے کی' تو یہ عمل اِس صورت میں حرام ہے جب پہنچنے والے اِس نقصان کے بدلے اُسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ اور ظاہری بات ہے کہ ایک ایسا مرد جو اپنے آپ کو ایک عورت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے' اُسکے لئے لازم ہوتا ہے کہ عورت بننے کے اِس عمل کے دوران سخت حالات برداشت کرے' اور اِسکے عورت بننے سے حاصل ہونے والا فائدہ' اس عمل میں اِسے پہنچنے والے نقصان پر فوقیت رکھتا ہو۔ البتہ یہ مسئلہ اس پر منحصر ہے کہ یہ مفروضہ مخنث کے مسئلے کے سوا کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔

سوال: کیا اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر یہ عمل انسان کی موت یا کسی بڑے نقصان پر منتج نہ ہو' تو وہ اپنے کسی بھی عضوِ بدن کو محض اچھا لگنے' یا کسی نفسیاتی مشکل' یا اپنے مزاج اور شوق کی بنا پر نکلوا سکتا' یا اُسے بیکار کرسکتا ہے؟

جواب: نہیں، یہ بات بالکل جائز نہیں کہ انسان بغیر کسی سبب اور عرفی منفعت کے اپنے کسی بھی عضو کو کاٹ دے۔ مثلاً ایک ایسا شخص جسکی ناک ٹیڑھی ہے، یا بھدی ہے، اُسکے لئے اُسے خوبصورت بنانے کیلئے آپریشن کرانا جائز ہے۔ یا اِسی طرح اگر کسی کی ایک انگلی غیر معمولی ہے اور اُسکے لئے مشکل پیدا کرتی ہے، تو وہ اُسے آپریشن کے ذریعے صحیح کروا سکتا ہے، یا اُسے کٹوا سکتا ہے۔

اِس بنیاد پر ضروری ہے کہ کوئی اہم مصلحت پائی جائے، جو کسی عضو کو کاٹنے یا اُسے صحیح کرنے کا جواز فراہم کرے۔ مردانہ عضوِ تناسل کو ناکارہ کر دینا اِس نظریے سے خارج نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ہمارے بیان کردہ اِس طریقے سے جنس کی تبدیلی کا امکان پایا جاتا ہو، تو صرف اُس شخص کیلئے یہ عمل جائز ہو گا جو شدید دشوار صورتحال کا شکار ہو، جسے اِس عمل کی اٹل ضرورت ہو اور جو سخت ضرر رساں نفسیاتی اضطراب میں مبتلا ہو۔ صرف یہ صورتحال اِس قسم کے عمل کا جواز فراہم کرتی ہے۔ (واللہ العالم)

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ ایک عورت کے دوسری عورت کی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ آپ کی یہ رائے بہت سے فقہا کی رائے کے برخلاف ہے۔ آپ کے پاس اپنے اِس نظریے کی کیا سند اور فقہی بنیاد ہے؟

جواب: اِس بارے میں ہمارے پاس موجود ایک سند تو یہ ہے کہ ایک عورت کے دوسری عورت کی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کے حرام ہونے کے بارے میں جو روایات آئی ہیں وہ ضعیف ہیں۔ علی بن ابراہیم آیۂ قرآن: وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (اور مومنات سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی پاکدامنی کو محفوظ رکھیں۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۱) کی تفسیر میں ایک صحیح روایت کا ذکر کرتے ہیں، جو کہتی ہے کہ:

من ان تنظر احدا هن الیٰ فرج اختها، و تحفظ فرجها من ان ینظر الیه (اِن عورتوں میں سے کوئی اپنی بہن کی شرمگاہ پر نظر ڈال سکتی ہے اور خود اسے اپنی شرمگاہ کی

حفاظت کرنی چاہئے تا کہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔اصول کافی ۔ج ۲۔ص ۳۳۔روایت ۱)
کافی میں ایک اور روایت کا ذکر ہوا ہے' جو مذکورہ بالا روایت پر تاکید کرتی ہے۔یہ روایت کچھ یوں ہے کہ:ان کل شی ء فی القرآن من حفظ الفرج فهو من الزنا الا هذه الآ یة فهو فی النظر (قرآن میں جہاں کہیں بھی شرمگاہ کی حفاظت کا ذکر آیا ہے' وہاں زنا (سے محفوظ رہنا) مراد ہے' سوائے اُس آیت کے جس میں شرمگاہ کی حفاظت سے مراد اُسے دوسروں کی نگاہ سے محفوظ رکھنا ہے۔اصولِ کافی ۔ج ۲۔ص ۳۶۔ روایت ۱)

ان دو روایات کے بالمقابل بکثرت ایسی روایات موجود ہیں' جو غیر اضطراری حالات میں بھی' ایک عورت کے دوسری عورت کی شرمگاہ دیکھنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: اگر میاں بیوی کے درمیان بکارت (کنوار پن) کے مسئلے میں اختلاف پیدا ہو جائے' تو کوئی دوسری عورت اِس خاتون کی شرمگاہ کو دیکھ سکتی ہے۔اور یہ ایک غیر اضطراری حالت ہے۔کیونکہ اضطرار صرف بنیادی اور انتہائی اہم اور انہی کی مانند امور کے بارے میں ہوتا ہے۔اور اضطراری حالت ہو تو پھر شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کے جواز کے حکم میں عورت اور (نامحرم) مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ۔کیونکہ اضطرار مرد کے دیکھنے کو بھی مباح کر دیتا ہے اور کسی عورت کے کنوار پن کی تشخیص کیلئے دوسری عورت کے اسکی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کو بھی۔

اس بارے میں ایک اور روایت بھی ہے' جو کہتی ہے کہ: یہ معاملہ اور اِس کی مانند دوسرے معاملات وہ باتیں ہیں جنہیں عورتیں جانتی ہیں۔ پس دیکھنے کیلئے قابلِ اعتماد خواتین کو مقرر کرو ۔ اِس روایت کے معنی یہ ہیں کہ اِن امور کے بارے میں اشکال و اعتراض کرنا یکسر بے جا ہے۔کیونکہ اِس مسئلے کی تشخیص ایک ایسی چیز ہے جو کوئی بھی عورت بغیر کسی مشکل اور دشواری کے انجام دے سکتی ہے۔

ہماری رائے کی بنیاد اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو کہتی ہے کہ: تقبل شهادة

المراة فی کل مالا یحل للرجل النظر الیه... (عورت کی گواہی ان تمام چیزوں میں قابلِ قبول ہے جن پر مرد کا نگاہ ڈالنا جائز نہیں۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۷۔ ص ۴۲۶۔ روایت ۲۱۷۵۰)۔ یعنی جن جگہوں کو دیکھنے کا مرد مجاز نہیں ہے' اُنہیں عورت دیکھ سکتی ہے۔ اور شرمگاہ بھی اُن اعضا میں سے ہے جن پر مرد کا نگاہ ڈالنا جائز نہیں۔ پس عورت اِس پر نظر ڈال سکتی ہے۔ ہم اِن اعضا میں تعیم اور توسیع کے قائل ہیں' کیونکہ دلیل عمومیت کی حامل ہے اور عورت کی گواہی کو اُن تمام اعضا کیلئے قرار دیتی ہے جن پر مرد کا نظر ڈالنا حرام ہے' اور اِنہی اعضا میں سے ایک عضو شرمگاہ بھی ہے۔ اور اگر اسکے سوا کچھ اور مراد ہوتی تو پھر اِس مسئلے میں عورت اور مرد کے درمیان کیا فرق ہوتا؟

اِن تمام روایات میں پہلے درجے پر شرمگاہ اور اسکے اردگرد کا حصہ مراد ہے۔ لہٰذا زچگی کے مسئلے مین حکم یہ ہے کہ صرف عورتیں دایہ کا کام کر سکتی ہیں' مردوں کو بلاضرورت اس کام کا حق نہیں۔ واضح ہے کہ روایت میں اضطراری صورتحال مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اِس صورت میں صرف عورت کو معین کرنا فضول بات ہوتی۔ اِس لئے کہ اضطراری صورت میں عورت اور مرد دونوں کیلئے یہ عمل انجام دینا جائز ہے۔ اس بنیاد پر روایت غیر اضطراری حالت میں ایک عورت کے دوسری عورت کی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کے مسئلے میں مرد اور عورت کے درمیان فرق یہ ہے کہ مرد کا عورت کی شرمگاہ پر نظر ڈالنا جائز نہیں ہے اور اگر حرمت کا حکم مرد اور عورت دونوں کیلئے یکساں ہوتا' تو دونوں ہی ضرورت کے وقت عورت کی شرمگاہ پر نظر ڈال سکتے تھے۔ لہٰذا ہم سند اور دلالت کے لحاظ سے اُن روایات کو ترجیح دینے کی وجہ سے جو عورت کی شرمگاہ پر عورت کے نگاہ ڈالنے کو جائز سمجھتی ہیں' اِس عمل کی ممانعت کرنے والی روایات سے دستبردار ہوتے ہیں۔

البتہ ہمیں اِس مسئلے کو اُس وقت کیلئے مخصوص اور مختص کرنا چاہئے' جس وقت ضرورت اسکا تقاضا کرے' ایسا نہ ہو کہ عام حالات میں بھی ایک عورت دوسری عورت کی شرمگاہ پر نظر

ڈالا کرے۔ (واللہ العالم)

سوال: آپ کی اِس رائے کے بارے میں کافی شور وغل مچا ہوا ہے کہ کیونکہ عورت سے منی نہیں نکلتی اسلئے اسکا استمنا بھی نہیں۔ کیا آپ اِس حکم اور اِس سے متعلق ابہامات کو تفصیل کے ساتھ ہمارے لئے واضح کر سکتے ہیں اور جن دلائل کو آپ نے اِس حکم کی سند بنایا ہے کیا اُنہیں بیان کر سکتے ہیں؟

جواب: اِس مسئلے کے بارے میں جس چیز کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اگر عورت میں بھی مرد کی مانند منی ہو، تو جنسی شہوت کے اوج (intencepleasure) کے موقع پر، اُس میں سے بھی ویسی ہی رطوبت خارج ہونی چاہئے جیسی رطوبت مرد میں سے نکلتی ہے(۱) اور ظاہر ہے، مرد ہی کی مانند اِس پر غسل بھی واجب ہو جائے گا اور پھر استمنا (masturbation) بھی جس طرح مرد پر حرام ہے اِسی طرح عورت پر بھی حرام ہوگا۔

لیکن اگر عورت میں منی نہ ہو، تو پھر جنسی شہوت کے اوج (intence pleasure) پر پہنچ جانے کے بعد اِس پر غسل واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ فقہا کے اجماع کے مطابق، غسل منی کے خارج ہونے کی وجہ سے واجب ہوتا ہے اور عورت کی خودلذتی، استمنا کے عنوان سے حرام نہیں ہے۔ کیونکہ عورت میں منی ہوتی ہی نہیں کہ اسکی خودلذتی پر استمنا کا عنوان صادق آئے۔ بالکل اِسی طرح جیسے اگر مرد اپنے عضو سے کھیلے لیکن اِس سے منی خارج نہ ہو، تو فقہا کے اجماع کی رو سے اِس پر غسل واجب نہیں ہوگا، اور وہ کسی حرام عمل کا مرتکب نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ استمنا کے حرام قرار دیئے جانے کی بنیاد شہوت کو بھڑکانا نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے، اِسکی حرمت کی وجہ منی کو اسکی غیر مناسب جگہ پر

۱۔ تفصیل کیلئے کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر ایک اور دو ملاحظہ کیجئے۔

نکالنا ہے۔

لیکن اِسکے باوجود ہم ترجیح دیتے ہیں کہ خواتین اِس مفروضے کے درست ہونے کی صورت میں بھی (کہ عورت میں منی نہیں ہوتی) اِس عمل کا ارتکاب نہ کریں۔ کیونکہ اِس بُری عادت کا مرتکب ہونا ان کی ازدواجی زندگی کیلئے مضر ہوگا اور ان کی روحانی' اعصابی اور جسمانی مشکلات میں اضافے کا باعث بنے گا' جو اِن کی فطری زندگی' معاشرتی مقام و مرتبے اور مستقبل میں عائلی زندگی پر بُرے اثرات مرتب کرے گا۔

بعض افاضل نے منی نہ نکلنے کی صورت میں خواتین کی خودلذتی کے جواز کے بارے میں ہماری رائے کو مسترد کرتے ہوئے دو روایات کے ذریعے استدلال کیا ہے۔ پہلی روایت عبید بن زرارۃ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ: میرے پڑوس میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا' جس کے پاس ایک خوبصورت جوان کنیز تھی' جسے اُس نے تین ہزار درہم میں خریدا تھا۔ وہ بوڑھا شخص مکمل طور پر اسکی خواہش پوری نہیں کر پاتا تھا۔ وہ کنیز اس سے کہا کرتی تھی کہ اپنے ہاتھ کو میری اندام نہانی کے درمیان رکھو' مجھے اس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔ بوڑھا اس عمل سے ہچکچاتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس بارے میں ابا عبداللہ جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھو۔ میں نے امامؑ سے سوال کیا' انہوں نے جواب دیا: **لا بـاس ان یستعین بکل شی ء من جسده علیها' ولکن لا یستعین بغیر جسده علیها** (کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اُسے مطمئن کرنے کیلئے اپنے اعضائے بدن میں سے کسی عضو کو استعمال کرے۔ لیکن اُسے چاہئے کہ اپنے بدن کے سوا کسی اور چیز سے استفادہ نہ کرے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۴۔ ص ۲۷۷' ۲۷۸)

دوسری روایت یہ ہے کہ راوی کہتا ہے کہ میں نے ابا عبداللہ علیہ السلام سے کہا: ایک شخص جس کی کئی کنیزیں ہیں اور کیونکہ وہ ان سب سے مقاربت نہیں کرسکتا' لہٰذا ایسا عمل انجام دیتا ہے جس سے وہ لذت حاصل کرتی ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: **امـا کان من جسده فـلا بـاس** (اگر وہ اپنے اعضائے بدن سے یہ عمل انجام دیتا ہے' تو کوئی حرج نہیں۔ وسائل

الشیعہ ۔ج ۱۴۔ص ۷۷۸؍۷)

ان دونوں روایات کا ظاہر بتاتا ہے کہ اِن میں اپنی زوجہ کی جنسی خواہش پوری کرنے کیلئے شوہر کے بیرونی وسائل سے استفادے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اِن میں عورت چاہتی ہے کہ اسکا شوہر اپنے ہاتھ یا بدن کے اور کسی حصے سے اِسے جنسی لذت فراہم کرے اور مرد کو اپنے بدن کے سوا کسی اور وسیلے سے استفادے کا حق نہیں دیا جاتا۔ اِن روایات میں کہیں بھی عورت کی خودلذتی کے مسئلے کی جانب اشارہ نہیں ملتا۔

سوال: بہر صورت اِس فتوے کی عملاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اگر خواتین اِس فتوے پر عمل کریں تو ممکن ہے کہ بعض اخلاقی بُرائیوں کا شکار ہو جائیں۔ اِس بنیاد پر بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ نے اِس مسئلے کے بارے میں احتیاط کا فتویٰ کیوں نہیں دیا' یا یہ کہ آپ نے اِس مسئلے کو اِس ہیجان انگیز صورت میں کیوں بیان کیا؟

جواب: وہ لوگ جو اِس قسم کا اعتراض کرتے ہیں' وہ اُن سنگین مسائل ومشکلات سے آگاہ نہیں ہیں جن کا عورتوں کو سامنا ہے۔ یہ تلخ اور سخت حالات عورتوں کو اِس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ احکامِ شریعت اور شرعی دلائل کے ذریعے اپنی اِن مشکلات کا حل دریافت کریں۔

ہمیں اپنے مطالعات اور اِس سلسلے میں ہم سے کیئے جانے والے سوالات کے ذریعے اِس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ مثلاً بعض حالات میں ایک بیوی کا شوہر قید میں ہوتا ہے' کبھی کبھی عورت کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ اِسکا شوہر زندہ ہے یا مر گیا اور بسا اوقات طویل عرصے تک طلاق کا معاملہ معلق رہتا ہے۔

شوہر کے غائب ہو جانے کی صورت میں مشہور کا حکم یہ ہے کہ عورت چار سال انتظار کرے۔ اِسکے بعد حاکمِ شرع اِسے طلاق دے سکتا ہے اور اگر اِسکا سرپرست اِسے نفقہ فراہم کرتا رہے' تو اِسے تاعمر اسی طرح رہنا چاہیئے۔

اور اگر مرد ایک طویل مدت تک' جس کا عام طور پر برداشت کرنا ممکن نہیں' کسی

دوسرے ملک میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہو، یا وہاں پناہ گزین ہو اور اپنی بیوی سے ملاقات نہ کر سکتا ہو، تو ایسی صورتوں میں ایسی ہولناک جنسی مشکلات پیش آتی ہیں جو فقیہ پر لازم کرتی ہیں کہ وہ ان مشکلات کے حل کے سلسلے میں شرعی دلائل سے مثبت نتائج کے حصول کیلئے سوچ بچار کرے۔ ظاہر بات ہے کہ خودلذتی کے نتیجے میں بھی خاص مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اسے حرام قرار دینا، یا اس مسئلے کو یونہی بغیر کسی حل کے چھوڑ دینا، عورت کی زندگی کو بہت سی مشکلات سے دوچار کر دیتا ہے۔ بالخصوص اگر عورت شادی شدہ ہو، جس کے پاس اپنی جنسی مشکل کے حل کیلئے کوئی شرعی راستہ نہیں ہوتا۔

یہ وہ معاملات ہیں جو اس بات کا باعث ہوئے کہ ہم ذمے داری کے ساتھ شرعی طریقے سے اس موضوع کا جائزہ لیں، اسکا مطالعہ کریں اور اس بارے میں تحقیق اور غور وخوض کریں۔

سوال: خودلذتی کے نتیجے میں عورت کو پہنچنے والے نقصانات، جنہیں آپ بھی مانتے ہیں، کیا اس عمل کے حرام قرار دیئے جانے کی دلیل نہیں؟

جواب: ہم نہیں سمجھتے کہ مذکورہ حالات میں خودلذتی کا نقصان اس قدر زیادہ ہے جس کی بنیاد پر اس کے حرام ہونے کا حکم دیا جا سکے۔ اور پھر جیسا کہ فقہا کا اجماع ہے، کہ اس عمل کے حرام قرار دیئے جانے کی وجہ استمنا (masturbation) کے ذریعے منی کا خارج ہونا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مرد منی خارج کرنے کے ارادے کے بغیر اپنے عضو سے کھیلے اور خود کو منی خارج کرنے سے روکے رکھے، تو وہ استمنا اور کسی حرام عمل کا مرتکب قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس پر غسل واجب نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ روزے سے ہو، تو اسکا روزہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔ ان امور پر تمام فقہا کا اجماع ہے۔ کیونکہ تمام فقہا کی نظر میں استمنا (خودلذتی) وہی چیز ہے جو اس حکم سے سمجھ میں آتا ہے۔ یعنی ارادے اور خواہش کے ساتھ منی کا نکالنا۔

سوال: پس تو پھر اسلام نے عورتوں کیلئے سحاق (چپٹی) (homosexual) کو کیوں حرام قرار دیا ہے؟ جبکہ اِس میں منی خارج نہیں ہوتی؟

جواب: اسلیئے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان شرعی عقدِ ازدواج کی بنیاد پر قائم نہ ہونے والے ہر قسم کے غیر فطری جنسی تعلق کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا اسلام میں مرد اور مرد کے درمیان اور عورت اور عورت کے درمیان جنسی تعلق کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور شاید اسکی حکمت یہ ہے کہ خداوند عالم چاہتا ہے کہ مرد اور عورت اپنے جنسی تعلقات کو اِس شکل میں قائم کریں جس کا بندوبست خدا نے اُن کے بدن میں کیا ہے۔ کیونکہ مرد کا مرد پر اور عورت کا عورت پر اکتفا کرنا، خدا کی فطری خلقت کے برخلاف ہے۔ انسانی بدن اِس قسم کے غیر فطری جنسی تعلقات سے تناسب نہیں رکھتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِس قسم کے تعلقات کو حرام قرار دیئے جانے کی حکمت اِن تعلقات کے نتیجے میں (ازدواجی زندگی کے) فطری تعلقات کو پہنچنے والا نقصان ہو۔

سوال: اگر یہ بات ہے تو پھر یہ معاملہ کیوں استمنا کو شامل نہیں کرتا؟

جواب: جی ہاں! اُسے بھی شامل کرتا ہے۔ لیکن مرد کے بارے میں استمنا سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے خدا کو ناپسند طریقے سے منی خارج کی جائے۔ لہٰذا یہ عمل حرام ہے۔ لیکن عورت میں منی ہوتی ہی نہیں کہ اسکے عمل کو استمنا کہا جائے۔ جنسی اعضا کے ساتھ صرف کھیلنا ایسے ہی ہے جیسے انسان اپنے دوسرے اعضائے جسمانی کے ساتھ کھیلتا ہے اور اگر یہ ہیجان کے ہمراہ نہ ہو (چاہے یہ عمل انجام دینے والا مرد ہو یا عورت) اور اِس صورت میں منی نکلنے پر منتہی نہ ہو، تو حرام نہیں۔ جیسے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اِس مسئلے پر فقہا کے درمیان اجماع ہے، یہ فقط ہماری رائے نہیں ہے۔

سوال: کیا ایک عورت کا دوسری عورت پر بُری نگاہ ڈالنا جائز ہے؟

جواب: اگر بُری نگاہ کا مطلب' ایسی نگاہ ہے جس سے حرام عمل کا ارادہ ہو' مثلاً مساحقہ (چپٹی)(homosexual) کی نیت سے ایک عورت دوسری عورت کو دیکھے' تو ایسی نگاہ حرام ہے۔

سوال: ایک سیکولر مصنف کا کہنا ہے کہ اسلام جنسی عمل کو پست اور معیوب سمجھتا ہے۔ کیونکہ جنسی عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والی پستی اور ناپاکی سے پاکیزگی کیلئے اُس نے غسل کو واجب کیا ہے۔ آپ اِس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ہمارے خیال میں غسل کے بارے میں اِس طرح کی تفسیر درست نہیں۔ کیونکہ غسل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام جنسی عمل کو بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اسلام تو اِس عمل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اسے مرد اور عورت کا فطری حق سمجھتا ہے۔ حتیٰ مرد سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی زوجہ کی جنسی خواہش کو پورا کرے اور اِسکی جنسی خواہش کی پوری طرح تسکین کیے بغیر اِس سے جدا نہ ہو۔ بعض احادیث تو اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کا فعلِ حرام سے محفوظ رہنے کی خاطر جنسی عمل انجام دینا اجرِ الٰہی کا موجب ہے۔

رہی بات غسل کی' تو یہ جنسی عمل کے معنوی طور پر پست اور معیوب ہونے کی علامت نہیں۔ بلکہ اِس کا مقصد یہ ہے کہ عملِ جنابت کے بعد انسان غسل کے ذریعے معنوی اور جسمانی صفائی اور پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور مادّیات میں ڈوب جانے سے نجات حاصل کرتا ہے۔

یہ تو یہ ایک پہلو تھا' دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام جس طرح پیشاب کو ناپاک سمجھتا ہے' اِسی طرح منی کو بھی ناپاک قرار دیتا ہے اور کیونکہ جنسی عمل کے دوران پورا بدن منی کے اخراج میں شامل ہوتا ہے' گویا پورا بدن منی خارج کرتا ہے۔ لہٰذا غسل روحانی اور معنوی پہلو سے زیادہ جسمانی اور بدنی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔

اگر فقہا نے یہ کہا ہے کہ جنابت انسان کے نفس میں ایک طرح کی تاریکی کا موجب

ہوتی ہے، تو یہ اِسی نکتے سے حاصل ہونے والا نتیجہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اسکی بنیاد اور جڑ حکمِ شرعی میں نہیں ہے۔ اِس مقام پر جنابت کے روحانی اور معنوی کثافت و گندگی ہونے اور اسکے جسمانی نجاست کی علامت ہونے کے درمیان فرق ہے۔

اِس سے قطع نظر، غسل بذاتِ خود واجب نہیں ہے۔ بلکہ نماز اور اُن دوسرے امور کو انجام دینے کیلئے واجب ہے جن کیلئے طہارت و پاکیزگی شرط ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے پاس دو قسم کی طہارت ہے۔ طہارت کی ایک قسم طہارت از حدث ہے اور طہارت کی دوسری قسم طہارت از خبث ہے۔ طہارت از خبث، مادّی اور براہِ راست نجاستوں، جیسے پیشاب اور خون وغیرہ سے پاک ہونا ہے۔ اور طہارت از حدث وہ حالت ہے جس میں بدن کے ساتھ روح بھی شامل ہوتی ہے۔

ایک مثال جو ہماری مراد کو بہتر طور پر واضح کر سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کے محض سو جانے سے اِسکا وضو باطل ہو جاتا ہے۔ جاگنے کے بعد اُس پر نماز کیلئے وضو واجب ہے۔ کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ اسلام نیند کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے؟ یقیناً یہ سمجھنا فضول اور بے بنیاد ہے۔ اِس حکم میں جو راز پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ تازہ دم کر دینے والے پانی سے دھلنے کی وجہ سے انسانی جسم اور اُسکے نتیجے میں حاصل ہونے والی پاکیزگی و طہارت سے اُسکا نفس قربِ الٰہی کیلئے آمادہ ہو جائے۔ لہٰذا جنابت کے بعد غسل کا واجب ہونا نیند سے بیداری کے بعد وضو کے واجب ہونے کی مانند ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسلام نے نیند کو حقیر اور پست عمل سمجھا ہے۔ بلکہ غسل اور وضو انسان کی روحانی اور جسمانی طہارت کا ذریعہ اور خدا سے ارتباط اور اُس سے تقرب کا مقدمہ ہیں۔

کنوار پن

سوال: اہلِ مشرق، بالخصوص مسلمانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ کنوار پن کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اِس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ہمارے خیال میں معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا وہ کہتے ہیں۔ متعدد احادیث میں کنواری لڑکی سے شادی پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اِسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ کنوار پن کوئی مقدس چیز ہے۔ بلکہ اِسکی وجہ یہ ہے کہ کنواری لڑکی جس نے اِس سے قبل ازدواجی زندگی بسر نہیں کی ہوتی' وہ اپنے شوہر کے ساتھ' جو اِسکی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہوتا ہے زیادہ پیار' محبت' وابستگی اور خلوص کا احساس رکھتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ایسا انسان جس کا کسی دوسرے انسان سے پہلی مرتبہ رابطہ قائم ہوا ہو' اُسکا احساس اُس انسان سے مختلف ہوتا ہے جس کے اِس سے پہلے ایسے روابط وتعلقات قائم رہے ہوں۔

البتہ ہم اِس بات سے انکار نہیں کرتے کہ معاشرتی رسم ورواج کنوار پن کے مسئلے کو ایک فضیلت کی حد تک اوپر لے گئے ہیں۔ اور کیونکہ ازالۂ بکارت کو زور آوری اور مردانگی کی دلیل سمجھا جاتا ہے' لہٰذا کنواری لڑکی سے شادی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسے امور معاشرتی اور سماجی رسوم سے تعلق رکھتے ہیں' اِن کا دین سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہاں' دینی نکتۂ نگاہ سے بکارت عفت وپاکدامنی کی ایک علامت ہے۔ اِسکے مقابل زنا کے نتیجے میں ازالۂ بکارت بے عفتی کی نشانی ہے۔ لیکن اگر ازالۂ بکارت فطری طریقے سے ہوا ہو۔ یعنی اِسکی وجہ شادی یا کھیل کود ہو' تو بکارت کا نہ ہونا کوئی منفی اور ناپسندیدہ بات نہیں ہے' اِسی طرح جیسے ہم نے بیان کیا کہ بکارت اور کنوار پن بھی کوئی مقدس اور فضیلت والی چیز نہیں ہے۔

ازدواجِ موقت (متعہ)

سوال: بعض لوگ متعہ کے تمام جزئیات' اِسکے محرکات' اِسکے تجربات اور اِسکے نتائج کو نظر میں رکھ کر اِسے زنا کو قانونی قرار دینے یا دوسرے درجے کی شادی کے مترادف سمجھتے ہیں' جس میں عورت کی تذلیل ہوتی ہے اور وہ ایک عام زوجہ کی حیثیت سے اپنے حقوق (وراثت اور بچے کی دیکھ بھال وغیرہ) سے محروم رہتی ہے؟

جواب: اگر اِس سوال کے دائرے میں متعہ کے موضوع پر گفتگو کریں، تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا جنسی عمل مرد اور عورت کیلئے معیوب اور ذلت آمیز بات ہے، کہ جس کے نتیجے میں اُن کی شخصیت اور حیثیت پامال ہو جاتی ہے؟ یا یہ کہ جس طرح کھانا پینا انسان کی فطری ضرورت ہے، اسی طرح اس نفسانی خواہش کی تسکین بھی ایک فطری ضرورت ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم جنسی عمل کو مذموم، نجس اور معیوب شمار نہیں کر سکتے، یا اِسے انسان کی شخصیت کے انحطاط کا سبب قرار نہیں دے سکتے۔ اگر ایسا ہو، تو ہمیں دائمی عقد میں بھی جنسی عمل کو معیوب اور باعثِ ذلت سمجھنا چاہیئے۔

لہٰذا جنسی عمل بذاتِ خود معیوب اور ناپسندیدہ نہیں ہے۔ اسلام نے کوشش کی ہے کہ جنسی مسئلے کو بھی کھانے پینے اور انسان کی دوسری جسمانی ضروریات سے تعلق رکھنے والے مسائل کی مانند حل کرے۔

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اسلام نے (خواہ ایک معین مرحلے کیلئے ہی سہی) متعہ کو ایک قانون کے طور پر وضع کیا ہے؟ یا نہیں، ایسا نہیں کیا؟

تمام مسلمان متفق ہیں کہ اسلام نے اِس قسم کا قانون وضع کیا ہے۔ لہٰذا (چاہے خاص حالات ہی کیلئے سہی) اسلام کی طرف سے متعہ کو قانونی قرار دیا جانا اِس بات کی دلیل ہے کہ متعہ کی صورت میں جنسی عمل عورت (اور مرد) کی شخصیت اور حیثیت کے انحطاط و تحقیر کا باعث نہیں ہے۔ کیونکہ متعہ میں جنسی عمل، دائمی نکاح میں جنسی عمل ہی کی مانند ہے اور عورت کی عزت و احترام کی پامالی کا موجب نہیں۔ وگرنہ کیونکر ممکن ہے کہ خداوند عالم ایک ایسا قانون مقرر کرے جو عورت کی شخصیت کی تحقیر و تذلیل کا سبب ہو، جبکہ وہ کہتا ہے کہ: وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۷۰)

البتہ اِس مسئلے پر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے کہ کیا متعہ کو دائمی ازدواج کی طرح ایک ہمیشہ رہنے والا اصول قرار دیا گیا ہے، یا اِسے صرف ایک خاص زمانے کیلئے وضع کیا گیا ہے؟

لیکن پہلے ہم اِس بنیادی سوال کا جواب دیں گے کہ آخر متعہ کی ضرورت کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ امر اُن حالات میں انسان کی جنسی ضرورت کو حل کرتا ہے جب اسکے لئے دائمی عقدِ نکاح ممکن نہ ہو‘ یا یہ کہ بنیادی طور پر یہ جنسی مشکل کے حل کی ایک عمومی راہِ حل ہے۔ ہر چند یہ قانون اُن جنگی حالات میں وضع ہوا جب مسلمانوں کو جنسی مسئلہ درپیش تھا (۱) لیکن یہ صرف جنگی حالات سے مخصوص نہیں۔ بلکہ اُن تمام حالات کو شامل کرتا ہے جن میں انسان اپنی زوجہ تک دسترس نہیں رکھتا‘ یا اسکے لئے دائمی نکاح ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً جب وہ حالتِ سفر میں ہو‘ یا تعلیم میں مشغول ہو‘ یا دشوار مالی اور سلامتی (security) کے مسائل سے دوچار ہو‘ یا اور کچھ مشکلات اسے درپیش ہوں۔

یعنی اگر دائمی نکاح سے بھی انسان کی جنسی مشکل حل نہ ہو‘ تو اُسکے سامنے متعہ کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر معاشرے میں متعہ عام ہو جائے اور یہ سماجی رسوم و رواج کا حصہ بن جائے‘ تو مرد اور عورت زنا کا سہارا لینے کی بجائے بغیر کسی رکاوٹ اور مشکل کے متعہ کے ذریعے اپنی جنسی ضروریات کی تسکین کر سکتے ہیں۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ جنسی عمل مرد اور عورت کیلئے کوئی معیوب اور بُری بات نہیں ہے۔ خداوند عالم نے زنا کو حرام قرار دیا ہے‘ کیونکہ زنا میں بچوں اور عائلی زندگی سے متعلق کسی قانون کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں عورت اپنے آپ کو فروخت

۱۔ صحیح مسلم‘ جلد ۲‘ باب نکاح المتعہ‘ حدیث نمبر ۳۴۰۴ میں ہے کہ: قیس کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ کو کہتے سنا کہ: ہم ایک جنگ میں رسول اللہؐ کے ہمراہ تھے۔ ہماری بیویاں ہمارے ساتھ نہ تھیں۔ ہم نے رسول اللہؐ سے کہا: کیوں نہ ہم اپنے آپ کو اختہ کر لیں؟ آنحضرتؐ نے ہمیں اس عمل سے منع کیا اور اِسکے بعد ہمیں اِس بات کی اجازت دی کہ ہم کچھ مدت کیلئے عورتوں کو اپنے نکاح میں لے آئیں۔ پھر عبداللہ نے اِس آیت کی تلاوت کی: يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (اے ایمان والو! جن چیزوں کو خدا نے تمہارے لئے حلال کیا ہے‘ اُنہیں حرام نہ بناؤ‘ اور حد سے تجاوز نہ کرو کہ خدا تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۸۷)

کرتی ہے۔ جبکہ متعہ ایک قسم کی شادی ہے' جس میں عورت اور مرد (چاہے عارضی مدت کیلئے ہی سہی) میاں بیوی کے طور پر جنسی عمل انجام دیتے ہیں۔ اِس قسم کی شادی میں عورت بغیر کسی ہچکچاہٹ' پریشانی اور احساسِ گناہ کے اپنے شوہر کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتی ہے۔ کیونکہ عقدِ نکاح طرفین کو یہ اطمیان دیتا ہے کہ اُن کا یہ باہمی تعلق پاکیزہ اور شرعی حدود و ضوابط کے مطابق ہے۔

متعہ کے نتیجے میں اگر مرد اور عورت کے ملاپ سے کوئی بچہ جنم لے تو عقدِ متعہ میں اِسکے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر مستند طور پر ثابت کیا جا سکے کہ اِسکی ماں اور باپ کے درمیان عقد برقرار ہوا تھا اور وہ اِسی قانونی نکاح کا نتیجہ ہے' تو ایسا بچہ اپنے والدین کا شرعی اور قانونی بچہ ہے۔

رہی بات یہ کہ متعہ میں عورت کے نفقے اور میراث کی ذمے داری نہیں لی گئی ہے۔ تو اِس سلسلے میں عرض ہے کہ اس عقد کی ماہیت کا یہی تقاضا ہے۔ متعہ کیلئے تیار ہونے والی عورت اپنے اختیار اور مرضی سے اِس شرط کو قبول کرتی ہے۔ پھر یہ کہ اکثر متعہ ایسا مرد کرتا ہے جو گھر گھرستی کا بندوبست نہیں کر سکتا اور معاشی دباؤ کی وجہ سے عورت کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ متعہ ایک عارضی شادی ہے' نہ کہ دائمی نکاح۔

لہٰذا جیسا کہ سوال میں ذکر ہوا ہے' اُسکے برخلاف' متعہ میں کوئی منفی پہلو نہیں پایا جاتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ متعہ دائمی نکاح پر منفی اثرات مرتب کرے۔ لیکن اگر ہم یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ جب انسان سخت اور مشکل حالات میں گھرا ہوا ہو' جن کی وجہ سے اُسکے لئے دائمی نکاح ناممکن ہو' تو ایسی صورت میں متعہ پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اِس صورت میں ہمیں محسوس ہوگا کہ یہ ایک فطری امر ہے اور دائمی نکاح میں خلل واقع نہیں کرتا' اور مرد یا عورت کسی کی بھی شخصیت' عزت اور وقار کو نہیں گھٹاتا۔

متعہ کے موضوع میں دوسرا قابلِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کے جواز کا اعلان کرنے کے بعد اِس حکم کو منسوخ کر دیا تھا' اِسے باطل اور حرام

قرار دے دیا تھا، یا نہیں، ایسا نہیں کیا تھا؟

شیعوں اور اہلِ سنّت کے درمیان اِسی نکتے پر اختلاف ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اِس حکم کو منسوخ نہیں کیا گیا ہے، اور یہ اب بھی باقی ہے۔ لیکن اہلِ سنّت کا عقیدہ ہے کہ یہ سنّت منسوخ ہو چکی ہے اور اِس پر عمل جائز نہیں ہے۔

اگر ہم یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ متعہ کا قانون اب بھی اِسی طرح برقرار ہے، تو اِس صورت میں ہمیں اِس قانون کو اُن حالات میں جنسی مشکل کے حل کی راہ سمجھنا چاہیے جن حالات میں دائمی نکاح کے ذریعے اِس مشکل کے حل کا امکان موجود نہ ہو۔

متعہ اور قانونی زنا

سوال: زنا کا رشتہ بھی، بالخصوص مغربی ممالک میں، طرفین کی رضامندی یا مادّی معاوضے کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اِس رشتے اور متعہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور کس دلیل کی بنیاد پر اوّل الذکر تعلق حرام اور ثانی الذکر تعلق حلال ہے؟

جواب: زنا (خواہ وہ رضامندی کے ساتھ ہو) اور نکاح (چاہے وہ دائمی ہو چاہے موقت) کے درمیان فرق وہ معاہدہ ہے جو عورت اور مرد کے درمیان نکاح کے ارادے کو بیان کرتا ہے۔ یہ چیز نکاح میں پائی جاتی ہے، لیکن زنا کے تعلق میں موجود نہیں ہوتی۔

اسلام چاہتا ہے کہ نکاح کو (چاہے وہ دائمی ہو یا موقت) عائلی یا جنسی تعلق کے مباح ہونے کا ذریعہ قرار دے۔ پس لازم ہے کہ اِسے شرعی اور قانونی شکل دی جائے۔ طرفین کی طرف سے صرف اظہارِ رضامندی معاملے کو شرعی جواز فراہم نہیں کرتا۔ کیونکہ تمام معاملات خواہ وہ حلال ہوں یا حرام طرفین کی رضامندی سے انجام پا سکتے ہیں۔ حتیٰ سودی معاملے میں بھی طرفین کی رضامندی شامل ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ غیر شرعی معاملہ ہے۔ جبکہ معاہدہ طرفین کی رضامندی میں رشتے و تعلق کے قیام پر مبنی ان کے شعوری ارادے کا اضافہ کر دیتا ہے۔

مغرب اور کسی بھی دوسری جگہ زنا کا تعلق، عام طور پر طرفین کی رضامندی پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن یہ تعلق ازدواجی اور عائلی زندگی کے قیام کے ارادے پر استوار نہیں ہوتا۔ مثلاً طرفین ابتداً ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور اُسکے بعد شادی کرتے ہیں۔ چند کے سوا اکثر ممالک کے قوانین میں پہلے تعلق یعنی زنا کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تعلق کسی معاہدے (عقد) کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا ہوتا۔ لہٰذا حتیٰ مغرب نے بھی زنا کو قانونی حیثیت نہیں دی ہے۔ حالانکہ زنا کے مرتکب مرد پر زنا کی مرتکب عورت کے اور زنا کار والدین پر زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کے حقوق عائد کئے ہیں لیکن خود زنا کو قانونی حیثیت نہیں دی ہے۔ مغرب میں زنا زادے کو "ناجائز بچہ" کہا جاتا ہے۔ حتیٰ اگر اِسکے والدین متعین ہوں، تب بھی۔ علاوہ ازایں ازدواجی زندگی سے باہر کسی بھی قسم کے جنسی تعلق کو وہاں بھی خیانت شمار کیا جاتا ہے اور خیانت کے مرتکب فرد کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

۱۱

ادبیات کے احکام

ادبیات کے احکام

یاس وناامیدی پر مبنی ادب

سوال: کیا مسلمان ادیب کیلئے جائز ہوگا کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو تشویش واضطراب پیدا کرنے کا باعث، ہو خواہ اس نے ایسا قصداً نہ کیا ہو؟

جواب: اس سلسلے میں مختلف مسائل ہیں:

کچھ ادبیات ایسی ہیں جو حقائق کو سخت اور پیچیدہ مشکلات کی صورت میں دیکھتی ہیں، اور ایسا ظاہر کرتی ہیں کہ اِن پیچیدگیوں اور دشواریوں کی کوئی راہِ حل موجود نہیں۔ حتیٰ قدرتِ خداوندی بھی اِن کا حل پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اِس قسم کی ادبیات ایسے فکری انحراف سے دوچار ہیں جو خداوند عالم کے قادرِ مطلق ہونے کے بارے میں ایمان کے فقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ نکتہ اُس آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے، جس میں حضرت یوسف کے غائب ہونے کے بارے میں حضرت یعقوبؑ کی اپنے بیٹوں سے ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ: یٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (میرے فرزندو! جاؤ یوسف اور اُن کے بھائی کو خوب تلاش کرو، اور رحمتِ خدا سے مایوس نہ ہونا کہ

اِسکی رحمت سے کافر قوم کے علاوہ کوئی مایوس نہیں ہوتا۔ سورہ یوسف ۱۲۔ آیت ۸۷)

اِس آیت کی رو سے خدا کی رحمت سے نا امیدی، یعنی مسائل کے حل کے سلسلے میں اُسکے دروازۂ رحمت کو بند سمجھ کر مایوسی کا شکار ہو جانے اور اسکے قادرِ مطلق ہونے سے انکار کے ذریعے اظہارِ کفر کے درمیان ایک تعلق اور رابطہ موجود ہے۔

مسلمان ادیب کیلئے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ، کائنات، زندگی اور خدا کی لامحدود قدرت و طاقت سے تعلق رکھنے والے اسلامی مفاہیم سے اپنے قصوں، شعروں، خاکوں اور تجزیوں میں استفادہ کرے۔ یعنی اُس کی گفتگو ایمان کے دائرے میں انجام پائے۔

البتہ ایسا حزنیہ اور المناک ادب بھی تخلیق ہوتا ہے جس میں نا تمام آرزوئیں، تکلیف دہ اور مشکل حالات، جو کائنات، تاریخ اور انسان کے بارے میں خدا کی سنّتوں میں سے ہیں، اِس طرح بیان کئے جاتے ہیں کہ قصے یا شعر کا مضمون انسان پر طاری مشکل پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں خدا کی طرف سے نازل ہونے والی مصیبتوں، بھوک، جانی و مالی اور پیداواری نقصان کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں اِس قسم کے مسائل بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اِن میں خدا کی قضا وقدر اور اِن واقعات کے اسباب و موجبات سے تعلق کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، جو ایک زندہ حقیقت اور معاملات و امور میں تقدیرِ الٰہی کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں۔ خود خداوند عالم نے بھی قرآنِ مجید میں اِس قضا وقدر کی جانب اشارہ کیا ہے: قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (اس نے ہر شے کیلئے ایک مقدار معین کردی ہے۔ سورہ طلاق ۶۵۔ آیت ۳)۔ اسی طرح اسکا فرمان ہے کہ: ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ (لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آ گیا ہے، تا کہ خدا اِن کے کچھ اعمال کا مزہ چکھا دے، تو شاید یہ لوگ پلٹ کر راستے پر آ جائیں۔ سورہ روم ۳۰۔ آیت ۴۱)۔ نیز اِسی کا ارشاد ہے کہ: وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً یَّاْتِیْھَا

رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللهِ فَاَذَاقَهَا اللهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (اور اللہ نے اس بستی کی بھی مثال بیان کی ہے جو محفوظ اور مطمئن تھی اور اِسکا رزق ہر طرف سے باقاعدہ آ رہا تھا۔ لیکن اِس بستی کے رہنے والوں نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا' تو خدا نے اِنہیں بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھا دیا' صرف اِن کے اُن اعمال کی بنا پر جو وہ انجام دے رہے تھے۔ سورہ نحل ۱۶۔ آیت ۱۱۲)

اِن آیاتِ قرآنی کے علاوہ دوسری آیات بھی ہیں جن میں معاملات وامور کے اُس منفی رخ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کی حقیقتوں سے ہے اور جن کا سبب وہ امور ہوتے ہیں جو کبھی تو انسان کے ارادے اور اختیار میں ہوتے ہیں اور کبھی اُن کا تعلق خارج سے ہوتا ہے اور خود اُس انسان کا اُن میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔

مسلمان ادیب (شاعر اور نثر نگار) کو چاہئے کہ وہ زندگی کے روشن پہلو پر زور دے۔ کائنات پر خدا کی نظر کرم اور انسان پر اُسکی رحمت' جس کے تحت وہ پیچیدہ صورتوں میں انسان کیلئے راہ حل نکالتا ہے' جہاں روزی کی امید نہیں ہوتی وہاں روزی پہنچاتا ہے' جہاں اسکا کوئی آسرا نہیں ہوتا وہاں اسے اپنی پناہ فراہم کرتا ہے اور جب انسان سخت حالات میں خدا پر توکل کرتا ہے تو وہ اسے نجات دلاتا ہے' حاجت روائی کے سلسلے میں اسکی دعائیں قبول کرتا ہے' اور سختی اور تنگی کے بعد اسے آسانی و کشائش فراہم کرتا ہے جیسے مسائل پر تاکید کرے۔

مسلمان ادیب کو چاہئے کہ اِس طرح نیک فال کی جستجو میں رہے' نہ کہ بدشگونی پھیلائے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نیک فال کو پسند کرتے تھے اور بدفالی کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

کبھی کبھی حقائق بھیانک اور تاریک ہوتے ہیں لیکن مسلمان ادیب کا فرض ہے کہ وہ روشن اور امید افزا پہلوؤں کی جانب توجہ دلائے۔ آسمان پر چمکتے ستاروں کی مانند کہ انتہائی تاریکی میں اُن کا نور انسان کو روشنی اور طلوع فجر کی نوید دیتا ہے۔

اسلام کا متوازن راستہ یہ ہے کہ خدا سے تعلق کے نتیجے میں انسان کی دلی امید زندہ

رہے۔ اور وہ اِس طرح کہ وہ راستوں کی بندش کو صرف ایک عارضی مرحلہ سمجھے اور اِس بات پر یقین رکھتا ہو کہ مستقبل میں خدا کی قدرت اِن راستوں کو کھولنے پر قادر ہے۔

مذکورہ امور کا لحاظ رکھنا اِس بات کا سبب ہوگا کہ مسلمان ادیب ایک ممتاز ادیب کے طور پر اپنے فنی کردار، اپنے افکار، اپنے تخلیق کردہ اشعار اور داستانوں کے ذریعے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے والا بن جائے گا۔

سوال: کیا مسلمان افسانہ نگار اور کہانی نویس کیلئے جائز ہے کہ وہ اپنے افسانے یا کہانی کو افسوسناک انجام، مثلاً خودکشی پر ختم کرے؟

جواب: حقیقت کی تصویر کشی کے طور پر وہ منفی حالات جو اِس فعل کا سبب بنے، وہ ایمانی خلا جو اِس شخصیت میں پایا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ خدا سے غافل ہوگئی تھی جیسے امور کی جانب اشارے کے ہمراہ اِس عمل میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اِسکے باوجود جذباتی، نفسیاتی اور مادّی مشکلات سے مقابلے کے اِس طریقے کو ناپسندیدہ قرار دیا جانا چاہیۓ۔ اور کہانی کو حقیقت کی صحیح صحیح عکاسی کرتے ہوئے، ایسی شخصیت میں پوشیدہ منفی پہلوؤں کی جانب اشارہ کرنا چاہیۓ اور اپنے قاری کو اِس جانب متوجہ کرنا چاہیۓ کہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اِس قسم کے منفی احساسات پر غلبہ پائے۔ تاکہ یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ افسانہ یا کہانی اِس شخصیت کے بارے میں قاری کے جذبات و احساسات کو اُبھار کر اُسے ایک شہید کا درجہ دے رہے ہیں اور دوسروں کو ایسی ہی خودکشی کی ترغیب دے رہے ہیں۔

ادبیات کو ایسا نہیں ہونا چاہیۓ کہ وہ انسان کو زندگی کی سختیوں اور مصائب کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کی تعلیم دیں۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیۓ کہ اِن امور کے اسباب و علل اور منفی نتائج کا کھوج لگائیں اور انسان کے شعور کو اُن مثبت ذرائع و وسائل سے آگاہ اور مربوط کریں جن کے ذریعے اِن حالات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

سوال: کیا کہانی نویس کیلئے جائز ہے کہ وہ جنسی مناظر کی تصویر کشی کرے' اور خوابگاہ میں داخل ہو جائے؟ اِن امور کی شرعی حدود کیا ہیں؟

جواب: یہ عمل اُس صورت میں ناجائز ہے' جب اِس قسم کے مناظر کی تصویر کشی' یا اِنہیں بیان کرنا اور تمام تفصیلات کے ساتھ اِن کا ذکر کرنا ایسے جنسی ہیجان کا سبب بنے جس کا نتیجہ اخلاقی فساد اور گمراہی کی صورت میں برآمد ہو۔ بالخصوص جبکہ یہ عمل کھلم کھلا جنسی ہیجان پیدا کرے اور گھٹیا انداز کے ساتھ کسی صحیح فائدے اور درست مقصد (مثلاً اِس بارے میں مثبت رہنمائی) کے بغیر ہو۔ لیکن اگر کہانی با مقصد ہو' جس کے بعض اشارات اور گوشے کسی خاص حادثے کی تصویر کشی کو ضروری قرار دیں' تو ایسی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مثلاً حضرت یوسفؑ کی داستان میں اور عزیزِ مصر کی زوجہ کی اِن کے یہاں آمد و رفت' حضرت یوسفؑ کی پاکدامنی' شہر کی عورتوں کی جانب سے انہیں دعوت دیئے جانے اور حضرت یوسفؑ کے خدا سے نجات کی درخواست کرنے وغیرہ جیسے امور میں' جن کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے' ایسے اشارے اور گوشے دکھائی دیتے ہیں۔

ایسی داستانیں جن میں نفسانی خواہشات کی سرکشی پر انسان کے ارادۂ ایمانی کے غلبے کی عکاسی ہوتی ہو' اُن کے دوران بعض جنسی موارد کا اِس انداز سے ذکر کرنا کہ یہ تصویر کشی پاکدامنی کی حمایت و تقویت کیلئے ہو' کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔

اِس کے ساتھ ساتھ مسلمان ادیب کو کوشش کرنی چاہئے کہ اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو قاری کو صرف اِسکے بے بنیاد خیالات سے نکالنے اور اخلاقی شعور سے نزدیک کرنے کیلئے استعمال کرے۔

سوال: کیا کسی سچے قصے میں رنگا رنگی اور جذابیت پیدا کرنے کی غرض سے کمی بیشی کرنا جائز ہے؟

جواب: اِس صورت میں اِس عمل میں کوئی مضائقہ نہیں جب اِس بات پر کوئی ایسا قرینہ موجود

ہو جو یہ ظاہر کرے کہ مضمون اور مشمولات کی مراد ٹھیک حقیقت کا بیان نہیں بلکہ اِس سے بلند اور ارفع ہدف کا حصول پیش نظر ہے۔ اور ممکن ہے قرآنِ کریم کے بہت سے قصے بھی اسی طرح کے ہوں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں ایک ہی داستان مختلف انداز اور طریقوں سے دُہرائی گئی ہے۔ اِن داستانوں میں فکر، عقیدے اور اخلاق کو صحیح رخ دینے کیلئے اشاروں کنایوں کے اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔

شعر و شاعری

سوال: بعض احادیث رمضان المبارک میں شعر پڑھنے کو مکروہ قرار دیتی ہیں۔ آپ کی نظر میں شرعی لحاظ سے اِن احادیث کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: اِن احادیث میں شعر کا نغماتی پہلو پیشِ نظر ہے، جو ممکن ہے روزے دار شخص کی کیفیت اور ماہِ رمضان کی فضا سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ''حماد'' کی روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابا عبداللہ (امام جعفر صادقؑ) سے سنا کہ آپؑ فرما رہے تھے: **یکرہ روایۃ الشعر للصائم و للمحرم وفی الحرم فی یوم الجمعۃ من اللیل. قلت وان کان شعر حق. قال: وان کان شعر حق** (روزہ دار اور محرم شخص پر اور حرم کے اندر اور جمعہ کے دن (شبِ جمعہ سے) شعر پڑھنا مکروہ ہے۔ آپؑ سے سوال کیا گیا: خواہ حق پر مشتمل شعر ہی کیوں نہ ہو؟ امامؑ نے جواب دیا: ہاں، چاہے حق پر مشتمل ہی کیوں نہ ہو)

شاید اِس مسئلے کی اور بھی کچھ وجوہات ہوں، جن پر گفتگو کو اِس کے مناسب مقام کیلئے چھوڑ دینا چاہئے۔ بہر صورت (کراہت کا) یہ حکم عنوانِ اوّلی کے لحاظ سے ثابت ہے۔ لیکن اگر بالفرض عنوانِ ثانویہ وجود میں آ جائیں، تو وہ اِس ''کراہت'' کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ (واللہ العالم)

سوال: عادل یا ظالم حکمراں کی مدح سرائی اور تعظیم کیلئے قصیدہ گوئی کے بارے میں شرعی

موقف کیا ہے؟

جواب: اپنے اوصاف' اعمال اور کردار کے لحاظ سے عادل حاکم جس قدر تعریف کا مستحق ہے اُس سے زیادہ اِسکی بھی مدح وتعریف جائز نہیں۔ ایک حدیث میں مومن کی نشانیوں کے بارے میں آیا ہے کہ: ''مومن وہ ہے جس کا کسی کو پسند کرنا (اُس سے خوش ہونا) گناہ اور سخنِ باطل کا سبب نہیں بنتا۔'' اور سخنِ باطل سے مراد نااہل شخص کی تعریف ومدح میں جھوٹ بولنا ہے۔ یہ عمل تعریف کرنے والے شخص پر لوگوں کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچاتا ہے۔

مذکورہ حکم اِس صورت میں ہے جب اُسکی مدح آمیز اور قابلِ تعریف صفات شعر میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہوں۔ لیکن اگر عمومی طور پر اُسکی شخصیت اور مرتبے کی عظمت بیان کی گئی ہو' اور اسمیں اسکی تفصیلات کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور وہ ممدوح شخص بھی واقعی ان صفات کا حامل ہو' تو ایسا کرنا جائز ہے۔

جہاں تک رہی بات ظالم حاکم کی مدح سرائی کی' تو یہ عمل اِس لحاظ سے بھی حرام ہے کہ جھوٹ بولا جارہا ہے اور اِس اعتبار سے بھی حرام ہے کہ ستمگر حاکم کی تائید وحمایت کی جارہی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ: من مدح سلطاناً جائراًاو تخفف او تضعضع له طمعاً فیه کان قرینه فی النار (جس شخص نے بھی کسی ظالم بادشاہ کی مدح سرائی کی' یا اپنے آپ کو اُس کے سامنے حقیر اور خاضع بنا کے پیش کیا' وہ جہنم میں اِس حاکم کا ہم نشین ہوگا۔ وسائل الشیعہ ۔ ج ۱۷۔ ص ۱۸۴۔ روایت ۲۲۳۰۶)

سوال: مذمت' ہجو' دشنام اور کنایہ پر مشتمل اشعار کی شرعی حدود کیا ہیں؟

جواب: مومن کی ہجو (بدگوئی) جائز نہیں' جس میں اُسکے عیب گنائے جاتے ہیں' اُسکی تحقیر کی جاتی ہے' اُس پر گالم گلوچ کی جاتی ہے اور اُسکی طرف بُرے اشارے کیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ عمل (اگر انشائی جملے کی صورت میں ہو تو) ھمز اور لمز یعنی مومن کی اہانت' ہتک'

عیب جوئی اور اُس پر طعنہ زنی کا موجب ہے' جس کی قرآنِ کریم اور سنّتِ مطہرہ میں ممانعت کی گئی ہے۔

قرآنِ مجید میں عیب جوئی اور طعنہ زنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (تباہی و بربادی ہے ہر طعنہ زن اور عیب جو کیلئے۔ سورہ ہمزہ ۱۰۴۔ آیت ۱) لیکن اگر جملے کا انداز خبری ہو اور مذمت اور ہجو کا مضمون اُس فرد کی واقعی صورتحال کے مطابق ہو' تو یہ عمل غیبت' ہتک' اہانت' عیب جوئی اور طعنہ زنی کے اعتبار سے حرام ہے۔ اور اگر خلافِ واقع یا خلافِ حقیقت ہو' تو جھوٹ' بہتان اور الزام طراشی کی بنا پر حرام ہے۔

لیکن ایسے لوگوں کی ہجو کرنا جو اِسکے مستحق ہیں' یعنی ظالم' دین میں بدعت شامل کرنے والے اور گمراہ افراد' تو معاشرتی میدان میں ایسے لوگوں سے مقابلے اور سماج میں اُن کے اثرات کی روک تھام کیلئے ایسے لوگوں کی ہجو جائز ہے۔

البتہ ایسے شخص کی ہجو جائز نہیں ہے جو اِسکا مستحق نہ ہو' خواہ وہ کسی اور دین و مذہب اور مسلک کا ماننے والا ہو یا ہمارا ذاتی مخالف ہو۔ کیونکہ یہ عمل ظلم ہے اور خدا نے قرآنِ مجید میں فرمایا ہے کہ: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (اور کسی قوم کی عداوت تمہیں اِس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف کا دامن چھوڑ بیٹھو۔ انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔ سورہ مائدہ ۵۔ آیت ۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں بھی مومن کی صفت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: اذا سخط لم يخرجه سخطه عن قول الحق (جب کبھی وہ کسی پر غضبناک ہوتا ہے' تو اُسکا یہ غضب اُسے قولِ حق کہنے سے نہیں روکتا)۔ کیونکہ ایسا کرنا جھوٹ اور حقیقت کے برخلاف ہوتا ہے۔ اور جھوٹ اور خلافِ حقیقت بات کہنا مطلق جائز نہیں' چاہے وہ مسلمان کے بارے میں کہی جائے چاہے غیر مسلم کے بارے میں۔

حضرت امام علی بن الحسین زین العابدینؑ کی ایک دعا میں ہے کہ: وارزقنی التحفظ من الخطايا والاحتراس من الزلل فی حال الرضا والغضب' حتیٰ

اکون بما یرد علیّ منها بمنزلۃٍ سواءٍ عاملاًبطاعتک مؤثراً لرضاک علیٰ ماسواھما فی الاولیاء والأعداء، حتیٰ یأمن عدوی من ظلمی و جوری، و ییأس ولیّی من میلی وانحطاط ھوای (اور مجھے خطا سے دور رکھ اور لغزشوں سے کنارہ کش، اِس طرح کہ جو چیز خوشی یا ناراضی کا باعث ہوتی ہے اُس پر میرا رویہ یکساں رہے۔ بس تیری فرمانبرداری میں مشغول رہوں، اور تیرے دوستوں اور تیرے دشمنوں کے حق میں تیری خوشنودی ورضا کو اپنی رضا و رغبت پر ترجیح دوں، تاکہ میرا دشمن میرے ظلم سے محفوظ رہے اور میرا دوست میری توجہ اور میری خواہشِ نفس سے ناامید ہو جائے)

سوال: کیا یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ شعر کہنے اور سننے والا اُس عورت کو جانتے ہیں، کسی خوبصورت عورت کے حسن و جمال کی تعریف اور شعر میں اُسکے نام کا تذکرہ کرنا جائز ہے؟ اور اگر لوگ اُس عورت کو نہ پہچانتے ہوں، تو کیا حکم ہے؟ اور اگر شعر میں اُس عورت کا نام نہ لیا جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب: نظم یا نثر میں کسی خوبصورت عورت کے حسن و زیبائی کی تعریف بنیادی طور پر حرام نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ عمل مسلمان عورت کی ہتکِ حرمت کا موجب ہو جائے، جیسے کہ متدین معاشروں میں ایسی عورت کے حسن و جمال کی تعریف کو جسے لوگ جانتے ہوں، اُسکے لئے ذلت و عار، بے احترامی اور رسوائی کا موجب سمجھا جاتا ہے، تو اِس مقام پر مومن کی ہتکِ حرمت کے عنوان سے یہ عمل حرام ہے۔

لیکن ایسی عورت کی خوبصورتی و زیبائی کی تعریف، جس کا نام شعر میں نہیں لیا گیا ہو اور سننے والے کو بھی معلوم نہ ہو کہ کون عورت مراد ہے، یا شاعر ہی نے اصلاً کسی خاص عورت کو مدِ نظر نہ رکھا ہو، یا عورت کے نام کا ذکر تو ہو لیکن معاشرے میں اِس بات کو معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ بلکہ ممکن ہے کچھ معاشروں میں اِس طرح عورت کے نام کے ذکر کو اچھا خیال کیا جاتا ہو اور اِس عورت سے ازدواج کی جانب لوگوں کے مائل ہونے کا سبب سمجھا

جاتا ہو، تو وہاں یہ عمل حرام نہیں ہے۔

البتہ اِس عمل کے مباح ہونے کی صورت میں بھی، ہم اِس بات کی تاکید ضروری سمجھتے ہیں کہ عورت کے حسن و جمال کی تعریف کے دوران، اِس مخصوص عورت کے ساتھ ناجائز تعلق کے قیام کی جانب رغبت وخواہش کا اظہار نہیں ہونا چاہیئے۔

سوال: کیا شعر میں شراب کی خصوصیات کا تعریفی انداز میں ذکر کرنا جائز ہے؟ کیا یہ عمل خدا کی طرف سے ممنوع قرار دی گئی چیز کی جانب ترغیب اور بارگاہِ الٰہی میں جسارت کا باعث نہیں ہے؟

جواب: محض اتنا عمل حرام نہیں ہے، بالخصوص اگر اِس سے بعض عرفانی معانی کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن اگر کسی مقام پر یہ دوسروں کو شراب کی جانب ترغیب دینے کا باعث ہو اور حرام اور منکر کی مدح و تعریف شمار کیا جائے، تو اس موقع پر یہ عمل حرام ہے۔

بہرصورت اسلام اِس روش کو حتیٰ رمز و کنائے کے الفاظ میں بھی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ جب خدا نے کسی چیز کو اِس میں پوشیدہ مفاسد کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ لوگ ہر طرح اِس سے دور رہیں اور ایک دوسرے کو اِس کی طرف سے متنبہ اور ہوشیار کریں۔ لہٰذا واضح ہے کہ ایسی چیز کا شعر یا نثر میں محبوب و دل پذیر چیز کے عنوان سے ذکر کرنا اسلام کی رو سے مردود اور قابلِ مذمت ہے۔ کیونکہ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ مسلمان اُس چیز کو پسند کریں جسے خدا پسند کرتا ہے، اور اُس چیز سے دشمنی رکھیں، اُسے ناپسند کریں جسے خدا دشمن رکھتا اور ناپسند کرتا ہے۔

لہٰذا مومن اور صاحبِ شعور ادیب کو اِس نکتے کی جانب متوجہ رہنا چاہیئے کہ وہ اپنے شعر یا نثر کو واضح الفاظ میں یا کنایوں کے ہمراہ شراب کے ذکر سے پاک رکھے۔ کیونکہ مومن کا اندازِ بیان اسکی ایمانی روش سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

اِسکے باوجود جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے عرفانی معنی میں شراب کے ذکر میں کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔

سوال: اشعار میں، بالخصوص غزلیات میں، شعرا اپنے معشوق کے ایسے اوصاف بیان کرتے ہیں جو اُسے معبود کی حد تک بلند کر دیتے ہیں۔ معشوق کی اِس قسم کی توصیف کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: بیان کے لحاظ سے یہ عمل جائز نہیں۔ کیونکہ خداوند عالم چاہتا ہے کہ انسان فکری مضمون اور طرزِ بیاں، دونوں لحاظ سے موحد (توحید پرست) ہو۔ یعنی اِسکا بیان اور گفتگو بھی اِسکے عقیدۂ توحید سے ٹکراؤ نہ رکھتی ہو، اس سے متصادم نہ ہو، خواہ اِسکی مراد شرک نہ رہی ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیۂ قرآن: **وَ مَا یُؤمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ** (۱) کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ: **هو الرجل یقول : لولا فلان لهلكت ولولا فلان مااصبت كذاو كذاولضاع عیالی، الا تریٰ انه قد جعل لله شریكاً فی ملكه یرزقه و یدفع عنه قال: قلت فیقول لولا ان منّ الله علیّ بفلان لهلكت قال: نعم لا باس بهذا** (یہ آیت اُس شخص کے بارے میں ہے جو کہتا ہے کہ اگر فلاں نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا اور اگر فلاں نہ ہوتا تو میں فلاں چیز حاصل نہ کر پاتا وغیرہ وغیرہ اور میری زندگی برباد ہو جاتی۔ ایسے شخص نے خدا کی حکومت میں ایک ایسا شریک بنا لیا ہے جو اِسے روزی پہنچاتا ہے، اور اِسے ضرر و نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ راوی نے کہا کہ اگر وہ یہ کہے تو کیسا ہے کہ: اگر اللہ فلاں شخص کے ذریعے سے مجھ پر احسان نہ کرتا تو میں ہلاک ہو جاتا؟ امامؑ نے جواب دیا: اِس طرح کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وسائل الشیعہ ۔ج ۱۵۔ص ۲۱۵۔ روایت ۲۰۳۱۰)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث میں، جسے زرارہ نے نقل کیا ہے، ذکر ہوا

۱۔ اور اِن میں کی اکثریت خدا پر ایمان بھی لاتی ہے، تو شرک کے ساتھ۔ (سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۱۰۶)

ہے کہ میں نے امامؑ سے سوال کیا کہ اللہ رب العزت کے اِس قول سے کیا مراد ہے کہ: وَ مَا یُؤمِنُ اَکثَرُھُم بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُم مُشرِکُونَ؟ تو امامؑ نے جواب دیا کہ: من ذلک قول الرجل : لا وحیاتک (کسی شخص کا یہ کہنا بھی شرک ہے کہ: نہیں، تمہاری جان کی قسم۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۲۳۔ ص ۲۶۳۔ روایت ۲۹۵۲۹)۔ اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ کلام قرآنِ مجید کی نظر میں ناپسندیدہ ہے، جس سے شرک کی بو آتی ہو، چاہے بولنے والے نے اُسے بُرے ارادے سے نہ بولا ہو۔

لٰہذا ایک ایسی عبارت جو غیر خدا کو اس حد تک بلند کردے، جس کا ذکر سوال میں ہوا ہے (چاہے اُسکا تعلق مبالغے سے ہو) وہ اسلام کے عقیدۂ توحید سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اِس امر کی بنیاد شاید یہ ہو کہ اگر لوگ اپنی گفتگو اور کلام میں دوگانہ پرستی کی ذہنیت کے عادی ہو جائیں گے، تو بعض اوقات اپنے ذہن میں موجود اِن تعبیروں سے اُنسیت اور لگاؤ کی بنیاد پر اُن کے اثرات قبول کرنے لگیں گے، اور لاشعوری طور پر دوگانہ پرستی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ اور مسلمان ادیب و شاعر کیلئے مناسب ہے کہ وہ اِس امر سے دور رہے۔

سوال: لوگوں میں رائج ہے کہ وہ مرد شعرا کی عورتوں کے بارے میں غزلیں (عشقیہ کلام) سنتے ہیں۔ کیا اِس امر میں مرد اور عورت یکساں ہیں؟ یعنی کیا مشاعروں میں کسی عورت کے مردوں کے بارے میں عشقیہ اشعار پڑھنے میں کوئی مضائقہ ہے؟

جواب: کیونکہ اسلام بے راہ روی پر مشتمل جنسی تعلقات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، اِس لئے عورت کی طرف سے عشقیہ گفتگو اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ عشقیہ شاعری جو عربی ادبیات میں حدیثِ وصال وغیرہ تک پہنچتی ہے، حرام تعلقات کے قیام کے ایک وسیلے کے طور پر معروف ہے۔ اِس قسم کی شاعری اگر عنوانِ اوّلی کے لحاظ سے حرام نہ ہو تب بھی بعض اوقات فحش کا عنوان پالینے کی وجہ سے عنوانِ ثانوی کے لحاظ سے حرام ہو

جاتی ہے۔ لیکن اگر غزل اچھے اور پاکیزہ الفاظ کے ساتھ ہو اور اِس میں مذکورہ حرام باتیں نہ پائی جاتی ہوں تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اصولی اور بنیادی طور پر عورت کا مرد کیلیئے غزل کہنا اُسی طرح جائز ہے جیسے مرد کا عورت کیلیئے غزل کہنا جائز ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ماحول اور شرائط (Conditions) کے زیر اثر حرمت کا کوئی عنوان اِس پر لاگو نہ ہوتا ہو۔ اِسکے باوجود اِس بات پر توجہ کی ضرورت ہے کہ مردوں کے مجمع میں یا کسی مخلوط محفل میں عورت کا عشقیہ اشعار پڑھنا (بالخصوص مشرقی معاشروں میں) جنسی ہیجان کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا بعض حالات میں یہ جائز نہیں ہے۔

سوال: کیا تصوراتی داستانیں دروغ میں شامل ہیں؟ سبق آموزی اور تعلیم و تربیت کی غرض سے بنائی جانے والی خیالی داستانوں کے بارے میں حکمِ شرع کیا ہے؟

جواب: نہیں، ایسی داستانیں جھوٹ میں شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ جھوٹ سے مراد خلافِ حقیقت بات کو حقیقت کے طور پر ظاہر کرنا ہے۔ جھوٹ میں انسان کا مقصد ایک (خلافِ حقیقت) بات کو حقیقت کے طور پر بیان کرنا ہوتا ہے۔ لیکن خیالی داستانوں میں حقیقت اور واقعیت کا بیان پیش نظر نہیں ہوتا، بلکہ اِسکا فنی پہلو مدِ نظر ہوتا ہے۔

خیالی داستانوں کا مقصد چاہے کسی فکر یا نظریے کی تصویر کشی اور اُسکی گہرائی بیان کرنا ہو، یا کسی بُرائی کے منفی پہلو کو سامنے لا کر اُسکی اصلاح مقصود ہو، یا اُسکا مقصد لوگوں کو خدا سے نزدیک کرنے کی خاطر وعظ و نصیحت ہو، یا لوگوں کو اخلاقی، معنوی اور اجتماعی اسلامی اقدار سے قریب کرنا مطلوب ہو، ایسی داستانیں جھوٹ میں شامل نہیں ہیں۔

سوال: کیا ایسے ادبی مقابلوں میں شرکت جائز ہے، جن کا اہتمام دشمنانِ اسلام کی جانب سے کیا جاتا ہے؟

جواب: اگر یہ عمل اُن کی حوصلہ افزائی کا باعث نہ بنتا ہو اور اِس کی وجہ سے اُن سے قطع تعلق اور اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور ادبی امور میں اُن کے ساتھ عدم تعاون کے ضروری ہونے کے اسلامی موقف کو گزند نہ پہنچتی ہو (جیسے صہیونیوں سے تعلقات، جو انسانوں میں اہلِ ایمان کے سب سے سخت ترین دشمن ہیں) نیز مقابلے کا موضوع بھی اسلامی عقائد اور اخلاقی اقدار کیلئے ضرر رساں نہ ہو، تو ایسے مقابلوں میں شرکت میں مضائقہ نہیں۔

اِس بنیاد پر اسرائیل کے ثقافتی مراکز کی جانب سے منعقدہ مقابلوں میں شرکت جائز نہیں۔ کیونکہ اِس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون شرعاً حرام ہے۔

سوال: پروردگارِ عالم سورۂ صف میں فرماتا ہے کہ: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا سبب ہے کہ تم وہ کہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو۔ سورۂ صف ۶۱۔ آیت ۳) اور سورۂ شعراء میں فرماتا ہے کہ: وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (اور یہ وہ کچھ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۲۲۶) کیا اِس بنیاد پر خدا کے نزدیک بعض اشعار ناپسندیدہ ہیں؟ اگر ایسا ہے، تو وہ کونسے اشعار ہیں؟

جواب: اِن آیات میں جس چیز کو ناپسندیدہ اور قبیح قرار دیا گیا ہے، وہ وہ اشعار ہیں جو نہ تو حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں اور نہ اِن سے ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ باطل کی طرف دعوت کا ذریعہ ہیں۔ اور اُس مسافت کی نشاندہی کرتے ہیں جو قول اور عمل کے درمیان فاصلہ پیدا کرتی ہے۔ اور باطل اور زور زبردستی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

خداوندعالم نے سورۂ شعراء میں حق وحقیقت کی راہ پر چلنے والے بامقصد اور باایمان شعرا کو گمراہوں سے ممتاز کیا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (علاوہ اُن شعرا کے جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک اعمال کئے اور بہت سارا ذکرِ خدا کیا اور ظلم سہنے کے بعد مدد طلب کی۔ سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۲۲۷)۔ یعنی اسلام شعر اور شاعروں کی مذمت نہیں کرتا، بلکہ منحرف اور گمراہ کن

اشعار اور ایسے شعر کہنے والے شعراء کی مذمت کرتا ہے۔

سوال: کیا اسلام میں اسلامی ادب (شعر ونثر) کیلئے معین خصوصیات کا تعین کیا گیا ہے؟
جواب: اسلام میں اصطلاحی مفہوم میں اسلامی ادبیات کیلئے معین خصوصیات بیان نہیں کی گئی ہیں۔ لیکن اسلامی ادب کو انسانی حیات میں اسلامی افکار، مفاہیم، اقدار اور اعمال کا ترجمان ہونا چاہئے۔ اور وہ اِس طرح کہ مسلمان ادیب اِن عناصر کو اپنی روح میں پروان چڑھائے اور اپنے فن اور رجحانات میں دوئی اور دوگانگی کا احساس نہ کرے، اور ایسا نہ ہو کہ اپنی عبادی زندگی میں تو وہ مسلمان ہو اور اپنے فن اور ادب میں غیر مسلم۔

۱۲

انتخابات کے احکام

انتخابات کے احکام

سوال: نظریۂ ولایتِ فقیہ کی رو سے جب ولیٔ فقیہ حکومتی امور میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، تو پھر انتخابات کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: اِس نظام میں انتخابات کی ضرورت اسلئے ہے کہ بعض اوقات فقیہ خود لوگوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُن سے مشورت کو مصلحت سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی فقیہ کیلئے کسی مسئلے کی جزیات تک پہنچنا لوگوں کی آراء و نظریات کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہری بات ہے کہ جو مسائل لوگوں کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، اُن میں اُن کی رائے معلوم کی جانی چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے باہمی مشورت کو اپنے آئیڈیل معاشرے کی خصوصیات میں شمار کیا ہے۔ حتیٰ پیغمبرؐ سے، جنہیں دوسروں سے مشورت کی ضرورت نہیں، کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں سے مشورہ کریں اور اِسکے بعد جو فیصلہ کریں اُس پر عمل کریں۔ لہٰذا ولایتِ فقیہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ فقیہ اپنے ذاتی افکار و رجحانات کے مطابق حکومت چلائے۔ بلکہ لوگوں سے مشورے کا ایک طریقہ، انتخابات اور رائے شماری ہے، اور اِس کے بعد وہ اپنی حتمی رائے کا

اعلان کرتا ہے۔

سوال: کیا کثرت رائے حاصل کر لینے والے شخص کو مشروعیت (شرعی جواز) حاصل ہو جاتی ہے؟

جواب: اکثریت کی تائید کے ذریعے حاصل ہونے والی مشروعیت اسکے حق ہونے کے عنوان سے نہیں ہے۔ لیکن جس موقع پر کسی مسئلے کے بارے میں اکثریت کی رائے معلوم کرنا ضروری محسوس ہو اور عوامی رائے حاصل کرنا اور اُن کے فیصلے پر عمل کرنا قرین مصلحت دکھائی دے' اور اِس مصلحت کی تشخیص بھی صاحبانِ امر (اولی الامر) نے دی ہو' تو ایسی صورت میں جب کوئی اور راستہ نہ ہو' تو اکثریت کی رائے کا حصول بہترین راستہ (Choice) ہے۔

سوال: کیا شریعتِ اسلامی میں رائے شماری اور انتخاب بیعت کی مانند ہے؟

جواب: جن معنوں میں اصطلاحاً بیعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے' انتخابات کے وہ معنی نہیں ہیں۔ کیونکہ اپنے اصطلاحی معنی میں بیعت صرف اولی الامر کیلئے ہوتی ہے' جو خلافت' ریاست' امامت یا نبوت کے عہدے پر فائز ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو مجلسِ قانون ساز (parliament) کا رکن بننا چاہتا ہے' تاکہ دوسروں کے ساتھ مل کر لوگوں کیلئے قوانین اور قاعدے وضع کرے' اسکے لئے بیعت کا کوئی مفہوم نہیں۔

رائے دہندگان (Voters) کی طرف سے کسی کے انتخاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُنہوں نے اِسے اپنا وکیل بنایا ہے۔ کامیاب امیدوار (مجلسِ قانون ساز میں) اُن لوگوں کا وکیل ہوتا ہے جنہوں نے اسے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا انتخاب پر وکالت کا عنوان صادق آتا ہے۔ لیکن یہی وکالت اپنے اندر بیعت کا مفہوم رکھتی ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی دوسرے شخص کی مطلق بیعت کرتا ہے' وہ اُسے مطلقاً حکومت سپرد کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ جو اپنے

نامزد کردہ شخص کو مطلق وکالت سونپ دیتے ہیں، وہ اُسے اِس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ اُن کے معاملات کے بارے میں جس طرح چاہے فیصلہ کرے اور عوام کی عمومی زندگی سے تعلق رکھنے والے قوانین وضوابط میں سے جنہیں عوام کیلئے بہتر سمجھے، اُن کی تائید کرے۔

سوال: ایک اسلامی رائے کی رو سے انتخابات غیر شرعی عمل ہیں۔ کیونکہ انتخابات کی صورت میں اقلیت کا حق ضائع ہو جاتا ہے، جو کبھی ممکن ہے ۴۹ فیصد پر مشتمل ہو۔

جواب: جو لوگ ڈیموکریسی کی بات کرتے ہیں، اُن میں سے کچھ لوگ اسے بہترین نظام نہیں سمجھتے بلکہ یہ اُن کی نظر میں کمتر نقصاندہ نظام ہے۔ کیونکہ جمہوریت میں اکثریت رائے کو بنیاد حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات باشعور، تعلیم یافتہ اور صالح اقلیت کے مقابلے پر جاہل، گنوار اور گمراہ اکثریت آ کھڑی ہوتی ہے۔ یہ مفروضہ اِس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ڈیموکریسی کے نتائج ہمیشہ حق وحقانیت اور معاشرے کی مصلحت کے قریں نہیں ہوتے۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ڈیموکریسی کے ذریعے ڈیموکریسی کی اصلاح کر رہے ہیں، اُن کے جواب میں عرض ہے کہ: اِس امر کے ہمیشہ ثمر بخش متعین نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ لہٰذا ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہم نظری اعتبار سے ڈیموکریسی کو مسترد کرتے ہیں۔ کیونکہ ڈیموکریسی کی بنیاد اِس نظریے پر قائم ہے کہ معاشرے کے فکری، سیاسی، قانونی اور اجتماعی معاملات کو حاصل ہونے والی مشروعیت (legitimacy) اکثریت کی رائے سے وابستہ ہے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں کسی بھی چیز کی مشروعیت کی بنیاد قرآن وسنت ہے۔

لہٰذا ہم ڈیموکریسی کو اسلامی قوانین کی مشروعیت کی بنیاد قرار نہیں دے سکتے۔ ہاں، اِس بات کا امکان موجود ہے کہ عہدیداروں کے انتخاب، یا متعدد فقہا ہونے کی صورت میں ولیِ فقیہ کے چناؤ میں اکثریتِ رائے کا کردار ہو، جو اِس صورت میں انتخاب کی مشکل کو حل کرے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے پاس اکثریت کی رائے سے رجوع کرنے سے

بہتر کوئی اور دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ البتہ اکثریت کی رائے حقانیت کا تعین نہیں کرتی۔ لیکن کیونکہ اکثریت خاص شرائط اور متعین حالات میں شوریٰ کی مصداق ہے' اسلیئے اُسے اعتبار حاصل ہے۔

قانون سازی اور احکامِ شرعی کی تشخیص کے معاملات میں' جہاں کتاب وسنت کے جاننے والوں اور استنباط واجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں سے رجوع کرنا ضروری ہے' وہاں اسلام میں ڈیموکریسی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن بعض عمومی معاملات' جیسے ولیٔ فقیہ' صدرِ مملکت یا اراکینِ پارلیمنٹ کے انتخاب وغیرہ میں ڈیموکریسی کے تقاضوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اِن امور میں بھی انتخابات کی ضرورت پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔ لیکن معاشرتی نظام کی حفاظت کا آسان ترین راستہ ڈیموکریسی ہی ہے۔

سوال: وہ لوگ جو عہدۂ صدارت یا (پارلیمنٹ میں) نمائندگی کیلیئے متعدد امیدواروں کی موجودگی کی صورت میں انتخابات کے اصول کو شرعی لحاظ سے مسترد کرتے ہیں' وہ اسکے لئے کیا نعم البدل پیش کرتے ہیں؟

جواب: ہم نے عرض کیا کہ اِس مسئلے میں دو نکات ہیں:

ایک نکتہ قانون سازی سے تعلق رکھتا ہے' جس کے بارے میں ایسی اکثریت کی رائے دریافت کرنا درست نہیں جو اجتہادی مسائل میں تخصص اور مہارت کی مالک نہ ہو۔ بلکہ یہاں ماہرین ومجتہدین کی رائے لینی چاہیئے۔ اور اگر ماہرین کثیر تعداد میں ہوں' تو لازم ہے کہ شوریٰ کے ذریعے اِن کے ایک گروہ کا چناؤ کیا جائے اور مشورت کرنے والے افراد میں اختلاف کی صورت میں انتخابات کا راستہ اپنایا جائے۔ کبھی کبھی مصلحت تقرر اور تعین کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ ایسی صورت میں ماہرین اور متخصصین سے رجوع کرنا چاہیئے۔

دوسرا نکتہ' اجرا اور نفاذ سے تعلق رکھتا ہے۔ حکومتی شخصیات' حاکم یا دوسرے افراد جو قوانین کے نفاذ اور اُن کے اجرا کے ذمے دار ہیں' اُن کے تعین میں اکثریت کی رائے

پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور انتخابات کو شوریٰ کے عنوان میں شامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

سوال: مشہور یہ ہے کہ ڈیموکریسی احکامِ الٰہی کی پابندی کے بغیر پارلیمنٹ کیلیئے قانون سازی کے کردار کی قائل ہے۔ یہ امر اسلامی نظام سے کس طرح مطابقت رکھتا ہے؟ اسلامی مملکت میں پارلیمنٹ کا کیا کردار ہے؟

جواب: اسلامی مملکت میں پارلیمنٹ حقائق کی بنیاد پر عوام کی اُن عمومی ضروریات کے جائزے اور مطالعے کا کردار ادا کرسکتی ہے جن میں قانون سازی کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ قانون سازی منطقۂ فراغ (۱) کے دائرے میں ہوسکتی ہے۔ جس کے بارے میں شہید سید محمد باقر الصدر علیہ الرحمہ نے گفتگو کی ہے اور جس کی تشخیص و تعین ماہرین، علما اور شریعتِ اسلامی کے فقہا کی ذمے داری ہے۔

اسلامی پارلیمنٹ کا دوسرا کردار مصادیق پر حکمِ شرعی کا اطلاق اور شرعی قواعد معلوم کرنے کیلیئے کوشش کرنا ہے۔ لہٰذا مجلسِ قانون ساز، مجلسِ خبرگان اور قانونِ اساسی (آئین) کی شوریٰ نگہبان کے مابین ایک قسم کی ہم آہنگی کا پایا جانا ضروری ہے۔ جیسا کہ اسلامی جمہوریۂ ایران میں تجربہ کیا گیا ہے۔ پارلیمنٹ خاص احکام و قوانین وضع کرتی ہے، لیکن مجلسِ خبرگان اور شوریٰ نگہبان اِن قوانین کے شرعی فقہی اصولوں کے مخالف ہونے کی صورت میں، انہیں مسترد کرسکتی ہے۔

سوال: ایک ایسا مسلمان جو ایک سیکولر اور اسلامی احکام و نظام کے غیر پابند ملک کی پارلیمنٹ

۱۔ منطقۂ فراغ سے مراد وہ نظریہ ہے جو اسلامی معاشرے میں حاکمِ شرع یا ولیٔ امر کی جانب سے ولائی احکام کی تشریع کی حدود کے بارے میں شہید آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ نے پیش کیا تھا۔ اس نظریے کے مطابق بعض موضوعات اور افعال فی نفسہ کوئی معین فقہی حکم نہیں رکھتے۔ ایسے موارد میں حاکمِ شرع اسلام کے کلی اصولوں اور اقدار کی اساس پر اور وقت کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر محدود عرصے کے لئے ولائی حکم جاری کرتا ہے۔

کارکن بننا چاہتا ہے' اسکا شرعی فریضہ کیا ہے؟
جواب: ایسے شخص کو اِس بات کا جائزہ لینا اور اِسکا تجزیہ وتحلیل کرنا چاہیئے کہ ایسی پارلیمنٹ میں اُسکا جانا اسلام کی بلند مصلحتوں کے مطابق ہے یا نہیں؟ اِس ملک میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کو پارلیمنٹ میں ایک ایسے نمائندے کی ضرورت ہے یا نہیں جو ان کے معاملات سلجھائے' ان کے مسائل حل کرے' اور ان کے خلاف بننے والے قوانین کو منظور ہونے سے روکے؟

اگر ایسی پارلیمنٹ میں ایک یا ایک سے زیادہ افراد کا جانا (اسلام اور مسلمانوں کی) مصلحت میں ہو' تو ایسی پارلیمنٹ کی رکنیت کیلئے کوشش میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لیکن جب کوئی ایسی پارلیمنٹ کا رکن بن جائے' تو اُسکی ذمے داری ہے کہ قوانین کی منظوری یا انہیں مسترد کرتے ہوئے خدائی احکام و فرامین کو ملحوظ رکھے۔ کیونکہ کسی شخص کا غیر اسلامی پارلیمنٹ کا رکن ہونا اُسکی طرف سے کسی مخالفِ شرع حکم و قانون کی تائید اور توثیق کا جواز نہیں ہوتا۔ ایسا شخص یا تو اِس مسودۂ قانون کے خلاف رائے دے سکتا ہے یا پارلیمنٹ کے معمول کے طریقۂ کار کے مطابق اِس مسئلے پر رائے دہی سے گریز کرسکتا ہے۔ اِس طرح اِسکی تائید وحمایت کے بغیر پارلیمنٹ جن غیر اسلامی قوانین کی منظوری دے گی اُن کی ذمے داری اِس رکنِ پارلیمنٹ پر عائد نہیں ہوگی۔

سوال: کیا انتخابات میں کھڑا ہونے والا امیدوار حیلہ وفریب اور مادّی فوائد یا خدمات کی فراہمی کے ذریعے رائے دہندگان (voters) کو اس بات کی ترغیب دے سکتا ہے کہ وہ اسے منتخب کریں؟ ایسے افراد کو ووٹ دینے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟
جواب: وہ لوگ جو اِس قسم کی دھوکا دہی کے طریقوں کا مشاہدہ کریں' اگر ایسے فرد کی قابلیت اور لیاقت پر اطمینان نہ رکھتے ہوں' تو اُنہیں اِسکے پروپیگنڈے میں نہیں آنا چاہیئے۔ کیونکہ نمائندگی کے امیدوار شخص کا خود اپنے بارے میں اطمینان و یقین دوسروں پر لازم نہیں کرتا

کہ وہ بھی اُس پر اعتماد کریں۔

ووٹر کو دھوکا و فریب کا سبب بننے والے وسائل (جو اُسے مادّی یا معنوی فوائد پہنچاتے ہیں) کے اثرات سے دور رہتے ہوئے اپنی شرعی ذمے داری کی فکر کرنی چاہیے۔ اُسے جانچنا چاہیے کہ یہ امیدوار اِس منصب کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اسے اہل اور با صلاحیت سمجھتا ہو، تو پھر اُسکی طرف سے تحائف یا خدمات قبول کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں، ہر چند ہماری دانست میں یہ ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ حتیٰ ہم بعض چیزوں کو مدنظر رکھنے کی بنیاد پر بعض حالات میں اِس قسم کے تحائف یا خدمات قبول کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

رائے دہندہ (Voter) کو پر فریب پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اِس بات کو جانتا ہو کہ امیدوار اِسکا ووٹ لینے کی خاطر اس پر مہربانیاں کر رہا ہے اور وہ یہ طے کر چکا ہو کہ وہ اِس امیدوار کو ووٹ نہیں دے گا، تو اسکے لئے اسکی طرف سے دیئے گئے تحفے تحائف قبول کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ عمل (اکلاً للمال بالباطل) حرام خوری ہے۔

یہ روش اختیار کرنے والے امیدوار کیلئے بھی ہماری نصیحت ہے کہ وہ اِس دھوکا و فریب سے دور رہے۔ کیونکہ چاہے اِسکے مقاصد کتنے ہی اعلیٰ وارفع ہوں لیکن اِن کے حصول کیلئے اِس کا اختیار کردہ طریقۂ کار غلط ہے۔ اُمیدوار کو چاہیے کہ وہ اپنے سیاسی لائحۂ عمل، نظریات اور اہداف کے ذریعے اپنا تعارف کرائے۔ لیکن اِن مقاصد کے حصول کیلئے مال و دولت اور خدمات کی فراہمی کا ذریعہ اختیار کرنا درست نہیں۔ اگرچہ مالی فیاضی اور لوگوں بالخصوص فقیروں اور محتاجوں کی مدد و اعانت امیدوار کو انتخابات میں کامیاب بنا دے اور اِس میں یہ بات پیش نظر ہو کہ یہ امداد کامیابی یا ناکامی ہر دو صورتوں میں اسکی طرف سے جاری رہے گی، تو اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں۔ لیکن ہماری یہ تمام گزارشات اِس بات سے مشروط ہیں کہ اس امیدوار کو اپنے اندر شرعی اور قانونی قابلیت اور اس منصب کی مدت کے دوران رضائے الٰہی کے حصول کی صلاحیت نظر آتی ہو۔

سوال: کیا آپ اس طرح مال خرچ کرنے کو رشوت کے مترادف نہیں سمجھتے، جس کے نتیجے میں اجتماعی نظم ونسق میں خلل واقع ہو سکتا ہے؟

جواب: ہم اِس بات کو پسند نہیں کرتے کہ لوگ حق کی طرفداری اور سچائی کا ساتھ دینے کیلئے اِس طرح مال لینے کے عادی بن جائیں۔ کیونکہ جو شخص آج مال لے کر حق کی طرفداری کرے گا ممکن ہے کل مال لے کر باطل کا ساتھ دینے کو تیار ہو جائے۔ لیکن ہمارے پیش نظر اس مسئلے کا فقہی حکم بیان کرنا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی امیدوار مکمل طور پر اہل ہو اور چاہتا ہو کہ لوگ اِس طرح کھل کر اسکی حمایت کریں کہ دوسرے بھی اسکی طرف مائل ہو جائیں، تو اِس نیت سے اس کا اپنے طرفداروں (supporters) کو مال دینا کہ اُن سے اُس کا تعلق اور مضبوط ہو جائے، حرام کام نہیں ہے۔ ایسا مال لینا بھی جائز ہے اور ایسے شخص کا انتخاب بھی جائز ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سوال: کیا ظالم حکومت کے زیر سایہ غیر شرعی انتخابات میں شرکت جائز ہے؟ جبکہ شرکت نہ کرنا حکومت کی مخالفت سمجھی جائے گی اور شریک نہ ہونے والے انسان کی جان کو خطرے سے دوچار کر دے گی؟

جواب: بیلٹ بکس میں ووٹ ڈالنے اور اگر ممکن ہو تو بغیر نشان لگائے ہوئے ووٹ ڈالنے کی حد تک، ایسے انتخابات میں شرکت جائز ہے۔

سوال: کیا آج کل رائج انتخابات اور رائے شماری منتخب ہونے والے سربراہِ مملکت کو شرعی ولایت بخشتے ہیں؟

جواب: یہ انتخابات منتخب ہونے والے سربراہِ مملکت کو شرط و شروط کے ساتھ ولایت بخشتے ہیں۔ اور اسلام، علم، مہارت اور تقویٰ اِن کیلئے شرائط ہیں۔ بالفاظ دیگر مشروعیت (legitimacy) کیلئے صرف رائے دہندگان کی اکثریت کا ووٹ دینا ہی کافی نہیں

ہے۔ بلکہ منتخب ہونے والے شخص کو اِن شرعی عناصر کا حامل ہونا چاہئے' جو اُسے اِس منصب کا اہل بناتے ہیں۔

اُس شخص کے سوا کسی کو مشروعیت (شرعی و قانونی استحقاق) حاصل نہیں ہوتی' جسے خدا نے مشروعیت دی ہو۔

سوال: کیا کسی خاص امیدوار کی حمایت کے بارے میں امیدواروں کا اتفاقِ رائے اور اُس کی انتخابی مہم چلانا' انتخابات کی قانونی حیثیت کو کوئی گزند پہنچاتا اور منفی اثرات مرتب کرتا ہے؟

جواب: اگر امیدوار منتخب کیے جانے کا اہل ہو' تو اِس اتفاقِ رائے کے ذریعے بھی اِسکا انتخاب جائز ہے۔ کیونکہ انتخابات کی صورت یہی ہے کہ افراد' ارکان اور جماعتیں کسی ایک خاص امیدوار پر متفق ہو جائیں۔

سوال: رائے دہندگان کی اکثریت امیدواروں کے بارے میں کوئی واضح اور کافی معلومات نہیں رکھتی اور اپنے اعزہ واحباب کے کہے پر چلتی ہے۔ کیا ایسی صورت میں ووٹ مشروعیت (شرعی و قانونی استحقاق) دینے کا باعث ہوگا؟

جواب: انتخاب کے ذریعے ووٹر اپنے منتخب نمائندے کو بلا کسی قید و شرط کے مطلق وکالت دیتا ہے۔ اِس صورت میں ووٹر پر لازم ہے کہ وہ اپنے نمائندے کے فکری رجحانات' اُسکی دینداری اور داخلی و خارجی مسائل میں اِسکے سیاسی کردار کا اچھی طرح جائزہ لے' اِن امور پر خوب تحقیق کرے۔

لہٰذا ووٹر نے جس امیدوار کو ووٹ دیا ہے' وہ اُسکی کامیابی کی صورت میں اُسکے اعمال اور اقدامات کا ذمے دار ہے۔ اِس بنیاد پر شرعی طور پر جائز نہیں کہ انسان کسی ایسے شخص کو ووٹ دے جس کے فکری' سیاسی' اقتصادی اور فقہی رجحانات کی صحت کی طرف سے اُسے

اطمینان حاصل نہ ہو۔اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ انسان کسی ایسے شخص یا جماعت کا انتخاب کرے جس سے سیاست، اقتصاد اور اجتماعی مسائل میں اسلامی احکام کے برخلاف کسی حکم کی منظوری کی توقع ہو۔

رائے دہندہ (Voter) کیلئے ضروری ہے کہ وہ ہر رُخ سے مسئلے کا اچھی طرح جائزہ لے اور اگر کوئی مومن اور خدا ترس امیدوار موجود ہو، تو اُسکی حمایت کرے اور اگر کوئی امیدوار خدا اور اُسکے دین سے دشمنی رکھتا ہو، تو انسان کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ جس دن (یعنی روزِ قیامت) ہر انسان خود اپنے آپ سے جھگڑے گا اور خداوند عالم انسانوں کا مواخذہ کرے گا، اُس دن اُسے خدا کی بارگاہ میں اپنے تمام اچھے اور بُرے اعمال کا جوابدہ ہونا ہے۔

۱۳

ورزش اور کھیل کود کے احکام

ورزش اور کھیل کود کے احکام

سوال: کیا کھیل کے مقابلوں میں قوت بڑھانے والی دواؤں کا استعمال جائز ہے؟
جواب: اِس قسم کے مواد کا استعمال بذاتہٖ اور اِس عمل کے اعتبار سے جسے انجام دینے کا انسان کو اختیار حاصل ہے، حرام نہیں ہے۔ لیکن کھیل کود کے مقابلوں میں جہاں دو فریقوں کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ موجود ہوتا ہے، وہاں اِس قسم کے مواد کا استعمال حرام ہے۔ کیونکہ معاہدے میں متعین شدہ شرائط کی پابندی واجب ہے۔ اِن مقابلوں میں فزیکل اور جسمانی سرگرمیوں کے عنوان سے (کسی بھی ایسے خارجی عامل کے بغیر جو انسان کی قوت و طاقت میں اضافہ کرتا ہے) خود انسان کی ذاتی طاقت و قوت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی طے کردہ شرائط کی پابندی کرے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: المؤمنون عند شروطهم (مومنین اپنی شرائط کے پابند ہوتے ہیں)۔ لہٰذا مسلمان کھلاڑی کیلئے مقابلوں کے دوران قوت میں اضافہ کرنے والی دواؤں کا استعمال جائز نہیں۔ اور اگر وہ اِن ادویات، یا کسی بھی غیر فطری طریقے کے استعمال سے کامیاب ہو جائے، تو اُسے تمغہ یا انعام حاصل کرنے کا حق نہیں۔

سوال: کیا کوئی ایسا کام کرنا جائز ہے جو مخالف ٹیم کے کھلاڑی کو غصے میں لے آئے، یا اُسے ردِ عمل پر ابھارے اور کھیل اور اُسکے نتیجے پر اثر انداز ہو، اور ممکن ہے حریف کھلاڑی کو کھیل کے میدان سے باہر نکال دینے کا باعث بنے؟

جواب: اگر کھیل کے قواعد وضوابط اِس عمل کی اجازت نہ دیتے ہوں اور ایسے اعمال سے پرہیز معاہدے کی ضمنی شرط میں شامل ہو، تو ضمنی شرط کی پابندی کے طور پر ایسے اعمال جائز نہیں ہیں۔

سوال: کیا مخالف ٹیم کے بدمزاج کھلاڑی کو میدان میں یا میدان کے باہر اسی کے سے انداز میں جواب دینا جائز ہے؟

جواب: کھیل کے قواعد کے لحاظ سے، جن کی بنیاد پر معاہدہ طے پایا ہے، اگر جیسے کو تیسا جواب دینا ممنوع ہو، تو اِس عمل کے بذاتہٖ جائز ہونے کے باوجود طے شدہ شرط کے لحاظ سے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

سوال: کیا دو ٹیموں کا اِس بات پر اتفاق کر لینا جائز ہے کہ اُن میں سے ایک ٹیم ایک خاص رقم لے کر ہار جائے گی؟

جواب: اگر کھیل کے مقابلے کے اصول سے خیانت اور کھلاڑیوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے کی خلاف ورزی ہو، جس میں کھیل کی بنیاد جعلی نہیں بلکہ فطری نتائج کے حصول کیلئے بھرپور کوشش قرار دی گئی ہو، تو یہ عمل جائز نہیں ہے۔ یہ عمل تماش بینوں کے ساتھ بھی دھوکا اور فریب ہے۔

سوال: کیا یہ بات جائز ہے کہ کھلاڑی ریفری کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کیلئے اپنے آپ کو زخمی (injured) ظاہر کرے؟

جواب: انسان کا اپنے آپ کو خلافِ حقیقت ظاہر کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عمل ایک قسم کا عملی جھوٹ ہے۔ بالخصوص جبکہ یہ ریفری یا ایمپائر کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کیلئے ہو۔ اِس عمل کا مقصد اپنے حق میں ناجائز فیصلہ لینے کیلئے جج پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا ہے۔ نیز یہ عمل کھیل کے معاہدے کے بھی برخلاف ہے، جس کی بنیاد نتائج کے حصول کیلئے فطری اور حقیقی ذرائع سے کوشش کرنا ہے۔

سوال: باکسنگ، چینی باکسنگ (جو مکّوں اور لاتوں سے لڑی جاتی ہے) جو پر تشدد کھیل ہیں اور جنہیں بسا اوقات ''موت کے کھیل'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، کار ریسنگ، کار ریلی جو انتہائی تیز رفتار ہوتی ہیں اور ان کے دوران بعض اوقات موت کا خطرہ بھی ہوتا ہے اور فری اسٹائل ریسلنگ جو انتہائی وحشیانہ طریقے سے لڑی جاتی ہے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: جن کھیلوں کا ذکر کیا گیا ہے، اگر وہ انسانی زندگی، یا انسان کے کسی عضوِ بدن کیلئے خطرے کا باعث ہوں، تو ان کا کھیلنا جائز نہیں۔ چاہے انسان خود دوسروں کی طرف سے پہنچنے والے اِن خطرات کو قبول کرنے پر تیار ہو۔ کیونکہ انسان کو اِس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو اس بات کی اجازت دے کہ وہ اُسے نقصان پہنچائیں یا اُسکی زندگی کو خطرے سے دوچار کریں۔ اور دوسروں کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اُسکی اجازت کی صورت میں بھی اُسے کوئی ضرر پہنچائیں۔

لیکن ایسے کھیل جائز ہیں جن سے عام طور پر قابلِ برداشت سطحی قسم کے نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔ حتیٰ اگر ہم خود اپنے آپ کو یا دوسروں کو نقصان پہنچانے کو حرام سمجھتے ہوں، تب بھی اگر ان سے حاصل ہونے والی مصلحت ان کے نقصان کے مفسدے پر حاوی ہو تو جائز ہیں۔

سوال: کیا کھلاڑیوں کی خرید و فروخت جائز ہے، جس طرح مغربی ممالک کے کلبز

(Clubs) میں رائج ہے اور کچھ اسلامی ممالک میں بھی عام ہے؟

جواب: اِس عمل میں کوئی عیب اور مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ یہ عمل حقیقتاً خرید وفروخت نہیں ہے کیونکہ کلب کھلاڑیوں کے مالک نہیں ہوتے کہ اِنہیں فروخت کریں۔ بلکہ ایک کلب، جس نے ایک کھلاڑی کی خدمات حاصل کی ہوئی ہوتی ہیں، وہ اُس کھلاڑی کو دوسرے کلب کے حوالے کرتا ہے۔ اور اِس طرح اُسے اُس کلب کے حوالے کرنے، یا اپنے کلب کے معاہدے سے آزاد کرنے کے عوض اُس کھلاڑی کی خدمات حاصل کرنے والے کلب سے ایک معین رقم وصول کرتا ہے۔ اور یہ ایک جائز عمل ہے۔

سوال: اگر کوئی کھلاڑی اپنی ٹیم کے کسی رکن کی غلطی (فاؤل) دیکھے، جبکہ ریفری یا ایمپائر نے اُس غلطی کو نہ دیکھا ہو، تو کیا اِس کھلاڑی پر ریفری یا ایمپائر کو اُس غلطی سے مطلع کرنا واجب ہے؟

جواب: اگر کھیل کے قانون نے کھلاڑیوں یا ٹیموں کے درمیان طے پانے والی ضمنی شرائط کے تحت انہیں اِس عمل کا پابند کیا ہو، تو پھر ریفری یا ایمپائر کو مطلع کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر معاہدے میں اِس بات کا ذکر نہ کیا گیا ہو، تو پھر مطلع کرنا واجب نہیں۔

سوال: کیا کھیلوں کا پیشہ بن جانا جائز ہے، جیسے فٹبال، باسکٹبال اور دوسرے کھیل پیشہ بن چکے ہیں؟

جواب: ان کھیلوں کا کمائی کا ذریعہ بن جانا، یا انہیں ایک پیشے کے طور پر اپنا لینا، اگر شرعی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہو، تو کوئی ممانعت نہیں ہے۔

سوال: کیا کھیلوں کے مقابلوں کیلئے شرط لگانا جائز ہے؟ اگر شرط کے طور پر کوئی چیز نہ رکھی گئی ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب: ظاہراً اِس قسم کی شرط بندی غیر شرعی ہے۔ اور ایسا شخص جس کی پسندیدہ ٹیم' اپنی مخالف ٹیم پر فاتح قرار پائی ہو' وہ شرط کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مال کا مالک نہیں ہوگا۔ لیکن کھلاڑی یا کھلاڑیوں پر اِس سلسلے میں کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی اور تماش بینوں کے شرط لگانے سے' اُن کے کھیل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال: کیا ریفری کا کھلاڑی کو میدان سے نکال دینا اور اسی طرح دوسری سزائیں دینا۔ مثلاً قصوروار کھلاڑی کو ایک مخصوص مدت کیلئے کھیلنے سے محروم کردینا جیسی سزاؤں کی شرعاً پابندی کرنی چاہئے؟

جواب: اگر یہ سزائیں کھیل کے معمول کے قوانین اور قواعد وضوابط کی بنیاد پر ہوں' تو ریفری کی طرف سے سزاؤں کا فیصلہ صادر کرنا قدرتی بات ہے۔ اور کھلاڑیوں اور کلبز (Clubs) کو اِن قوانین اور ضوابط کا پابند رہنا چاہئے اور ان فیصلوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ بشرطیکہ قوانین اور قواعد وضوابط میں اِس قسم کی سزاؤں کا تعین کیا گیا ہو۔ لیکن اگر کسی قانون اور قاعدے کا وجود نہ ہو' تو جو کھلاڑی حریف ٹیم کے جس کھلاڑی کے خلاف زیادتی کا مرتکب ہوا ہو' مثلاً اُس نے اُسکو زخمی کیا ہو' یا اُسکے کسی عضو کو توڑا ہو' تو اُسے چاہئے کہ اُسے شرعی دیت ادا کرے۔

سوال: کیا بین الاقوامی مقابلوں میں دشمنوں کی ٹیم کے خلاف کھیلنا جائز ہے؟

جواب: اگر اُن کے ساتھ مقابلے سے گریز اِس بات کا موجب ہو کہ کھیلوں کے اہم مقابلوں (events) میں مناسب اور بڑے مواقع مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور اِس عمل کا حتمی نقصان اٹھانا پڑے گا' تو اُن کے خلاف کھیلنا جائز ہے' بصورتِ دیگر جائز نہیں۔ البتہ عام طور پر معاملہ یہاں تک پہنچتا نہیں ہے اور اِن امور میں کھلاڑی اپنی حکومتوں کے فیصلے کے تابع ہوتے ہیں' بغیر اسکے کہ ان پر کوئی منفی اثر مرتب ہو۔

سوال: کیا کسی ایسی ٹیم میں کھیلنا جائز ہے جس کی کامیابی سے ظالم حکمران فائدہ اٹھائے گا؟
جواب: اگر ظالم حاکم کا فائدہ اٹھانا اِس حد تک نہ ہو کہ مقابلے میں محض شرکت اُس سے تعاون کرنا اور اُسے مدد فراہم کرنا شمار ہو۔ اور کوئی ایسا عنوانِ ثانوی بھی نہ ہو جو با ایمان اور حق طلب ٹیم کی کمزوری کا سبب ہو، تو جائز ہے، وگرنہ عنوانِ ثانوی کے تحت حرام ہو جائے گا۔

سوال: کیا کسی مسلمان کھلاڑی کا اغیار کی ٹیم میں شامل ہونا جائز ہے، اِس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اُسکا اپنے کوچ اور دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ میل جول اُس پر اثر انداز ہوتا ہے؟
جواب: اگر اُسکا اغیار کی ٹیم میں شامل ہونا اُسکے اسلام کے سیدھے راستے سے گمراہ ہو جانے، بعض حرام کاموں کا مرتکب ہونے اور غیر اسلامی اخلاق اپنا لینے پر منتہی ہو، تو یہ شمولیت جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اِس قدر اثرات قبول نہ کرے جن سے دین سے اُسکی وابستگی کا خاتمہ ہو جائے اور صرف ان امور کی حد تک جو گناہ اور گمراہی کا موجب نہیں ہوتے اُنکا اثر قبول کرے، تو اُس کا اغیار کے ساتھ اشتراک اور ان کی ٹیم میں شامل ہونا جائز ہے۔ اِن معاملات میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ میل جول اور تعاون کی دوسری صورتوں ہی کی مانند کافی غور وخوض کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا فتح اور کامیابی کے حصول کیلئے کھلاڑیوں کے شناختی کارڈ میں ہیر پھیر جائز ہے؟ اگر اِس جعل سازی کی مرتکب کوئی ٹیم کامیابی حاصل کر لے تو اس کا کیا حکم ہے؟
جواب: یہ عمل جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ طے شدہ اصول وقواعد کی اُن ضمنی یا صریحی شرائط کی خلاف ورزی ہے جن میں کھلاڑی کیلئے ایک خاص عمر کو شرط قرار دیا گیا ہوتا ہے۔ کامیابی کی صورت میں بھی ایسا کھلاڑی یا ٹیم انعامات اور اعزازات کی حقدار نہیں۔

سوال: بعض سخت اور پر تشدد کھیلوں میں کھلاڑی کو پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھیل اُسکے

جسم کو شدید نقصان پہنچائے گا۔ کیا یہ کھلاڑی اِس طرح کے کھیل کھیلنے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا؟
جواب: اگر اِن کھیلوں سے پہنچنے والا ضرر اِن میں کامیابی سے حاصل ہونے والے نتائج کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہو اور اسکا نقصان اس کھیل سے حاصل ہونے والے فائدے سے زیادہ ہو، تو جائز نہیں۔ لیکن اگر اس سے حاصل ہونے والا فائدہ قابلِ ذکر اور اہم ہو اور اس میں لگنے والی چوٹیں اسکے مستقل معذور ہو جانے کا موجب نہ ہوں، تو جائز ہے۔

عام طور پر لوگ کسی ایسے کھیل کو عاقلانہ اور پسندیدہ نہیں سمجھتے جو جسم کے کسی حصے کے ناکارہ ہونے کا سبب بنے۔ کیونکہ اس صورت میں کھلاڑی کو کوئی ایسا نفع حاصل نہیں ہوگا جو اسے پہنچنے والے نقصان کی برابری کر سکے۔ لہٰذا جس کھیل کا یہ نتیجہ برآمد ہو، وہ جائز نہیں۔

سوال: باڈی بلڈنگ، جس میں کھلاڑی اپنے عضلات کی نشو و نما کرتا ہے، انہیں مضبوط بناتا ہے اور پھر لوگوں کے سامنے اُن کی نمائش کرتا ہے۔ یہ ورزش عضلات کو خاص شکل میں ڈھالنے کیلئے کھلاڑی کا خاصا وقت لیتی ہے۔ باڈی بلڈنگ کے اس کھیل کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟
جواب: باڈی بلڈنگ میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس ورزش کے نتیجے میں بکثرت مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور ممکن ہے اِس ورزش سے جہاد، عزت و آبرو اور مال و دولت وغیرہ کی حفاظت کے سلسلے میں استفادہ کیا جا سکے۔

سوال: عورتوں کے کھیل کود کی کیا حدود ہیں؟ کیا عورت شرعی پردے کی حفاظت کے ساتھ ٹینس کھیل سکتی ہے؟
جواب: عورتوں کیلئے کسی بھی قسم کے کھیلوں میں حصہ لینے میں کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ کھیل خود عورتوں کے درمیان ہوں، اُن میں مرد شامل نہ ہوں اور اُن میں حجاب کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ کیونکہ مردوں کو ورزش کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، عورتوں کو

اُس سے کم ضرورت نہیں ہوتی ۔اور بنیادی طور پر عورتوں کی ورزش کی راہ میں کوئی شرع رکاوٹ حائل نہیں۔

سوال: کیاایسی ٹیم میں کھیلنا جائز ہے جس میں شامل افراد خلافِ شرع اعمال مثلاً شراب نوشی وغیرہ کے مرتکب ہوتے ہوں؟
جواب: اگر آپ اُن کے اثرات قبول نہ کریں اور آپ کے اُن کے ساتھ کھیلنے سے نہی عن المنکر کی شرائط کے لحاظ سے ارتکابِ منکر کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

سوال: بعض ادارے اپنے ایڈورٹائزمنٹ یا فائدے کیلئے کھیلوں کے مقابلے منعقد کرتے ہیں۔کیاان مقابلوں میں شرکت کرنااوران کے انعام حاصل کرنا جائز ہے؟
جواب: ایسے مقابلوں میں شرکت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔کیونکہ ایسا ادارہ تماش بینوں کو ٹکٹ فروخت کر کے منافع کماتا ہے' یا اپنی ایڈورٹائزمنٹ کرتا ہے۔ایسے مقابلوں کے انعامات حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

سوال: ٹینس کا کھیل' جو بعض اوقات تماش بینوں کا بہت سا وقت لے لیتا ہے' کیا ایک عبث اور حرام فعل نہیں ہے؟
جواب: اِس کھیل کو کھیلنا' یا اِسے دیکھنا' اگر خدا کی یاد' نماز اور فرائض کی ادائیگی میں مانع نہ ہو' نیز اِس سے کسی حرام کا ارتکاب لازم نہ آتا ہو' تو جائز اور بلا اشکال ہے۔

سوال: کھیل کا مختصر لباس نکر (Shorts) جسے عام طور پر فٹبال اور باسکٹ بال کے کھلاڑی پہنتے ہیں' اِسے پہننا اور ایسے کھلاڑیوں کو دیکھنا کیا حکم رکھتا ہے؟
جواب: کھلاڑی کیلئے اِس کا پہننا بذاتہ جائز ہے۔اِسی طرح اگر کسی فعلِ حرام کے ارتکاب پر

منتہی نہ ہو، تو ایسا کھلاڑی جس نے اِسے پہنا ہوا ہو، اُسے دیکھنا بھی جائز ہے۔

سوال: کیا دشمن ملک کی ٹیم کی حوصلہ افزائی (support) جائز ہے؟
جواب: مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے جذبات واحساسات کا رُخ اپنے ایمان کے راستے پر رکھے، اپنے دشمن کا ہمدل اور ہمساز نہ بنے، کہ دشمن بلندی پر پہنچنے اور کامیابی کے حصول کیلئے اِس سے استفادہ کرے۔

سوال: آپ کی بعض آراء میں نظر آتا ہے کہ آپ کچھ ایسے کھیلوں کو جن کے دوران کھلاڑی اپنا اختیار کھو بیٹھتا ہے، مردِ مسلمان کی ہیبت اور مروت کے خاتمے کا سبب سمجھتے ہیں۔ کیا یہ سبب حرمت کا باعث بننے کی حد تک پہنچتا ہے؟
جواب: حکمِ شرعی کا دارومدار کھلاڑی یا تماش بین سے صادر ہونے والی حالت اور عمل پر ہے۔ اگر اِن کا عمل کسی فعلِ حرام کا باعث ہو، تو حرام ہے۔ اور اگر اِن سے کوئی فضول عمل سرزد ہو، تو وہ عمل مکروہ یا مکروہ عمل کی مانند ہے۔ اور اگر اِن میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ ہو، تو پھر اِس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اسلامی اخلاق، مومن انسان کو اِس بات کا ذمے دار قرار دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اعصاب پر مسلط رہے، اِنہیں قابو میں رکھے اور اپنے عمل کے مثبت اور منفی نتائج کی طرف سے ہوشیار رہے۔ اسے چاہئے کہ کسی ردِ عمل کے زیرِ اثر آپے سے باہر نہ ہو، جس کے نتیجے میں مسائل پر اسکی توجہ نہ رہ سکے۔

سوال: وہ منفی افعال جو کھیلوں کے تماشائی اور ٹیموں کے حامی انجام دیتے ہیں اور بعض اوقات مخالف ٹیم کے خلاف گالم گلوچ اور اس پر انڈے اور ٹماٹر پھینکنے تک نوبت جا پہنچتی۔ اِن اعمال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ افعال سراسر حرام ہیں۔ کیونکہ دوسروں پر زبانی یا عملی تجاوز، جو اُن کی اہانت اور اُن کیلئے اذیت کا باعث ہو، حرام ہے۔

سوال: وہ شرعی حدود کیا ہیں جنہیں کھیلوں کی سرگرمیوں کے دوران ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟
جواب: کھیلوں کی سرگرمیوں کے دوران جن شرعی حدود کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، وہ دوسرے اعمال کے بارے میں شرعی حدود سے مختلف نہیں ہیں۔ یعنی انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ہر عمل میں اپنے دینی فریضے پر کاربند رہے۔ یعنی اِس عمل کی کیفیت اور اسکے اصول وضوابط کی پابندی کرے، وعدہ وفا کرے، دوسروں کے حقوق پر تجاوز نہ کرے، خیانت نہ کرے اور دوسروں سے جھوٹ نہ بولے۔

انسان کو حق حاصل ہے کہ ایسے کھیل کھیلے جو اسکے جسم کو قوی بنائیں، اسکی طاقت میں اضافہ کریں اور ملکی اور عالمی سطح پر کھیل کے میدانوں میں اُسکی مناسب جگہ پیدا کرنے کا باعث ہوں اور دوسرے ممالک کے مقابل اسلامی ممالک کی کھیلوں کی سطح کو بلند کریں۔

لیکن اسکے ساتھ ساتھ اُسے چاہئے کہ انفرادی لحاظ سے اور کھیل کے میدان میں دوسروں کے ساتھ ربط وتعلق کے حوالے سے اسلامی اصولوں کا پاس ولحاظ رکھے، اور کھیل کی فضا میں ایسا غرق نہ ہو جائے کہ احکامِ الٰہی کو بھول بیٹھے۔ کیونکہ مسلمان تو وہ ہوتا ہے جو خدا کی مرضی جانے بغیر نہ ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور نہ ایک قدم پیچھے ہٹاتا ہے۔

سوال: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فٹبال ایک ایسا کھیل ہے جو پیروں اور پنڈلیوں کو مضبوط کرتا ہے اور عقل کو کمزور۔ کیونکہ یہ کھیل انسان کو کام کاج اور غور وفکر سے دور رکھتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟
جواب: ہمارے خیال میں یہ کھیل اِس قدر منفی اثرات نہیں رکھتا۔ ہم فٹبال کو بدن کیلئے ایک مفید ورزش سمجھتے ہیں۔ اِسی طرح یہ کھیل اچھے نتائج کا بھی حامل ہے۔ کیونکہ یہ جوانوں کے

فارغ اوقات کو پُر کرتا ہے' اُن کی قوت کو بڑھاتا ہے' اُن کے درمیان مقابلے کے جذبے کو زندہ رکھتا ہے اور اِن سب باتوں سے بڑھ کر اِنہیں حرام سرگرمیوں میں مشغول ہونے سے باز رکھتا ہے۔ لیکن اس کھیل کو بھی بہت سے دوسرے کھیلوں کی مانند انسان کی دینی' عائلی اور معاشی ذمے داریوں سے غفلت کا سبب نہیں بننا چاہئے۔

سوال: پُر تشدد کھیل' جیسے کشتی اور باکسنگ وغیرہ' انسان کے وحشی جذبات کو ابھارتے ہیں' اِن کھیلوں کے بارے میں اسلام کا حکم کیا ہے؟

جواب: اِن کھیلوں کے بارے میں دو نکتے قابلِ توجہ ہیں:

پہلا نکتہ انسان کی دفاعی ضرورت سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان باکسنگ سیکھ سکتا ہے' تاکہ دوسروں کے حملے کے موقع پر اپنا دفاع کر سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سی خواتین جنہیں مجرمانہ حملوں کا سامنا کرنا پڑا' وہ کراٹے وغیرہ جیسی صلاحیتیں رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو اِن حملوں سے بچانے میں کامیاب رہیں۔ لہٰذا اِن پُر تشدد کھیلوں سے درست استفادہ' ذاتی دفاع (self-defence) کے ذرائع اور طریقوں میں شامل ہے۔ پس اپنے دفاع کے مقصد سے اِن کا سیکھنا کوئی مشکل اور مسئلہ نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ وہ منفی نتائج ہیں جن کا کبھی کبھی کھلاڑی کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اُسکی آنکھ' ناک اور دوسرے اعضائے بدن کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے' یا اسکی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ اِس مقام پر احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہئے' بالخصوص ماہر کھلاڑیوں کو محتاط رہنا چاہئے۔ کیونکہ انسان کیلئے جائز نہیں ہے کہ دوسرے پر حتیٰ اُسکی رضامندی کے باوجود اِس طرح زیادتی کرے کہ اُسے کوئی کاری نقصان پہنچ جائے۔

انسان کو اِس بات کا بھی حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کو اِس بات کی اجازت دے کہ وہ اُسکے کسی عضوِ بدن کو بیکار کردے' مگر یہ کہ اُسکی جان کی حفاظت اِس عضو سے محرومی پر موقوف ہو۔

(۱۴)

شعائر کے احکام

(مذہبی رسوم واجتماعات کے احکام)

شعائر کے احکام

(مذہبی رسوم واجتماعات کے احکام)

مصائبِ اہلِ بیتؑ پر گریہ وزاری

سوال: ایامِ عاشورا میں حضرت امام حسین علیہ السلام' اُن کے اہلِ بیتؑ اور اُن کے اصحابؓ پر رونے کے بارے میں شرع کا موقف کیا ہے؟

جواب: امام حسین علیہ السلام' اُن کے اہلِ بیتؑ اور اُن کے اصحابؓ کے ساتھ انسانی اور روحانی تعلق عقلی اور ایمانی پہلو کے ساتھ ساتھ شعور واحساس کے پہلو میں بھی موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک انقلابی سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی فکر کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے انقلاب کی روح بھی انسان کے باطن میں جڑ پکڑے۔

آغاز ہی سے ہمارے ائمہ علیہم السلام کی خواہش یہ تھی کہ لوگ عاشورا کی یاد منانے کی غرض سے مجالسِ عزا کا انعقاد کریں' مرثیے پڑھیں' اور ایسے شعر کہیں جو لوگوں کے جذبات کو تحریک دیں تاکہ لوگوں کا امام حسینؑ سے ایک جذباتی تعلق قائم ہو۔

ہم سب جانتے ہیں کہ گریہ اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کا ایک بنیادی

ذریعہ ہے۔ لیکن سوال یہاں اٹھتا ہے کہ کیا گریہ وزاری اور اشک فشانی کو ایک بے روح روایتی صورت سے ہونا چاہیئے؟ کیا گریہ وبکا عاشورا کی رسوم میں سے محض ایک رسم کا نام ہے؟ کیا اس گریہ وبکا کا سرچشمہ انسان کی اپنی ذات سے جدا کہیں باہر واقع ہے؟ کیا ایامِ عاشورا میں کی جانے والی گریہ وزاری ایک غیر شعوری گریہ وزاری ہے؟ یا یہ کہ گریہ وبکا کی اِس صدا کو واقعۂ عاشورا کے ساتھ وابستگی اور اِس کے مقاصد سے ہمنوائی کے ہمراہ انسان کے باطن سے بلند ہونا چاہیئے؟

ہماری رائے یہ ہے کہ عاشورا کے ساتھ ہمارا تعلق نہ تو روایتی اور تقلیدی ہونا چاہیئے اور نہ صرف گریہ وزاری کے ذریعے اِس تعلق کا اظہار ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ایامِ عاشورا کی آمد پر ہم اپنے آپ کو صرف اور صرف گریہ وزاری کیلئے آمادہ کریں۔ ہم محض نوحے مرثیے کی حزن آور فضا کے زیرِ اثر نہیں بلکہ عاشورا کی مصیبت سے شعوری وابستگی کے ساتھ گریہ وزاری کی تاکید کرتے ہیں۔

یعنی انسان کو چاہیئے کہ عاشورا کے ساتھ اپنا شعوری تعلق قائم کرے، اور جس طرح اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبتوں پر آنسو بہاتا ہے، اُسی طرح عاشورا کی مصیبت پر اشک فشانی کرے۔ یہ شعوری اور آگاہانہ تعلق انسان کے باطن میں حادثۂ عاشورا کے جڑ پکڑنے کا سبب ہوگا اور انسان کے شعور و احساس میں اِسکے مسلسل زندہ رہنے کا باعث بنے گا اور اِسے محض ایک رسم اور روایت میں بدل جانے سے بچائے گا۔

اگر انسان المیے اور مصیبت سے متاثر ہو کر آنسو بہانے کی بجائے، دوسروں کی دیکھا دیکھی رونے لگے، یا مجبوراً اشک بہانے لگے اور یہ سمجھے کہ عزاداری محض اشک فشانی اور گریہ و زاری کی ایک مناسبت ہے، تو اِسکے معنی یہ ہوں گے کہ عاشورا نے اِسکے باطن میں جگہ نہیں بنائی ہے۔

سوال: آپ سخت قسم کی سینہ زنی کو حرام سمجھتے ہیں؟ اِس قسم کی سینہ زنی سے آپ کی کیا مراد

ہے؟اور کیا عام طور پر رائج سینہ زنی بھی حرمت کے حکم میں شامل ہے؟

جواب: ہم یقین رکھتے ہیں کہ اپنی ماہیت اور خاصیت کی بنیاد پر سینہ زنی غم واندوہ کے اظہار کا ایک بہترین ذریعہ ہے' اور ہم ماتمی دستوں میں لوگوں کی سینہ زنی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' اور اِسے ختم کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن جو سینہ زنی گریہ وزاری کی طرح انسان کے غم واندوہ کی علامت ہے' اُس سے مراد وہ سینہ زنی ہے جو آرام آرام سے اور معقول انداز میں کی جائے' نہ کہ نمائشی اور غیر معمولی سینہ زنی جس میں دوسرے غلط کام بھی شامل ہوتے ہیں اور جس کے دوران لوگ اپنے جسم کی نمائش کرتے ہیں۔ اِس قسم کی سینہ زنی اپنا اصل مفہوم کھو بیٹھتی ہے اور صرف ایک نمائشی فن بن کے رہ جاتی ہے۔

سخت قسم کی سینہ زنی کے حرام قرار دیئے جانے کے متعلق عرض ہے کہ ہم بھی بعض دیگر فقہا کی مانند بدن کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کو حرام سمجھتے ہیں' چاہے وہ نقصان بدن کیلئے کسی بڑے خطرے کا باعث نہ بھی بنے۔ سینہ زنی بھی اگر اِس حد تک شدید ہو جائے کہ جسم کو نقصان پہنچے' چاہے یہ نقصان ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائے' تب بھی ہماری نظر میں یہ عمل حرام ہے اور بالکل ایسے ہی ہے جیسے انسان (سخت سردی میں) اپنے آپ کو سرد ہوا میں لے جائے' جو اسکی بیماری کا سبب بنے' یا کوئی ایسی غذا کھالے جو بخار یا اسہال کا باعث ہو۔ ہم اِس قسم کے کاموں کو حرام سمجھتے ہیں۔ کیونکہ خود اپنے آپ کو ضرر پہنچانا حرام ہے' علاوہ ازایں یہ اپنے اوپر ظلم کے مترادف ہے۔

قرآنِ مجید میں فرمانِ الٰہی ہے کہ: وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (اور اللہ نے اِن پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے بلکہ یہ خود ہی اپنے نفس پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۳۳)۔ اِس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کا خود اپنے اوپر ظلم کرنا خدائے سبحان کی نظر میں مذموم اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ چاہے یہ ظلم خدا کے انکار کی صورت میں ہو' جو آتشِ جہنم میں ڈالے جانے کا باعث ہے' چاہے دوسرے امور میں ہو۔ علاوہ ازایں اپنے آپ کو نقصان پہنچانا جیسا کہ شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے بھی فرمایا ہے''عقلی

اور عقلائی قبح کا حامل ہے۔''

لہٰذا ہماری نظر میں سخت سینہ کوبی، جس سے انسان کو نقصان پہنچے، خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے حرام ہونے کے اعتبار سے حرام ہے، قطع نظر اِسکے کہ اِس قسم کا عمل عاشورا کے مراسم میں انجام دیا جاتا ہو۔ ہم عزاداری کے مراسم کی اِن کے تمام حزن انگیز پروگراموں کے ساتھ انعقاد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ شریعت کے اصولوں سے ہم آہنگ اور مطابق ہوں۔

امام حسینؑ کا دسترخوان

سوال: ایامِ عاشورا میں جن دسترخوانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، کیا وہ شعائر کی تعظیم کے عنوان سے ہیں؟

جواب: یہ عمل اہلِ بیت علیہم السلام اور امام حسین علیہ السلام سے اظہارِ محبت کا ایک ذریعہ ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے نام پر جس دسترخوان کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہ اجتماعی و معاشرتی افادیت کا حامل ہے۔ یعنی لوگ امام حسین علیہ السلام اور اُن کی مصیبت کی یاد میں اکھٹے ہوتے ہیں اور اُن کے نام پر اجتماعی ماحول میں مثلاً کھانے کے دسترخوان پر مل بیٹھتے ہیں اور اِس طرح ساتھ مل بیٹھ کر دوسرے اہم مسائل پر گفتگو کے ساتھ ساتھ امام حسین علیہ السلام کے انقلاب سے تجدید عہد کرتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کے نام پر دسترخوان کا اہتمام ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جو لوگوں میں شہید کربلاؑ سے محبت کو زندہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اسکے اخراجات راہِ خدا میں حسین ابن علیؑ کے نام پر ہوتے ہیں۔ البتہ ہم اِس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اِن دسترخوانوں میں غربا کو بھی مدعو کیا جائے، جنہیں عموماً ایسی غذائیں دستیاب نہیں ہوتیں۔

جلوسِ عزا

سوال: کیا ایامِ عزا میں نکلنے والے جلوس اور ماتمی دستے، عاشورا کی یاد زندہ رکھنے کا ایک قابلِ قبول طریقہ ہیں؟

جواب: ہم ایامِ عزا میں جلوسِ عزا اور ماتمی دستے نکالنے پر تاکید کرتے ہیں۔ کیونکہ اِس میں مرد، عورت، پیر و جواں، غرض لوگوں کی ہر صنف سے تعلق رکھنے والے افراد از خود حصہ لیتے ہیں۔ اور اِس انداز سے چلتے ہیں گویا اس راہ پر گامزن ہوں جس کی نشاندہی امام حسینؑ نے اپنے پیروکاروں کیلئے کی ہے۔

البتہ ہم پسند کرتے ہیں کہ یہ ماتمی دستے صرف اور صرف عاشورا کی مصیبت اور اُسکے غم انگیز پہلو کی جانب متوجہ نہ رہیں اور جہاں سیاسی حالات عاشورا کے سیاسی پہلوؤں کو پیش کرنے کیلئے سازگار نہیں وہاں کم از کم عاشورا کے معاشرتی اور اخلاقی پہلو کو مدنظر رکھیں، اُسے بیان کریں۔ ہاں، عاشورا کے سیاسی پہلو کو بھی ماضی اور تاریخ کی گفتگو کو حال سے جوڑتے ہوئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ لوگ حال اور مستقبل کی ایک جیسی صورتحال کو محسوس کریں۔

ہماری خواہش ہے کہ یہ گرانقدر رسوم جو اہلِ بیتؑ کی محبت کے عمومی اور عوامی ہونے کی علامت ہیں، اِنہیں اہلِ بیتؑ کے فضائل اور اُن کی اجتماعی اور سیاسی تعلیمات کے عام کرنے کیلئے ایک منظم کوشش ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اِسی طرح اُن کے امر کا احیا کیا جا سکتا ہے۔ عزاداری صرف ایک جذباتی مظہر ہے جسے سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی پہلوؤں کا پیامبر ہونا چاہیئے۔ حتیٰ مناسب ہوگا کہ جذباتی اور حزن و اندوہ پر مشتمل مضمون کے بیان کے طریقوں پر بھی نظرثانی کی جائے۔ کیونکہ اب بھی مجالسِ عزا اور ماتمی نوحوں میں رائج بہت سے مضامین میں اُن موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے جن کا ہمارے زمانے سے کوئی تعلق نہیں اور جو واقعۂ کربلا کے بارے میں ہمارے بزرگوں کے جذبات و احساسات اور اُن کے

اظہارِ غم واندوہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جبکہ آج کربلا کے ذکر کو جاویداں بنانے کیلئے غم و اندوہ کے اظہار اور جذباتی مضمون کے بیان کے دوسرے طریقے موجود ہیں۔

خطابت کا مواد اور انداز

سوال: کیا لوگوں کے جذبات واحساسات ابھارنے کیلئے مصنوعی اندازِ بیان اور غیر حقیقی جذباتی پن سے استفادہ جائز ہے؟ اسی طرح کیا ایسی روایات سے استفادہ جائز ہے جن کی صحت مشکوک ہے لیکن وہ لوگوں کے جذبات واحساسات میں ہیجان بپا کر دیتی ہیں اور اُنہیں سن کر لوگوں کے اشک رواں ہو جاتے ہیں؟

جواب: ہم سمجھتے ہیں کہ حسین ابن علیؑ کی سیرت بیان کرنے والے خطیبوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ خطابت کیلئے کافی علم اور شعور کے مالک ہوں۔ کیونکہ اسی طرح وہ اِس ماہرانہ انداز سے واقعۂ کربلا کو پیش کر پائیں گے کہ اِس المناک واقعے کے حقیقی عناصر اُن کی خطابت میں نظر آنے لگیں۔ یوں وہ اِس واقعے کے مخفی گوشوں کی جانب سامعین کے شعور واحساس کو متوجہ کر سکیں گے۔ خطابت کے اس انداز اور تصویر کشی کے اِس فن سے استفادے کی وجہ سے انہیں غلط احادیث اور شریعت کے برخلاف اعمال کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

البتہ وہ روایات جن کا اعتبار ثابت نہیں، اُن سے لوگوں کے جذبات واحساسات ابھارنے کیلئے استفادے میں اِس صورت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جب وہ حسینی اقدام کی روح اور اسلامی تعلیمات سے ٹکراؤ نہ رکھتی ہوں اور بیان کرنے والا انہیں ایک منقول روایت کے طور پر بیان کرے۔ لیکن یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم ایسی ضعیف روایات سے استفادہ کریں جو امام حسینؑ کو ایک بے صبرا، خوفزدہ، بدحال، کمزور اور اپنے دشمنوں سے مدد کا طلبگار شخص ظاہر کریں، یا حضرت زینبؑ کو ایک خستہ حال، ناتواں، اپنے موقف میں متزلزل اور اپنی راہ میں غیر ثابت قدم ہستی کے بطور پیش کریں۔ اگر ہم اِن مسائل کو مدنظر رکھیں تو پھر روایات نقل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے غم واندوہ کے پہلو کو پیش کرنا' اِس پر اشک بہانا اور رنج والم کا اظہار کرنا بذاتہ مطلوب نہیں ہے۔ ہر چند اِن امور کے مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دراصل اُن لوگوں کے خلاف ہمارے احساسات ابھارنے کا ذریعہ ہیں جن کے ہاتھوں یہ مصائب واقع ہوئے ہیں۔ تاکہ ہم اُن کے خلاف موقف اختیار کریں اور یہ موضوع ہماری زندگی اور ہمارے اعمال اور سرگرمیوں پر اثر انداز ہو' ظالموں کے خلاف ہمارے مخالفانہ موقف کی تجدید ہو اور عاشورا کی رسوم اِس بات کا باعث بنیں کہ ہم آج اُن لوگوں کے خلاف جدوجہد پر کمربستہ ہو جائیں جو اسلام اور مسلمانوں کیلئے مسائل ومشکلات اور مصیبتیں پیدا کر رہے ہیں اور حق' اہلِ حق اور کمزور ولاچار افراد کے خلاف جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

اِس طرح امام حسینؑ کی مصیبت تمام انسانی مصائب' بالخصوص اسلامی دنیا کی مصیبتوں سے بڑی مصیبت کے عنوان سے دیکھی جائے گی اور ظلم وستم کے خلاف سید الشہداؑ کی جدوجہد کا طریقۂ کار ہر قوم کیلئے مشعلِ راہ بن جائے گا۔

لہٰذا خطیبوں کو چاہئے کہ وہ مصائب کو مقصد کیلئے پیش کریں اور امام حسینؑ کا تعارف ایک ایسے رہبر ورہنما کے بطور کرائیں جس نے اپنے عظیم الشان مقصد کی خاطر اپنی ہر چیز فدا کر دی اور اِس طرح سامعین کو فکر وشعور' جذبات واحساسات اور جوش وولولے سے معمور فضا میں لے آئیں۔

سوال: ذکرِ حسینؑ کیلئے اجرت لینے کی شرعی بنیاد کیا ہے۔ جبکہ یہ ایک واجب فریضہ ہے؟

جواب: ہمارے خیال میں عام طور پر ذاکرین اور خطیب حضرات کا ذریعۂ معاش یہی ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر وہ کوئی اور کام نہیں کرتے' تو اِسی سے اُن کی گزر اوقات ہوتی ہے۔

کیونکہ اُنہیں سال بھر مطالعے اور مشق کی ضرورت ہے۔ اس بنیاد پر ان کی کیفیت کسی بھی ایسے شخص کی کیفیت جیسی ہوتی ہے جو معاشرے میں ایسے علمی وتعلیمی کاموں میں

مشغول ہوتا ہے جن کی معاشرے کو اپنے رسوم و رواج کی بقا و استحکام کیلئے ضرورت ہوتی ہے۔ عزاداریٔ سید الشہداؑ بھی ایک ایسی گہری جڑوں کی حامل رسم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جو عوام الناس، بالخصوص شیعوں کے درمیان وجود رکھتی ہے۔

اِس بارے میں جو اہم ترین بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خطیب یا مقرر، جس نے اِس عمل کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا ہے، اُسے ایسی عوام زدگی کا شکار نہیں ہونا چاہئے کہ لوگوں کی خوشی و رضایت کے حصول کی خاطر اپنی عظیم ذمے داری سے غافل ہو جائے اور حسینی تحریک کو اُسکی فطری اسلامی روش سے دور اور علیحدہ کر کے پیش کرنے لگے۔ بلکہ اُسے چاہئے کہ وہ اپنے اِس منصب اور اپنی اِس مہارت کو اسلامی روش پر کاربند رہتے ہوئے اِس عظیم ذمے داری کی ادائیگی کا ذریعہ قرار دے، جو تقاضا کرتی ہے کہ حال اور مستقبل پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھنے والے اِس تاریخی واقعے سے، انسانیت کو فیض پہنچایا جائے۔

ہماری رائے میں، اگر خطیب یا مقرر اپنے اِس عمل کے عوض اجرت وصول کرتا ہے، تو شرعی لحاظ سے اِس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر مجلس میں اِسکی کی ہوئی گفتگو اِسکی اسلامی ذمے داری سے ہم آہنگ ہو، اور سامعین کی دینداری میں اضافے کا موجب ہو، تو ایسا خطیب ثواب کا بھی حقدار ہے۔

ہم مجالس کا انعقاد کرنے والوں اور اِن مجالس میں شرکت کرنے والوں سے کہیں گے کہ وہ امام حسینؑ کی شخصیت پر غور و فکر کریں، اور دیکھیں کہ وہ کس طرح سوچتے تھے اور عاشورا کی اقدار و روایات کے بیان میں انہوں نے جو کچھ فرمایا، جو موقف اختیار کئے، جو قربانیاں پیش کیں، جو مصائب برداشت کئے اور جو شعار (نعرے) بلند کئے انہیں ذہن میں تازہ کریں۔ ایسا کرنے پر وہ دیکھیں گے کہ امام حسینؑ کی مصیبت اُن کی کوئی شخصی اور ذاتی مصیبت نہ تھی، آپؑ کی مصیبت اور آپؑ کیلئے باعثِ رنج و الم، دراصل وہ خطرہ تھا جو اسلام کو لاحق تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اِس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے اشکوں، ہمارے احساسات،

ہمارے شعور اور حتیٰ ہمارے جلوسوں اور ماتمی دستوں میں ہمارے جذبات اِس انداز سے موجزن ہوں جن سے ہمارا غم واندوہ ظاہر ہو۔

آپ عزاداری کے مراسم کے انعقاد کیلئے جو کوششیں کرتے ہیں' اِس راہ میں جو مال و دولت خرچ کرتے ہیں اور اِس عمل کیلئے جو وقت دیتے ہیں' اُسے ضائع اور رائیگاں نہیں جانا چاہئے اور اِسکا واحد اثر لوگوں کے چند آنسو بہانا نہیں ہونا چاہئے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ لوگ گریہ وزاری' اشک و آہ میں ایسے غرق ہو جائیں کہ اصل مسئلہ اُن کی نظروں سے اوجھل رہے' وہ اُسکی حقیقت جاننے سے قاصر رہیں۔

عاشورا کو آنکھوں میں اشک' دل میں حزن و ملال اور فکر میں پیغام کا سبب ہونا چاہئے۔ اِسے حریت و آزادی کیلئے انقلاب اور عزت و شرف کیلئے حرکت و عمل کا باعث ہونا چاہئے۔ عاشورا ہمیں درس دیتا ہے کہ ہم نہ ہی ظالموں کے ہاتھ میں ہاتھ دیں اور نہ کم ہمت لوگوں کی مانند راہِ فرار اختیار کریں۔

عاشورا کا انعقاد اِس طرح کریں جیسے امام جعفر صادق علیہ السلام نے تاکید کی ہے کہ: احیوا امرنا رحم اللہ من احیاء امرنا... (ہمارے امر کو زندہ کرو' خدا اُس شخص پر رحم کرے جو ہمارے امر کا احیا کرتا ہے)

ایامِ عاشورا میں یہ بات ہمارے ذہن نشین رہنی چاہئے کہ حسینؑ تمام انبیاؑ کے وارث ہیں۔ آپؑ آدمؑ' نوحؑ' ابراہیمؑ' موسیٰؑ' عیسیٰؑ اور محمدؐ کے وارث ہیں۔ ہم انہیں مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ: اَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتَ الزَّکٰوةَ وَاَمَرْتَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَیْتَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اَطَعْتَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ حَتّٰی اٰتَیٰکَ الْیَقِیْنُ (ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز قائم کی' زکات ادا کی ہے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور اِس انداز سے خدا کی مخلصانہ عبادت کی کہ درجۂ یقین پر پہنچ گئے۔ زیاتِ وارثہ سے اقتباس)

یہ وہ تعلیمات ہیں جو ہمیں حسینؑ سے وابستہ کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ مجالسِ

عزائے حسینؑ کو نماز کے قیام، زکات کی ادائیگی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور یقین و معرفتِ الٰہی کیلئے خدا کی عبادت کی خاطر منعقد کریں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ان تمام الٰہی تعلیمات کے رواج کیلئے کوشش کریں جن کی ترویج کیلئے حسینؑ کوشاں تھے۔ تاکہ ہمیں نئی زندگی ملے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ خطیبوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے خطاب کو ایسا آنسو سمجھیں جو پیغام کی گہرائی کے ساتھ ہے، ایسا پیغام سمجھیں جو گہری حرکت اور عمل کے ہمراہ ہے، اور ایسی عقل خیال کریں جو جذبات کے ہمگام ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ایسے خطیبوں اور مقررین کی حوصلہ افزائی اور حمایت (Sup port) کریں تاکہ حسینی پیغام اپنے دوش پر اٹھانے والی موجودہ نسل مزید سرافراز و کامران ہو، اور اُس روایتی نسل سے مختلف ہو جس کی پیشِ نظر عظیم حسینی اہداف نہیں ہیں۔

سوال: اِن مناسبتوں میں نئی روح پھونکنے کی خاطر اِن میں جدّت پیدا کرنے اور اِنہیں اِن سے مطلوب مقاصد سے نزدیک کرنے کیلئے کیا آپ کے پاس کچھ تجاویز ہیں؟

جواب: ہم معتقد ہیں کہ یہ مناسبتیں ہماری پوری تاریخ، الٰہی اقدار کے فروغ کیلئے ہماری جدوجہد اور مستقبل کے بارے میں ہماری تمناؤں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ مناسبتیں فکری، معنوی اور عملی مفاہیم کی حامل ہیں۔ لیکن ان مفاہیم کو لازماً حیثیت اور شان دی جانی چاہیے۔ اِن مضامین کو بیان کرنے والے ذرائع ووسائل ہونے چاہئیں۔

اِس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ابلاغ و بیان کے ذرائع زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کسی زمانے میں ایک خاص انداز، ایک معین طریقہ مفید ہو، جبکہ یہی طریقہ دوسرے زمانے میں بے سود و بے فائدہ، اور کبھی کسی زمانے میں ترقی یافتہ شمار ہوتا ہو اور کسی دوسرے زمانے میں فرسودہ۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ بیان وابلاغ کے اُن عصری ذرائع سے استفادہ کریں، اُن وسائل سے کام لیں جو اسلامی تعلیمات اور شریعت سے غیر ہم آہنگ نہ ہوں۔ تاکہ اِس ذریعے سے اپنے زمانے کی

زبان اور انداز واطوار کے ساتھ لوگوں سے گفتگو کریں۔ہمیں چاہئے کہ معاشرے کے تمام طبقات کو تیار کریں اور اپنی نسلوں کو اسلامی اقدار' اسلامی انقلاب اور انسانیت کے روشن مستقبل کیلئے جدوجہد سے جوڑنے کا امکان فراہم کریں۔

زیارت

سوال: زیارت عوام الناس کے درمیان رائج ایک اہم رسم ہے۔ معنوی اور اجتماعی لحاظ سے اِس کا پیغام اور اہمیت ومقام کیا ہے؟

جواب: ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری زیارت کی قدر و قیمت' اِس مقدس تاریخی شخصیت کے بارے میں ہماری معرفت کے مساوی ہوتی ہے جس کی ہم زیارت کرتے ہیں۔ جب ہم مرقدِ مطہر کے سامنے کھڑے ہوں تو ہمیں صرف ضریح پر اپنی نظریں نہیں گاڑے رکھنا چاہئیں' اور نہ ہی ہمیں صرف ظاہری فضا میں گم ہو کے رہ جانا چاہئے۔ بلکہ ہمیں چاہئے کہ ہم اس شخصیت کی فکر' اسکے عزائم' خدا کے بارے میں اسکے اخلاص' امت کیلئے اسکی خیر خواہی' اسکے فنا فی اللہ ہونے اور انسانی معاشرے کیلئے اسکے لائحۂ عمل اور منصوبوں کے بارے میں سوچیں' ان مسائل پر غور وفکر کریں۔

ہمیں زیارت کے دوران روایتی طریقوں پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم صرف مرقدِ مطہر اور اُس ہستی میں گم ہو کے رہ جائیں۔ بلکہ ہمیں اِن اقدار' اصولوں اور افکار ونظریات پر غور وفکر کرنا چاہئے جن کی وہ ہستی حامل اور جن پر وہ عمل پیرا تھی۔ تاکہ اِس طرح ہم اسکی زندگی میں' اسکی تحریک میں' اسکی عبادت میں اور خدا اور امتِ اسلامیہ کیلئے اسکے اخلاص میں اسکے ہمراہ ہو سکیں' اسکی تاسی کر سکیں۔

اِسی صورت میں زیارت زائر کیلئے مفید اور فیض رساں ہوگی جب وہ اِن عظیم معنی و مفاہیم کا ادراک حاصل کرے جو انسانی حیات میں اسکے حال اور مستقبل پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ہمیں چاہئے کہ ہماری زیارت ایسی ہو جو ہمیں زندگی عطا کرے، مثبت اور تعمیری اثرات کی حامل ہو، محض رسمی اور تقلیدی نہ ہو۔

اِسی طرح ہم اِس بات کی جانب اشارہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ منقول زیارت کے وثوق اور اُس کی سند وغیرہ کے مسئلے کو بھی اہمیت دی جانی چاہئے۔ اور دیکھنا چاہئے کہ وہ روایات سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔

زیارت کی قدر و قیمت اِس بات سے وابستہ ہے کہ مزور ہستی سے متعلق معنی و مفاہیم، اسکے افکار و تعلیمات زائر کے نفس میں کس حد تک جگہ بناتے ہیں۔

سوال: آج کل کی عزاداری میں رائج طریقوں، جیسے مرثیہ و نوحہ خوانی وغیرہ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ہماری رائے میں ان عوامی آداب و رسوم کی ترویج کی جانی چاہئے اور انہیں باقی رہنا چاہئے جو عوام الناس کے دلوں کو ولایت اہلِ بیتؑ سے جوڑنے کا وسیلہ ہیں اور جو انہیں امام حسین علیہ السلام کی تحریک سے شعوری وابستگی اور انقلابِ حسینی کے کلی خطوط کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام الناس کے پاس اپنے غم و اندوہ اور جذبات و احساسات کے اظہار کے یہ ایسے طریقے ہیں، جن کے اثرات بعض اوقات جدید اور ترقی یافتہ ذرائع سے زیادہ ہوتے ہیں۔

لیکن اِن عوامی رسوم کو باقی رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل اِس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ یہ انسانوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور انسانی افکار میں جنم لینے والے تغیرات سے کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ اور جدید عناصر اور رسوم کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ بعض امور اپنے حلال یا حرام ہونے سے قطع نظر گزشتہ ادوار میں تاثیر کی انتہائی گہری قوت کے حامل تھے۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بے اثر ہو گئے ہیں اور مستقبل کے انسان کیلئے اِن کی کوئی تاثیر نہیں رہی ہے۔ کیونکہ اِن امور کا تعلق جمود کا شکار میراث سے ہے اور یہ اپنے

تہذیبی، ذہنی اور زمانی دائرے سے باہر کسی معنی و مفہوم کے حامل نہیں رہے ہیں۔

سوال: بعض علاقوں میں عزاداری کے مراسم کے دوران کاروان کی شکل میں شبیہ خوانی، حضرت قاسمؑ کی شادی، یا روزِ عاشورا کے مکمل واقعات کی نمائش کی جاتی ہے، جس کے دوران کچھ افراد امام حسینؑ کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: سب سے پہلے اِس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ جن چیزوں کو پیش کیا جارہا ہے، وہ تاریخی لحاظ سے کس درجے صحت کی حامل ہیں۔ کیونکہ کسی ایسی تاریخی چیز پر زور دینا جو حقیقت نہیں رکھتی، یا جس کی کوئی اطمینان بخش تاریخی سند موجود نہیں، ہمیں فکری مشکلات اور پیچیدگیوں کا شکار کر دیتی ہے اور حسینی سیرت کے درخشاں چہرے کو دھندلا دیتی ہے۔

مثلاً حضرت قاسمؑ کی شادی کا مسئلہ کسی قسم کی تاریخی بنیاد کا حامل نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اِسے وضع کیا ہے انہوں نے عرب معاشرے کی سماجی رسوم میں موجود جذباتی کیفیت سے استفادہ کیا ہے، جہاں چچا زاد بھائی اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کرتا ہے۔ اور اِس بات کے پیشِ نظر کہ حضرت قاسمؑ اور امام حسینؑ کی ایک صاحبزادی نوجوان اور شادی کی عمر کے قریب تھے، عربوں کے خیالات اور تصورات اِن دونوں کی جانب مرکوز ہو جاتے ہیں اور جوانی کی آرزوئیں اِس انداز سے سامنے آتی ہیں کہ انسان اپنے آپ سے کہتا ہے کہ یہ جوان جو اپنی چچازاد سے شادی کا منتظر تھا یا وہ دوشیزہ جو اپنے چچازاد سے شادی کی خواہشمند تھی، قاسمؑ کی شہادت کے نتیجے میں اسکی یہ تمنا خاک ہوگئی اور اس شہادت سے رونما ہونے والی مصیبت جذباتی حزن و ملال کو بھی ابھار دیتی ہے۔

ممکن ہے ایسی تمثیلات جو کسی تاریخی بنیاد کی حامل نہیں ہیں، وہ جذبات کو ابھارنے اور عوامی احساسات کو رُخ دینے کے لحاظ سے مثبت اثرات رکھتی ہوں۔ لیکن اِس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ عمل ایک مصنوعی اقدام ہے، جو تاریخی حقیقت کو بیان نہیں کرتا۔ ہم اِس قسم کی رسوم کے اُن کی نمائشی شکل میں جاری رکھنے کے بارے میں منفی موقف نہیں رکھتے۔

لیکن انہیں عوام الناس کے شعور میں ایک تاریخی حقیقت کے طور پر نہیں بیٹھ جانا چاہئے۔

اسی طرح ہم ایسی شبیہ خوانی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے جس میں مختلف افراد حضرت علی اکبرؑ، حضرت قاسمؑ یا دوسرے بچوں کا کردار ادا کرتے ہیں، تا کہ عاشورا کے تاریخی واقعے کو ذہنی حالت سے باہر نکال کر ایک حسی حالت میں تبدیل کریں، جو انسانی جذبات پر صرف ذہنی تصور سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم اِن مراسم میں طبل زنی کو بھی حرام نہیں سمجھتے۔ کیونکہ طبل سے جو آواز نکلتی ہے وہ جنگ کے موقع پر بجائے جانے والے طبل کی سی ہوتی ہے اور لہوانگیز ہونے کی بجائے لوگوں میں جوش وخروش پیدا کرتی ہے۔ ہم نے پہلے ہی کہا ہے کہ ہر وہ موسیقی یا لحن جو حیوانی خواہشات کو بھڑکانے والا نہ ہو اور جس پر ''الحان اھل الفسوق'' کا عنوان صادق نہ آتا ہو، وہ شرعاً جائز ہے۔

۱۵

عقائد سے متعلق مسائل

عقائد سے متعلق مسائل

عصمت کے بارے میں ہمارا موقف

سوال: بعض افراد کا کہنا ہے کہ عصمت کے موضوع پر آپ کا نظریہ مشہور کے خلاف ہے۔ کیا آپ ہمارے لئے اِس موضوع کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

جواب: حقیقت یہ ہے کہ ہم عصمت کے بارے میں کوئی منفی رائے نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ عصمت کے استدلال پر ہمارا انداز اِس بارے میں دوسروں کے استدلال کے طریقے سے کہیں زیادہ درست اور گہرا ہے۔

عصمت کے بارے میں علمائے قدیم کا استدلال یہ ہے کہ کیونکہ غیر معصوم کو لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں ہوتا' لوگ اسے قبول نہیں کرتے' اسکی بات نہیں مانتے' لہٰذا اگر پیغمبر یا امام معصوم نہ ہوں تو اپنا کردار ادا نہیں کر سکیں گے۔ اِس استدلال کی رو سے عصمت کا تعلق لوگوں کے امور کی اصلاح سے ہے۔ کیونکہ لوگ کسی ایسے شخص کی پیروی نہیں کرتے جس پر انہیں اعتماد نہ ہو اور اگر خدا غیر معصوم پیغمبر بھیجتا' یا پیغمبر خدا کے حکم سے غیر معصوم امام کا تعین کرتے' تو لوگوں کو اُن پر اعتماد نہ ہوتا اور اسکے نتیجے میں نبوت و

امامت کا کوئی اثر نہ رہتا۔

ہمارے خیال میں اِس استدلال پر تنقید وتبصرے کی گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ عقل کہتی ہے کہ عصمت کے اِس پہلو پر صرف تبلیغ کے رُخ سے توجہ دی گئی ہے۔ اسلئے کہ یہ کوئی مشکل امر نہیں کہ خدا کسی پیغمبر کو بھیجے یا کسی امام کو منتخب کرے اور سیدھی و سچی راہ، علم اور جن امور کی تبلیغ کیلئے اُسے مامور کیا گیا ہے اُن پر اسکی توجہ میں اسکی ثابت قدمی اور استقامت کی حفاظت نہ کر سکے۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ جب لوگ خدا کی طرف سے ماموراور مقرر کئے گئے افراد میں بھول چوک، غفلت اور اُن کی جانب سے کلامِ الٰہی میں تحریف کا امکان محسوس کریں گے، تو اُن پر اعتماد نہیں کریں گے اور اُنہیں اِس بات پر بھی یقین نہیں رہے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ من جانب اللہ ہے۔ اِس طرح رسالت پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا اور لوگوں کے ایمان اور اُن کی ہدایت کا سلسلہ بے معنی ہو کے رہ جائے گا۔

رہی بات دوسرے جوانب میں عصمت کی، مثلاً بالفرض اگر پیغمبر یا امام اپنی زندگی کے امور میں غلطی کا شکار ہو، یا بعض عام اور معمول کے امور میں بھول چوک کرے، یا نماز میں سہو کرے، تو عقل اِن امور میں غلطی اور بھول چوک کے امکان کو مسترد نہیں کرتی۔ حتیٰ بعض شیعہ فقہا جیسے شیخ صدوقؒ اور اُن کے والد اور استاد کی رائے یہ ہے کہ ائمہؑ سے سہو اور بھول چوک کا انکار، غلو کی پہلی علامت ہے۔ بعض معاصر علما، جیسے آقائی خوئیؒ کی رائے بھی یہ ہے کہ کارِ تبلیغ کے علاوہ دوسرے امور میں پیغمبر یا امام سے بھول چوک (سہو) ناممکن نہیں ہے۔ ہاں، صرف تبلیغ میں بھول چوک کا امکان نہیں۔

اِس بنیاد پر عقل یہ فیصلہ نہیں دیتی کہ نبی یا امام کو (کارِ رسالت کے علاوہ) دوسرے امور میں عصمت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح پیغمبر یا امام اگر کسی ایسی خطا کے مرتکب ہو جائیں جس کا تعلق خدا کی طرف سے اُن کے فرضِ منصبی (duty) اور بنیادی مسائل سے نہ ہو، تب بھی وہ لوگوں کے اعتماد سے محروم نہیں ہوتے۔ ہم روزمرہ زندگی

میں دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے دینی، سیاسی اور اجتماعی امور میں ایسے لوگوں سے مربوط ہوتے ہیں اور غیر معمولی حد تک اُن کے معتقد ہوتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے بھی ہیں کہ وہ لوگ دوسرے معاملات میں غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں، یا جن امور میں وہ اُن کی پیروی کرتے ہیں، اُن میں بھی غیر ارادی طور پر غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب اُن کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے، تو اُس پر جمے نہیں رہتے بلکہ اُسے ترک کر دیتے ہیں۔ اسکے باوجود اِن لوگوں کا اُن پر سے اعتماد ختم نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ علمائے قدیم کا استدلال عقیدۂ عصمت پر عقلی بنیاد نہیں بن سکتا۔ بالخصوص اگر ہم تبلیغ اور تبلیغ کے علاوہ دوسرے تمام امور کو عصمت میں شامل سمجھیں۔

ہم نے نبوت کی ماہیت جاننے کی کوشش کی ہے، البتہ نہیں معلوم کہ یہ کوشش فکری اعتبار سے کس قدر درست ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ذمے داری محض نامہ رسانی نہیں ہے، جس طرح ڈاکیہ (postman) لوگوں تک صرف ان کے خط پہنچاتا ہے اور بس، اِس کے علاوہ اِن سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ بلکہ ہم تو کلامِ الٰہی میں پڑھتے ہیں کہ: **هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ** (اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا، جو اُنہی میں سے تھا کہ اُن کے سامنے آیات کی تلاوت کرے اور اُن کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور اُنہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ اگرچہ یہ لوگ بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔ سورۂ جمعہ ۶۲۔ آیت ۲)۔ اسی طرح ہم پڑھتے ہیں کہ: **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا** (اے پیغمبر! ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا اور خدا کی طرف اس کی اجازت سے دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴۵، ۴۶)۔ لہٰذا پیغمبر لوگوں کو بشارت

دینے والے اور اُنہیں عذابِ آخرت سے خبردار کرنے والے کے علاوہ لوگوں پر گواہ بھی ہیں اور ایسے چراغ کی مانند ہیں جو لوگوں کو روشنی فراہم کرتا ہے۔

واضح ہے کہ پیغمبر لوگوں کیلئے حق کا دروازہ ہیں اور اُن کا منصب لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرنا اور حق کی بنیاد پر اُن کے امور کی اصلاح کرنا ہے' اور قدرتی بات ہے کہ ایک ایسا انسان جس کا کام حق کی بنیاد پر دنیا میں انقلاب لانا ہے' اُسکے بارے میں یہ امکان نہیں پایا جاتا کہ اُسکی عقل' اُسکے قلب اور اُسکے عمل میں کوئی باطل شے جگہ بنا سکے۔ ایک ایسا انسان جو لوگوں کیلئے ہدایت کا روشن چراغ بن کر آیا ہے' اُسکے فکر و خیال' عقل و احساس اور اُسکی سرگرمیوں میں کسی تاریک گوشے کی موجودگی کا امکان نہیں۔

نبوت ایک ایسے نور کی مانند ہے جو انسانوں کی عقل' اُن کے قلب اور اُن کی زندگی کو منور کرتا ہے۔ بالخصوص جس کتاب کے حامل رسولِ کریمؐ ہیں' اُسے خداوند عالم نے نور کا نام دیا ہے' اور پیغمبر کو اِس کتاب (قرآن) کا جیتا جاگتا نمونہ قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلام قرآنِ صامت کے ہمراہ قرآنِ ناطق ہیں۔

جب ہم یہ سمجھتے ہوں کہ پیغمبر کا فریضہ اور اُن کی اہم ذمے داری حق کی بنیاد پر دنیا میں ایک انقلاب بپا کرنا ہے' تو ہمارے اِس فہم و تصور کا لازمہ یہ ہے کہ ہم پیغمبر کو مجسم حق سمجھیں' اور اِس بات کا عقیدہ رکھیں کہ اُن کی شخصیت میں کسی باطل اور ذرا سی بھی تاریکی کی گنجائش نہیں ہے۔

امامت ختمِ نبوت کے بعد نبی کے فرائض کو جاری رکھنے کا نام ہے' نبی کے بغیر نبوت کا تسلسل ہے: یا علی انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی من بعدی (اے علی! تم کو میری نسبت سے وہی منزلت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ کی نسبت سے حاصل تھی' ماسوا اِسکے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔ لہٰذا امام کا کام شریعت کی پاسداری ہے۔ امام ایک ایسا انسان ہے جو یہ بات جانتا ہے کہ انسانوں کی فکر و عمل' قول و فعل میں حق کو مستحکم کرنے کی غرض سے انسانی معاشرے میں نبوت کی راہ کو

جاری رکھنا اُسکا فریضہ ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اُسے اِس حوالے سے بالکل پیغمبر ہی کی طرح معصوم ہونا چاہئے۔

کارِ تبلیغ اور تبلیغ کے علاوہ دوسرے امور میں عصمت کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنے ائمہ کو دُہری شخصیت کا مالک نہیں سمجھنا چاہئے۔ ایسا انسان جو تبلیغ کے معاملے میں بھول چوک، لغزش و خطا کا شکار نہیں ہوتا وہ یقیناً دوسرے معاملات میں بھی بھول چوک اور لغزش و خطا سے محفوظ ہوگا اور جو تبلیغِ دین اور شریعت کے مسائل میں حق کی اساس پر چلتا ہو، وہ دوسرے مسائل و معاملات میں بھی حق کا پیرو ہوگا۔ کیونکہ حق پسندی اور عصمت اُسکی شخصیت میں رچ بس گئے ہیں، اُسکی ذات کا حصہ بن گئے ہیں۔

عصمت پر اعتراضات کے جواب

اِس مقام پر یہ اعتراض سامنے آتا ہے کہ جب عصمت ایسی غیر معمولی شکل میں ہو، تو بجز خاص افراد کے دوسرے انسانوں کیلئے اسکا حصول ممکن نہیں۔ یعنی اگر یہ ہستیاں ہر قسم کی خطا و لغزش کے ارتکاب سے محفوظ ہوں، تو لازم ہے کہ اِن پر خدا کا خاص فیض ہو، جو انہیں خطا اور لغزش کے ارتکاب سے روک دیتا ہو۔ لہٰذا بعض لوگ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عصمت کے متعلق اِس طرح کے عقیدے میں جبر کی بو آتی ہے۔

کچھ لوگوں نے گہرے اور علمی انداز میں یہ اعتراض کیا ہے۔ ہم ان کے اعتراضات پیش کرتے ہوئے اُن کے جواب دیتے ہیں:

اولاً: اِن لوگوں کی رائے میں عصمت کا (تمام امور میں) ہمیشہ اور مستقل ہونا ثواب کو لغو و بے معنی کر دیتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص اپنی عصمت کی وجہ سے نیک عمل انجام دیتا ہے، تو دراصل اِس میں اُسکی اپنی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پس پھر کس بنیاد پر وہ ثواب کا حقدار قرار پائے گا؟ لہٰذا عصمت کا یہ تصور ثواب کو لغو اور بے معنی کر دیتا ہے۔

اِس اعتراض پر ہمارا جواب یہ ہے کہ علمائے علمِ کلام، اِس بات کے قائل ہیں کہ

ایک باایمان اور صالح انسان اپنے نیک اعمال کی بنیاد پر ثواب کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُسکا عمل، اُسکی عقل، جس کے ذریعے اس نے سوچ بچار کیا اور اُسکے ذریعے دوسروں کی رہنمائی کی اور وہ اعضا جن کی مدد سے اُس نے خدا کی عبادت کی اور جنہیں اُس نے عملِ صالح کی انجام دہی کیلئے استعمال کیا، وہ سب کے سب خدا کی ملکیت ہیں، انسان کی ہر شے صرف اور صرف خدا سے تعلق رکھتی ہے، صرف اور صرف خدا کی عطا کردہ ہے۔ لہٰذا وہ ثواب کا مستحق نہیں۔ انسان کا عمل، سوچ اور اُسکی مساعی سب کی سب خدا کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا علمائے علمِ کلام کہتے ہیں کہ خدا کا لطف و کرم، انسان کو ثواب کا مستحق بناتا ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر لطف کیا ہے اور بندے جو اعمال اپنے اختیار اور ارادے سے انجام دیتے ہیں، اُن پر اُن کیلئے ثواب قرار دیا ہے۔

اس بنیاد پر ہمارا کہنا ہے کہ کیا مانع ہے اگر خدا اِس مسئلے میں سے کچھ شرائط کو کم کر دے اور انسان کے اختیار و ارادے سے کی جانے والی عملی جدوجہد سے ربط دیئے بغیر اُن اسباب کی بنیاد پر جو انبیا کے انتخاب اور اُن مصلحتوں کی بنا پر جو رسالتِ الٰہی سے تعلق رکھتی ہیں اپنے فضل و کرم کے عنوان سے انسان کو ثواب عطا کرے؟ یہ امر محالات اور ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

ثانیاً: بعض اوقات کچھ لوگوں کی طرف سے اس بارے میں ایک اور سوال اٹھایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ: اگر خداوند عالم کسی شخص کو ہر لحاظ سے گناہ اور خطا سے محفوظ رکھے، تو دوسرے انسانوں پر اُسے کیا فضیلت حاصل ہے؟ ممکن ہے دوسرے لوگ اِس سے افضل ہوں؟ لہٰذا معصوم کو دوسروں پر کوئی فوقیت نہیں۔ کیونکہ خدا نے اُسے گناہوں سے محفوظ رکھا ہے، جبکہ دوسرے لوگوں کو گناہ سے محفوظ نہیں رکھا۔ پس اِسکی عصمت دوسروں پر اِسکی برتری اور فوقیت کا سبب نہیں بن سکتی۔

اس پر ہمارا جواب یہ ہے کہ لطف و کرم اللہ کی طرف سے ہے، خدا نے فضل عطا کیا ہے، خدا ہے جو قدر و قیمت سے نوازتا ہے، خدا ہے جو انسانوں کے درمیان سے انبیا کا

انتخاب کرتا ہے اور فرشتوں کے درمیان سے اپنے پیغام رساں چُنتا ہے۔ لہٰذا معصوم انسان کی فضیلت اور برتری یہ ہے کہ خدا نے اُسے چُنا ہے اور اُسے عصمت عطا کی ہے۔ اور خدا کے اِس انتخاب اور چُناؤ میں یقیناً کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔

لیکن اِس چُناؤ کی حکمت کیا ہے؟ اور خدا نے کیوں اِسے منتخب کیا ہے اور کیوں کسی دوسرے کا انتخاب نہیں کیا ہے؟ اِسکے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ: **لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ** (وہ اپنے افعال کا جوابدہ نہیں ہے، جبکہ اوروں سے باز پرس ہوگی۔ سورۂ انبیا ۲۱۔ آیت ۲۳) اِس کے انتخاب میں لازماً کوئی حکمت ہوتی ہے، چاہے اِس انتخاب کی حکمت یہ ہو کہ معصومین لوگوں کے درمیان ایک مشعل کی طرح روشنی بکھیریں، بالکل اُسی طرح جیسے اُس نے سورج کو خلق کیا ہے اور اُسے لوگوں کو روشنی فراہم کرنے والا ایک نور قرار دیا ہے۔ سورج خدا کا لطف وعنایت ہے، چاند بھی خدا کا لطف و کرم ہے اور کائنات کے بہت سے مظاہر خدا کا تفضّل، لطف اور رحمت ہیں۔

لیکن یہ تفضّل اور الطاف، خدا کی عطا ہیں۔ معصوم کیلئے خدا کا فضل عصمت کی وہ صلاحیت ہے جو خدا نے اُسے عطا کی ہے اور اُسے اُسکے لئے منتخب کیا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ ہی یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان کی قدر و قیمت، شان اور رتبے کا سبب خود انسان کی ذات میں موجود ہو۔ بلکہ قدر و قیمت، شان اور رتبہ خدا سے وابستہ ہے۔ وہ کسی انسان کی ذات میں ایسے اسرار قرار دیتا ہے جو اُسے بلند مرتبہ اور عالی شان بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح جیسے حسن و زیبائی فضلِ خدا ہے اور انسان خود اسے اپنے اندر پیدا نہیں کرتا۔ خدا نے انسان کو احسنِ تقویم (بہترین اعتدال) میں خلق کیا ہے اور اسے جانوروں پر برتری دی ہے۔ یہ برتری بھی خود انسان کے ارادے اور اختیار سے اُسے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ فضل و برتری عطا کرنا خدا کی خاص و ممتاز صفت ہے۔

ثالثاً : اعتراض کیا جاتا ہے کہ عصمت کی صورت میں معصومینؑ کا نمونۂ عمل، رہنما اور مقتدا کا کردار بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ

خدا نے کچھ لوگوں کو معصوم خلق فرمایا ہے' تو وہ کہتے ہیں کہ معصوم کے مرتبے تک پہنچنا تو ہمارے لئے ممکن نہیں' لہٰذا ہم کیوں اُن کی پیروی اور اقتدا کریں۔

یہ ایک کمزور استدلال ہے۔ کیونکہ جس عمل کی پیروی کی جائے' اُسکا نیک ہونا اور لوگوں کا اُسکی سنجیدہ اور مقدور بھر پیروی کرنا کافی ہے۔ کسی کو نمونۂ عمل کے بطور قبول کرنے کیلئے ضروری نہیں ہے کہ نمونۂ عمل اور اُسکے پیروکار کی سطح لازماً یکساں ہو۔ لوگ علما کی اقتدا کرتے ہیں اور علما علم و فضل میں ایک بلند درجے کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر اسوۂ عمل کی پیروی میں یہ بات مقصود قرار دے دی جائے کہ انسان جس کی اقتدا کر رہا ہے خود اُسکے مساوی ہو' تو کوئی انسان دوسرے انسان کو نمونۂ عمل قرار نہیں دے سکے گا۔

ٹھیک ہے کہ اگر پیغمبر معجزہ دکھاتے ہیں تو ہم یہ معجزہ رونما نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم اِس بات کے قائل ہیں کہ پیغمبر ایک ایسی قوت و صلاحیت کے حامل ہیں جو ہمیں میسر نہیں' یہ کام اُن کی قدرت کے دائرے میں ہے' ہم اُن کی اقتدا کرتے ہوئے اسے انجام نہیں دے سکتے۔

یہاں جس نکتے پر تاکید ضروری نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ معصوم خود اپنے عزم و ارادے سے خدا کی اطاعت کے راستے پر چلتے ہیں اور اگر وہ خدا کی نافرمانی کرنا چاہیں اور اُسکے لئے حالات بھی فراہم ہوں' تو خدا اُنہیں اِس عمل سے محفوظ رکھتا ہے' وہ اِس عمل سے باز رکھنے والے ایسے عوامل پیدا کر دیتا ہے' جو اُنہیں ارتکابِ گناہ سے بچائے رکھتے ہیں۔

اِسکے باوجود عصمت کے قطعی ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ معصوم اختیار اور ارادے کی قدرت نہیں رکھتا۔ وہ گناہ کر سکتا ہے' لیکن جوں ہی اُس کا جھکاؤ اپنی ذات میں موجود انسانی کمزوریوں کی جانب ہوتا ہے' تو خداوند عالم مداخلت کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت نے فرمایا ہے کہ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (اور یقیناً اس عورت نے ان سے برائی کا ارادہ کیا اور وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۲۴)' یا جس طرح حضرت یوسفؑ نے

کہا: قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ ۚ وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ (یوسف نے کہا کہ پروردگار یہ قید مجھے اس کام سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے دعوت دے رہے ہیں۔ اور اگر تو ان کے مکر کو میری طرف سے موڑ نہ دے گا' تو میں ان کی طرف مائل ہوسکتا ہوں اور میرا شمار بھی جاہلوں میں ہوسکتا ہے۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۳۳)

خداوند عالم معصوم کو داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں سے عصمت عطا کرتا ہے۔ اِس بنیاد پر عصمت کی قطعیت اُن سے ارادے و اختیار کا عنصر سلب نہیں کرتی۔ کیونکہ قطعیت صرف گناہ سے باز رکھنے والے پہلو میں ہے' اطاعت کے پہلو میں نہیں۔ معصوم خدا کے بارے میں اپنے پورے ایمان' کامل معرفت اور اپنے مکمل ارادے اور اختیار کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ لیکن جب کبھی اِسکے باطن میں کمزور انسانی پہلو سر اٹھاتے ہیں' تو خداوند عالم اسکی حفاظت فرماتا ہے۔ یہ محافظت دو صورتوں سے ممکن ہے۔ یا تو اُسکے اندر کوئی چیز پیدا کردیتا ہے جس کی بنا پر وہ ارتکابِ گناہ سے باز رہتا ہے' یا کوئی ایسا حادثہ وجود میں لے آتا ہے جو اُسے خطا سے بچالیتا ہے' اور اِس طرح معصوم خود اپنے ارادے اور اختیار سے ارتکابِ گناہ اور خطا سے باز رہتا ہے۔ معصوم ہمیشہ معصوم ہے' یعنی وہ ہمیشہ خدا کی حفاظت اور اُسکی تائید کے زیرِسایہ رہتا ہے۔

عصمت کے بارے میں ہماری پیش کردہ یہ تشریح شیعوں کے درمیان مشہور اِس عقیدے سے زیادہ مطابق اور ہم آہنگ ہے کہ معصوم بعثت سے پہلے بھی معصوم ہوتا ہے اور امام منصبِ امامت پر فائز ہونے سے پہلے بھی صاحبِ عصمت ہوتا ہے۔ یہی شیعوں کے درمیان مشہور عقیدہ ہے۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر عصمت ایک ذاتاً اختیاری حالت ہے' تو کوئی انسان اپنے بچپنے کے آغاز ہی سے کیسے معصوم ہوسکتا ہے؟

اِس سوال کے جواب میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خداوند عالم اُنہیں علم کا ایک

ایسا درجہ عطا کرتا ہے جس کی مدد سے وہ معصیت اور گناہ کی طرف یکسر مائل ہی نہیں ہوتے۔ بالکل اِسی طرح جیسے بعض اعمال اکثر لوگوں کی نظر میں اِس قدر ناپسندیدہ ہوتے ہیں کہ حتیٰ کوئی اُن کے ارتکاب کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاتا۔ جیسے اپنے محرموں مثلاً ماں بہن وغیرہ وغیرہ کے ساتھ جنسی تعلق کے قیام سے گریز نفسیاتی طور پر انسان میں موجود ہوتا ہے۔ انسان کا اِس فعل کو انتہائی حد تک ناپسندیدہ سمجھنا اُسے اِس پر عمل سے باز رکھتا ہے۔ عصمت کا معاملہ بھی اِسی کی مانند ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے معصوم کو ایک ایسا علم دیا ہے، کہ جب بھی وہ علم اُسکی عقل، قلب، احساس اور شعور پر اپنا نور بکھیرتا ہے اُسے ارتکابِ گناہ سے باز رکھتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ براہِ راست یا بالواسطہ صورت میں عصمت (خدا کا کسی کو ایسی چیز عطا کر دینا جو اسے معصیت سے محفوظ رکھے) کی ہمیشگی اور قطعیت کے درمیان کیا فرق ہے؟ یعنی ہر حال میں عصمت قطعی اور ہمیشہ ہے اور یہ ایک خدائی عطیہ ہے، جو معصوم کو اختیاری یا غیر اختیاری صورت میں گناہ سے باز رکھتا ہے۔ لیکن اِسکے باوجود عصمت کا مسئلہ بنیادی طور پر اختیاری نہیں ہے۔ یعنی خدا نے جو علم، قدرت اور صلاحیت معصوم کو عطا کی ہے، اگر وہ کسی دوسرے انسان کو دیدے تو وہ بھی گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اِس بنیاد پر ہم فی الحال اِس بات پر زور تو نہیں دیتے، لیکن اِس کے معتقد ہیں کہ شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ کہ پیغمبر اور امام کا معصوم ہونا واجب ہے، انسان کے اپنے افعال میں اختیار اور ارادے کے مالک ہونے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ البتہ بعض لوگ امکانِ ذاتی اور امکانِ وقوعی کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ فرق کسی چیز کو نہیں بدلتا۔ کیونکہ ہر ایسا امر جو امکانِ ذاتی (ذاتی طور پر وقوع کا امکان) رکھتا ہے، اُس میں ہر موقع پر امتناعِ وقوعی (جس کا وقوع پذیر ہونا محال ہو) پایا جاتا ہے۔ صرف خاص امر اور محدود اختیاری حالت میں نہیں بلکہ اِسکا امتناع تمام امور میں جاری ہے۔

لہٰذا امکانِ ذاتی اور امکانِ وقوعی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ جو چیز واقع

ہونے کے اعتبار سے امتناع رکھتی ہے' اُسکا امکانِ ذاتی کسی اہمیت کا حامل نہیں۔ کیونکہ یہ صرف ایک خیالی امر ہو جائے گا جو انسان کے عالمِ اختیار اور حقیقت و واقعیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

لہٰذا ہماری دانست میں شیعی عقائد میں عصمت کے اختیاری ہونے' یا اُسکے حتمی ہونے کی بحث کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ چاہے ہم عصمت کے اختیاری ہونے کا عقیدہ رکھیں' چاہے نہ رکھیں' کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال عصمت کے موضوع پر شیعہ امامیہ عقیدہ اِس بات کو ضروری قرار دیتا ہے کہ ہم پیغمبر اور امام کی عصمت پر عقیدہ رکھیں۔

رہی یہ بات کہ عصمت کس طرح وجود میں آتی ہے؟ لطفِ الٰہی جسکے بارے میں کچھ لوگوں نے گفتگو کی ہے' وہ کیا ہے؟ خداوند عالم نے معصوم کو جو علم عطا کیا ہے' اُسکی تاثیر کیا ہے؟ یہ باتیں اصل مسئلے سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہم پیغمبرؐ اور امامؑ کے فرائض و ذمے داریوں کے بارے میں جو فہم رکھتے ہیں اُسکے مطابق اِس بات کے معتقد ہیں کہ اِن دونوں کو تمام امور میں معصوم ہونا چاہیے' چاہے وہ امورِ تبلیغ سے تعلق رکھتے ہوں' چاہے اُن کا تعلق اجتماعی میدان میں فکری کاموں سے ہو۔

حضرت فاطمہؑ کی عصمت

سوال: یہ بات مدنظر رکھتے ہوئے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ نہ پیغمبر ہیں' نہ امام اُن کی عصمت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہم حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی عصمت کے قائل ہیں اور اِس بارے میں ہمارے پاس تین دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل: اگر ہم ولادت سے وفات تک حضرت فاطمہؑ کی پوری زندگی کا مطالعہ کریں' تو ہمیں آپؑ کی فکر' کلام اور عمل میں کوئی خطا دکھائی نہیں دیتی اور ہم آپؑ کی

پوری حیات کو مجسم عصمت پاتے ہیں۔

دوسری دلیل: آپؑ کا شمار اہلِ بیتؑ میں ہوتا ہے یعنی وہ ہستیاں جنہیں خدا نے ہر قسم کی آلودگی اور نجاست سے دور رکھا ہے۔ آپؑ دوسرے اہلِ بیتؑ کی مانند آیۂ تطہیر میں شامل ہیں: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ (پس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہل بیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جیسا پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۳) اِس آیت میں جو اہلِ بیتؑ شامل ہیں وہ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہیں، آیۂ تطہیر اِن ہستیوں کی عصمت پر دلیل ہے۔

تیسری دلیل: مشہور حدیث کے مطابق فاطمہ زہراؑ سیدۃ النساء العالمین ہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ رسولِ کریمؐ کی طرف سے کسی ایسی خاتون کو دنیا بھر کی عورتوں کی سردار قرار دیا جائے جس کی عقل، جس کی سوچ اور جس کا عمل مجسم حق نہ ہو۔

سوال: کیا مکلّف لوگوں پر عصمت کا عقیدہ رکھنا واجب ہے؟ ایسے اعتقادی مسائل جن پر عقیدہ ایک مکلّف فرد پر واجب ہے، اُن کی حدود اور دائرہ کیا ہے؟

جواب: ایسے عقائد جن پر اعتقاد سے انسان مسلمان ہوتا ہے اور جن سے انکار کے نتیجے میں (قرآنی اصطلاح میں کفر کے معنی کے اعتبار سے) وہ کافر ہو جاتا ہے، یہ ہیں: خدائے واحد پر ایمان، انبیائے الٰہی پر ایمان، آسمانی کتب پر ایمان اور روزِ قیامت پر ایمان۔

ایسا شخص جو اِن تمام امور پر اعتقاد رکھتا ہے، وہ مسلمان ہے اور جو کوئی اِن میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کرے، وہ کافر ہے۔

رہے دوسرے امور، جیسے امامت و خلافت، پیغمبر اور امام کی عصمت وغیرہ، تو یہ وہ امور ہیں جو کفر اور اسلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً ایک ایسا انسان جو صرف کارِ تبلیغ کے

دوران پیغمبر کی عصمت کا قائل ہے اور دوسرے امور میں عصمت کا معتقد نہیں' وہ بھی مسلمان ہے۔ ہمارے بہت سے علما جو دورانِ نماز یا اور دوسرے امور میں پیغمبر کی بھول چوک کے قائل تھے' اُن کا مکمل احترام کیا جاتا تھا اور اب بھی وہ قابلِ احترام ہیں۔ علاوہ ازایں ہم غیر شیعہ مسلمان کو کافر نہیں سمجھتے' وہ بھی مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی طرح حقوق و فرائض رکھتے ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جن نکات پر اختلاف پایا جاتا ہے' وہ اُن کے بارے میں ایک دوسرے کو خطا کار ٹھہراتے ہیں۔ شیعہ معتقد ہیں کہ امامت یا نبوت کے بارے میں اُن کے عقائد کی جزیات ایسے قطعی دلائل کی بنیاد پر قائم ہیں جن میں (ہمارے نکتۂ نظر سے) کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ سنت بھی معتقد ہیں کہ کسی چیز کا نظری ہونا اور اُس کا اسلام اور کفر کے اصولوں میں دخیل نہ ہونا ایک بات ہے' اور اُس کا حق و باطل ہونا دوسری بات۔ یعنی یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

کبھی کبھی انسان کسی چیز کے بارے میں نظری اعتبار سے یقین اور قطعیت تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اسکے اس یقین اور قطعیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے بھی لازماً اس امر پر یقین رکھیں اور اسے قطعی سمجھیں۔ ہر چند وہ اس بات کا معتقد ہو کہ دوسروں نے اس یقین کے عناصر کی طرف دھیان نہیں دیا ہے' ان پر توجہ نہیں کی ہے' انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ جیسے کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ: وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (ان لوگوں نے ظلم اور غرور کے جذبات کی بنا پر انکار کر دیا تھا' ورنہ ان کے دل کو تو بالکل یقین تھا۔ سورۂ نمل ۲۷۔ آیت ۱۴)

سوال: کیا امامت اور عصمت جیسے امور کا انکار' ضروریات دین کا انکار نہیں ہے؟

جواب: بعض ضروریاتِ دین' بدیہیاتِ دین میں سے ہیں' جن کے انکار کا مطلب پیغمبر کو جھٹلانا ہے۔ نماز اور روزے جیسے امور کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف

نہیں پایا جاتا۔ لیکن نماز کس طرح پڑھی جائے، کارِ تبلیغ کے سوا دوسرے معاملات میں پیغمبر کو معصوم ماننا یا نہ ماننا اور اسی طرح کے دوسرے امور اپنی حقیقت کے اعتبار سے بدیہی حد تک ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہیں، چاہے ان کا معتقد بدیہیات کی طرح ان کا پابند ہو۔ مثلاً اسی بنیاد پر ہم اشاعرہ کو کافر نہیں سمجھتے جو جبر کے معتقد اور حسن و قبح عقلی کے منکر ہیں۔ اِن کے عقیدتی طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ انہیں خطا کار یا گمراہ مسلمان سمجھ سکتے ہیں۔

لہٰذا ضروریاتِ دین اور غیر ضروریاتِ دین کے انکار کے درمیان فرق ہے۔ ضروریاتِ دین سے مراد وہ بدیہی امر ہے جو مسلمانوں کے درمیان فطری طور پر بغیر کسی استدلال کی ضرورت کے خود بخود ثابت ہے۔ جیسے نماز، روزے، حج اور زکات کا واجب ہونا۔ رہی اِن عبادات کی جزیات و تفصیلات کی بات، تو ان میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے اور ان کیلئے استدلال کی ضرورت ہے۔ جس چیز کے بارے میں بھی اُسکی حقیقت کے اعتبار سے اور اُسکی حقیقی صورتحال کی بنیاد پر لوگ اختلاف کریں اور اُسے ثبوت کیلئے استدلال کی ضرورت ہو، وہ ایک نظری امر ہے اور کسی نظری امر کا انکار پیغمبر کی تکذیب اور انہیں جھٹلانے کا باعث نہیں ہوتا، جو موجبِ کفر ہے۔ کیونکہ ضروریاتِ دین کا انکار، اِس لحاظ سے کہ اِسکا لازمی نتیجہ پیغمبر کو جھٹلانا اور اُن کی تکذیب ہے، کفر کا موجب ہے۔

لہٰذا جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو گیا ہو، اُسکے کفر کا حکم لگانے سے پہلے اِس بات کا یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ وہ اِس لازمی نتیجے کی جانب متوجہ تھا، یا نہیں۔

ائمہ علیہم السلام کا کردار

سوال: فکری و سیاسی رہنمائی، رہبری اور امامت کا جو کردار ائمہؑ کے سپرد کیا گیا ہے، آپ کی نظر میں وہ کیا ہے؟

جواب: اسلامی اصول وقواعد کی بنیاد رکھنا' اسلامی تعلیمات ومفاہیم کو انحراف سے محفوظ رکھنا اور ارفع واعلیٰ مقاصد کے حصول کیلئے اسلامی معاشرے کی رہبری وقیادت ائمہؑ کا کردار (role) ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسکا ذکر امیر المومنینؑ نے اِن الفاظ میں کیا ہے کہ:

اللھم انک تعلم انہ لم یکن الذی کان منّا منا فسۃً فی سلطانٍ ولاالتماس شی ء من فضول الحطام' ولکن لنرد المعالم من دینک ونُظھر الاصلاح فی بلادک فیامن المظلومون من عبادک و تُقام المَعطَّلة من حدودک (بارِالٰہا! تو جانتا ہے کہ جو کچھ ہم نے انجام دیا وہ طاقت وحکمرانی کے حصول کی جانب ہماری شدید رغبت کی وجہ سے نہ تھا' اور نہ ہی دنیا کے ناچیز سرمائے کی طلب میں تھا۔ بلکہ (یہ سب کچھ) اسلئے تھا کہ تیرے دین کی نشانیاں (جو مٹ چکی تھیں) انہیں لوٹایا جائے اور تیرے شہروں میں امن و بہبودی کی صورت پیدا کی جائے' تاکہ اسکے نتیجے میں تیرے ستم رسیدہ بندے امان پائیں اور تو نے جو حدود واحکام معین کئے ہیں اور جنہیں معطل اور فراموش کردیا گیا ہے' اُن کا قیام ونفاذ ہو۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۲۹)

امامِ حق وہدایت نے ایک اور مقام پر فرمایا ہے کہ: **اماوالذی فلق الحبۃ و برا النسمۃ 'لولاحضور الحاضر وقیام الحجۃ بوجود الناصر' وما اخذاللہ علی العلماء الّا یقاروا علیٰ کظۃ ظالم ولا سَغب مظلوم 'لالقیتُ حبلھا علیٰ غاربھا' ولسقیت آخر ھا بکاس اوّلھا' ولا لفیتم دنیاکم ھذہ ازھد عندی من عفطۃ عنز** (دیکھو! اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں' اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مددگاروں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علما سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پُری اور مظلوم کی بھوک دیکھ کر سکون وقرار سے نہیں بیٹھیں گے' تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا' اور اس کے آخر کو بھی اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اسکے اوّل کو سیراب کیا تھا اور تم اپنی دنیا کو

میری نظر میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ بے وقعت پاتے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳)

ایک دوسری جگہ آپؑ نے فرمایا: ولیس امری وامرکم واحداً' انی اریدکم للہ وانتم تریدوننی لا نفسکم (اور میرا اور تمہارا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ میں تمہیں اللہ کیلئے چاہتا ہوں اور تم مجھے اپنے ذاتی فوائد کیلئے چاہتے ہو۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۳۴)

اِسی طرح آپؑ نے فرمایا: واللہ لاسلمن ماسلمت امور المسلمین' ولم یکن فیھا جورٌ الّا علی خاصة (خدا کی قسم! جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم ونسق برقرار رہے گا اور صرف میری ہی ذات ظلم و جور کا نشانہ بنتی رہے گی میں خاموشی اختیار کرتا رہوں گا۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۷۲)

ائمۂ اہلِ بیتؑ اسلام کے رہنما و قائد ہیں۔ لہٰذا لوگوں سے چاہتے ہیں کہ وہ صرف اُن کی ذات سے محبت کی بنیاد پر اُن کی پیروی نہ کریں۔ جیسا کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا: احبونا حبَّ الاسلام (اسلام کی محبت میں ہم سے محبت کرو۔ بحارالانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۷۳۔ ح ۵۸۔ باب ۵)

امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی جابرؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یا جابر! ایکتفی من ینتحل التشیع ان یقول بحبنا اھل البیت؟ فواللہ ما شیعتنا الّا من اتقیٰ اللہ واطاعہ' وما کانوا یعرفون یا جابر الّا بالتواضع' والتخشع' والامانة' وکثر ذکر اللہ' والصوم' والصلاة' والبر بالوالدین' والتعھد للجیرانٌ من الفقراء واھل المسکنة وللغارمین والایتام' وصدق الحدیث' وتلاوة القرآن' وکف الالسن عن الناس الّا من خیر' وکانوا امناء عشائرھم فی الاشیاء (اے جابر! کیا کسی شیعہ کیلئے ہم اہلِ بیت سے محض اظہارِ محبت کرنا کافی ہے؟ خدا کی قسم ہمارا شیعہ نہیں بجز اُس کے جو پرہیز گار اور خدا کا مطیع و فرمانبردار ہو' اور جو اپنی انکساری' خشوع' امانتداری' روزے' نماز' والدین کے

ساتھ حسنِ سلوک، مفلس ہمسایوں، مسکینوں، قلاش اور یتیموں کی مدد و اعانت، راستگوئی، تلاوتِ قرآن اور نازیبا گفتگو سے زبان کی حفاظت کی وجہ سے لوگوں میں پہچانے جاتے ہیں اور ایسے ہی لوگ معاملات وامور میں اپنی ملت کے امین ہیں۔ بحارالانوار۔ ج ۴۶۔ ص ۴۳۔ ح ۵۸۔ باب ۵)

یہی اہلِ بیتؑ کا مسلک ہے کہ: رضی اللہ رضانا اھل البیت (خدا کی رضاو خوشنودی ہم اہلِ بیت کی رضاو خوشنودی کا باعث ہے)۔ اہلِ بیتؑ خدا کی خوشنودی پر خوش ہوتے ہیں اور جس چیز سے خدا ناراض وغضبناک ہوتا ہے، اُس سے ناراض اور غضبناک ہوتے ہیں۔ لہٰذا شیعیت اسلام سے ہٹ کر کچھ اور نہیں ہے۔

ہمارے ائمہؑ کی گفتار، اُن کے کردار اور اُن کے موقف سے رسولِ خداؐ کی گفتار، اُن کے کردار اور اُن کے موقف کی عکاسی ہوتی تھی۔ اُن کے اعمال کی اساس اسلام تھی اور انہوں نے اسلام میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں کی۔ کیونکہ وہ ہر اچھے بُرے حال میں اِس امانت کے امانتدار ہیں، رسالت مآبؐ کے بعد لوگوں پر خدا کی حجت ہیں، اُن کی امت میں اُن کے خلیفہ ہیں، اللہ کی زمین پر اُسکے امانتدار ہیں۔ اور وہ خدا اور اُسکے رسول کی ایسی معرفت اور اُس سے ایسا تعلق رکھتے ہیں جس کا تذکرہ رسولِ مقبولؐ نے واقعۂ خیبر کے موقع پر ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ: لاعطین الرایة غداً رجلاً یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ (کل میں علم اُس شخص کے حوالے کروں گا جو خدا اور اُسکے رسول سے محبت کرتا ہے، اور خدا اور اسکا رسول اُس سے محبت کرتے ہیں۔ بحارالانوار۔ ج ۲۱۔ ص ۳۔ باب ۲۲)۔ اور تمام ائمہؑ اِس صفت کے حامل ہیں۔

شیعیت اور مذہبِ جعفری

سوال: آپ کا کہنا ہے کہ (شیعہ امامیہ کے عقیدے کے مطابق) مذہبِ جعفری کو شیعیت سے نسبت دینا کوئی خاص درست بات نہیں ہے۔ آپ اپنی اِس رائے کی تفسیر کس طرح

کریں گے؟

جواب: آپ جانتے ہیں کہ اہلِ سنت کے چار مذاہب ہیں، جن کے نام شافعی، حنبلی، مالکی اور حنفی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ مذہبِ تشیع، مذہبِ جعفری ہے۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے ائمہ معصومینؑ دوسرے مجتہدین کی مانند مجتہد نہیں ہیں۔ اسلئے کہ مثلاً ابوحنیفہ (حتیٰ اپنے پیروکاروں کی نظر میں بھی) خطا بھی کرتے ہیں اور اُن کی بات درست بھی ہوتی ہے۔ اِسی طرح ابن حنبل اور دوسرے مجتہدین جن کی اہلِ سنت تقلید کرتے ہیں، ویسے ہی ہیں جیسے شیعوں کے یہاں آقائے خوئیؒ اور آقائے خمینیؒ جن کی وہ تقلید کرتے ہیں۔

اہلِ سنت کے مذاہبِ اربعہ کے ائمہ کو جو لوگ مجتہد سمجھتے ہیں، وہ اُن کی تقلید کرتے ہیں۔ جبکہ ہم جو ائمہ اہلِ بیتؑ کی پیروی کرتے ہیں، اُسکا سبب یہ ہے کہ ہم اُن کی عصمت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی خطا کے مرتکب نہیں ہوتے۔ یوں ہمارے ائمہؑ صاحبِ مذہب نہیں ہیں۔ مذہبِ ابوحنیفہ ایک نکتۂ نظر کا نام ہے جس میں خطا وصواب کا امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن مذہبِ امام صادقؑ کی حیثیت کسی نکتۂ نظر کی سی نہیں ہے جس میں خطا وصواب کا امکان ہو بلکہ یہ ہمیشہ صواب ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: حدیثی، حدیث ابی، وحدیث ابی حدیث جدی، وحدیث جدی حدیث الحسین وحدیث الحسین حدیث الحسن، وحدیث الحسن حدیث امیر المؤمنین، وحدیث امیر المؤمنین حدیث رسول اللّٰہ، وحدیث رسول عن قول اللّٰہ عزّوجلّ (میرا کلام میرے والد کا کلام ہے، میرے والد کا فرمایا ہوا میرے دادا کا کلام ہے، میرے دادا کا کلام حسین کا کلام ہے، حسین کا کلام حسن کا کلام ہے، حسن کا کلام امیر المومنین کا کلام ہے، امیر المومنین علی کا کلام رسول اللہ کا کلام ہے اور رسول اللہ کا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ بحارالانوار۔ ج ۲۔ ص ۱۷۸۔ روایت ۲۸۔ باب ۲۳)

لہٰذا جب ہم کسی مسئلے کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا کلام سنتے ہیں،

تو گویا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام سنتے ہیں، جس میں لغزش اور خطا کا کوئی امکان نہیں۔

مذہبِ شیعہ کوئی اجتہادی مذہب نہیں ہے، جس میں اہلِ سنت کے مذاہب کی مانند خطا و صواب کا امکان پایا جائے۔ بلکہ مذہب اسلام ہے، جس میں: **لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ** (سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل اِسکے قریب آ ہی نہیں سکتا۔ سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۴۲)

ہم اپنی گفتگو میں گاہ بگاہ ''**الائمة رواة**'' (یعنی ائمہ راوی ہیں) کی جو اصطلاح استعمال کرتے ہیں، اُس سے مراد (جیسا کہ ''علامہ سید محمد نقی الحکیم'' نے اپنی کتاب ''الاصول العامة للفقه المقارن'' میں بھی کہا ہے) یہ نہیں ہے کہ ائمہؑ دوسرے راویانِ حدیث کی مانند حدیث کے ناقل ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے کلام کو ہمیشہ کلامِ رسولؐ سے مستند کرتے ہیں اور چاہے روایت کی صورت میں اور چاہے عام استناد کی شکل میں، اُنہوں نے اپنی طرف سے کوئی بھی ایسی چیز بیان نہیں کی ہے جو رسول اللہؐ کے کلام کے برخلاف ہو۔

انہوں نے اپنے نظریات اسلام کے اصل پاک و پاکیزہ سرچشمے سے حاصل کئے ہیں، اسکے سوا، ان کی فکر کا کوئی اور منبع و ماخذ نہیں ہے، اور انہوں نے کوئی اجتہاد نہیں کیا ہے، جس میں خطا یا صواب کا امکان و احتمال پایا جائے۔

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جانشین کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کا کس طرح تقرر فرمایا ہے؟ کیا یہ صرف نامزدگی تھی، جیسا کہ بعض لوگوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، یا آنحضرتؐ نے خدا کے حکم سے حضرت علیؑ کو خلافت کیلئے معین کیا تھا؟

جواب: اِس بارے میں آیۂ قرآن ہے: **یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ**

لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (اے پیغمبر! آپ اِس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا' تو ایسا ہے جیسے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا کہ اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۶۷)

اس آیت کی رو سے ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ نے غدیر کے دن' خدا کے حکم سے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے۔ تفاسیر کے مطابق یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی اور اِسکے معنی یہ ہیں کہ اے رسولؐ! اگر تم نے اِس حکم کا اعلان نہیں کیا جو ہم نے تمہارے اوپر علیؑ کے بارے میں نازل کیا ہے' تو گویا تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔

اِس آیت میں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف انتباہ ہی نہیں کیا جارہا' بلکہ اِس میں انتہائی شدت کے ساتھ اسلام کے محافظ اور رسولِ مقبول کے مکتب کی بقا کے ضامن' سب سے اہل' لائق اور دانا شخص کے طور پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے مسئلے کا اعلان پوشیدہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآنی آیت کے مطابق حضرت علیؑ نفسِ رسولؐ ہیں اور آنحضرت کی حدیث کے مطابق' آپؐ کے بھائی اور جس طرح حضرت موسیٰ کیلئے ہارون تھے' اِسی طرح آپ حضرت محمد کیلئے ہیں۔

اس موقع پر رسولِ مقبولؐ نے مسلمانوں سے فرمایا: الست اولیٰ بکم منکم بانفسکم (کیا میں خود تم سے زیادہ تمہارے نفوس پر اولیٰ نہیں ہوں۔ بحار الانوار۔ ج ۲۱۔ ص ۳۸۷ روایت ۱۰۔ باب ۳۶)۔ یعنی کیا میں خود تم لوگوں سے زیادہ تم پر اختیار نہیں رکھتا۔

مسلمانوں نے جواب دیا: اللھم بلیٰ (خدا جانتا ہے کہ ایسا ہی ہے)

اِسکے بعد آپؐ نے فرمایا: اللھم اشھد' ثم قال: فمن کنت مولاہ فھذا علی مولاہ (بارِالہا! گواہ رہنا۔ پھر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں' یہ علی اسکے مولا ہیں۔

بحارالانوار۔ج۲۱۔ص۳۸۷۔روایت۱۰۔باب۳۶)

ولایت، حاکم کی حاکیت کے عناصر میں سے ایک عنصر ہے، اور خدا نے یہ امر پیغمبر کیلئے قرار دیا ہے۔ یعنی پیغمبرؐ مومنین پر خود اُن سے زیادہ اولیٰ تھے اور آنحضرتؐ نے اِس حق سے استفادہ کرتے ہوئے امرِ ولایت حضرت علیؑ کیلئے قرار دیا۔ پیغمبرؐ کے اِس کلام کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ شخص جس پر میں خود اسکی نسبت اولیٰ ہوں، یہ علیؑ بھی خود اُسکی نسبت اُس پر اولیٰ ہیں۔

بتایئے بھلا یہ نامزدگی ہے یا تعین؟ قطعاً اور یقیناً تعین ہے۔

اِسکے بعد یہ آیت نازل ہوئی: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے، اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۳)

روایت کی گئی ہے کہ (اس موقع پر) رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کیلئے ایک خیمہ نصب کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ وہاں آ کے علیؑ کو مبارکباد دیں۔ حضرت عمر سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: بخ ... بخ لک یا علیٰ، اصبحت مولای و مولیٰ کل مؤمن و مؤمنة (مبارک ہو۔۔۔ مبارک ہو آپ کو اے علی! آج آپ میرے اور تمام مؤمنین و مومنات کے مولیٰ ہوئے ہیں۔ بحارالانوار۔ج۲۱۔ص۳۸۸۔روایت ۱۰۔باب۳۶)

لہٰذا مسئلۂ ولایت قطعاً خدا کے حکم سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تعین تھا۔

حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بیان ہونے والی احادیث کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اِن احادیث کا محور و مرکز عام مسلمانوں کے اذہان میں اِس بات کو جاگزیں کرنا تھا کہ حضرت علی پیغمبر کی طرف سے

مقرر کردہ خلیفہ ہیں۔ یہ مقام آپؑ کو آپؐ کی قابلیت' صلاحیت اور استحقاق کی وجہ سے عطا کیا گیا تھا اور خدا اور اُسکے رسولؐ نے بھی اِسی بنا پر انہیں اِس مقام کیلئے منتخب کیا تھا۔

پیغمبر کیلئے مناسب نہ تھا کہ اسلام کی آئندہ پیشرفت اور بقا سے تعلق رکھنے والے اِس اہم اور حساس مسئلے میں حضرت علیؑ کی صرف نامزدگی پر اکتفا کریں۔ بلکہ آپؐ کے فرائض میں سے تھا کہ مسلمانوں کی آئندہ قیادت کا تعین فرمائیں اور اِس سلسلے میں منصوبہ بندی کریں۔

ضمیمہ (۱)

امریکن یونیورسٹی بیروت لبنان میں میڈیکل کالج کے سربراہ ڈاکٹر عدنان مزدہ کی طرف سے آیت اللہ العظمٰی سید محمد حسین فضل اللہ کی خدمت میں سٹوفکیٹ۔

جنابِ عالی'

السلام علیکم: آپ نے اپنے مکتوب میں جو سوالات اٹھائے تھے' ان کے جواب پیشِ خدمت ہیں:

مسئلہ نمبر ۱: کیا عورت میں بھی مرد کی طرح اور اُسی کی جنس سے تعلق رکھنے والی منی ہوتی ہے' جو جنسی تحریک کے اوج (intencepleasure) کے وقت اُس سے خارج ہوتی ہے؟

جواب: عورت میں مرد کی منی کی جیسی منی نہیں ہوتی۔ جنسی تحریک کے موقع پر عورت سے جو رطوبت خارج ہوتی ہے' وہ رحم (بچہ دانی) کی دیواروں سے رِسنے والا مادّہ ہے' جو محض جنسی تحریک سے خارج ہونے لگتا ہے' اِسکے لئے جماع ضروری نہیں ہے۔ یعنی خود لذتی' یا کوئی لٹریچر پڑھنے' حتیٰ جنسی ہیجان کا باعث بننے والے افکار بھی اِس رطوبت کے اخراج

کا باعث ہو سکتے ہیں۔ یہ رطوبت اُس رطوبت کے مشابہ ہے جو بعض اوقات ایستادگی کے وقت مرد سے خارج ہوتی ہے۔ جب مرد کی جنسی لذت اوج (orgasm) پر پہنچتی ہے، تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اُس سے منی خارج ہوتی ہے۔ جبکہ جب عورت اِس کیفیت میں آتی ہے، تو اُس وقت اُس میں فزیالوجیکل تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، جن میں سے نمایاں ترین تبدیلی عورت کے عضلات میں تناؤ کا پیدا ہو جانا اُس کے دل کی دھڑکنوں کا تیز ہو جانا، جلد میں دورانِ خون بڑھ جانا اور نتیجتاً عورت کی جلد کا سرخ ہو جانا ہے۔

جنسی لذت کے اوج پر پہنچنے کے لحاظ سے عورت اور مرد میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ منی نکلے بغیر مرد کی جنسی تسکین نہیں ہوتی، جبکہ عورت تحریک کے ایک موقع پر عضلات کے تناؤ کی حالت (یعنی لذت کے اوج) پر پہنچے بغیر اکتفا کر لیتی ہے۔ بہت سی عورتیں ایک طویل اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے باوجود کبھی عضلات کے تناؤ کی اِس حالت سے نہیں گزری ہوتیں۔ کانسی سروے (جو ۱۹۵۲ء میں عورتوں اور مردوں کے جنسی رویئے کے بارے میں امریکہ میں کیا گیا تھا اُس) میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ اگر مجامعت کے دوران خوش فعلی نہ ہو، یعنی مجامعت کے دوران عورت کے مخصوص اعضا کو چھیڑا نہ جائے تو ۹۰ فیصد عورتیں لذت کے اوج (orgasm) پر نہیں پہنچ پاتیں۔

مسئلہ نمبر۲: کیا رحم کی نالی (fallopiantube) کو بند کرنا، ہمیشہ کیلئے بانجھ پن کا باعث ہوتا ہے؟ یا اِسے دوبارہ کھولنا ممکن ہے؟

جواب: رحم کی نالی (fallopiantube) کو بند کرنے کے ذریعے عورت کو بانجھ کرنے کا عمل، اُن عورتوں کیلئے انجام دیا جاتا ہے، جنہوں نے حسبِ خواہش اولاد پیدا کر لی ہو، اور حمل کو ٹھہرنے سے روکنے کے دوسرے ذرائع اُن کیلئے کامیاب ثابت نہ

ہوئے ہوں۔ بعض اوقات حمل، ماں یا بچے کیلئے خطرناک دکھائی دیتا ہے، جیسے وہ زچہ جس کے یہاں کئی مرتبہ آپریشن کے ذریعے ولادت ہوئی ہو، یا وہ شوگر یا دل کی مریضہ ہو۔ ایسی صورت میں عورت اور مرد کو رحم کی نالی بند کرنے کے اِس طریقے کو آخری اور ناقابلِ واپسی تدبیر کے عنوان سے قبول کرنا چاہئے۔ البتہ کبھی کبھی خلافِ توقع حالات پیش آجاتے ہیں۔ مثلاً شوہر یا بچہ فوت ہوجاتا ہے، یا عورت طلاق لے لیتی ہے اور چاہتی ہے کہ اِسے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت دوبارہ حاصل ہوجائے۔ ایسے حالات میں نالی کو کھولنے کا امکان ہے۔ لیکن حاصل ہونے والے نتائج بتاتے ہیں کہ ۵۰ سے ۷۰ فیصد تک معاملات میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت دوبارہ حاصل ہوجاتی ہے۔ مرد کی نس کو کھولنے میں بھی تقریباً یہی نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ یعنی ایسے ۷۰ فیصد افراد دوبارہ تولید کی صلاحیت حاصل کرلیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر ۳: حیض کی کم سے کم عمر کیا ہے؟

جواب: لڑکی پہلا حیض دیکھنے سے پہلے جسمانی نشوونما اور تبدیلیوں کے مراحل طے کرتی ہے، جو نسوانی ہارمونز ظاہر ہونے سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں اِن ہارمونز کی خود بخود پیدائش یا اِن کے انجیکٹ کئے جانے کے بعد ظاہر ہوتی ہیں۔ اِن تبدیلیوں کے ایک سال بعد پہلے حیض کا امکان ہوتا ہے، جو عموماً ۹ سال سے ۱۶ سال کے درمیان کی عمر ہوتی ہے۔ اگر لڑکی کی عمر ۱۶ سال ہونے کے بعد بھی حیض نظر نہ آئے، تو ڈاکٹر سے مشورہ ضروری ہے۔ البتہ حیض اور حمل انتہائی کم سنی (مثلاً تین سال کی عمر) میں بھی دیکھا گیا ہے۔ وسیع پیمانے پر کی گئی ایک سی تحقیقات سے بھی ظاہر ہوا ہے کہ گزشتہ پانچ عشروں سے اِس سے پہلے عشروں کی نسبت حیض کے آغاز کی عمر میں کمی واقع ہوئی ہے اور حیض کے بند ہونے (یائسگی) کی عمر میں بھی اِسی تناسب سے کمی ہوئی ہے۔ یہ تبدیلیاں غذائیت کی بہتر صورتحال اور صحت کی اچھی سہولتوں کی فراہمی کا پتا دیتی ہے۔

مسئلہ نمبر۴: عورت کے یائسہ ہونے کی عمر کیا ہے؟

جواب: ماہواری (menses) اوسطاً ۴۹ سے ۵۰ سال کی عمر کے درمیان ختم ہو جاتی ہے۔ ماہواری کے ختم ہونے کی وجہ بیضہ دانی (ovary) کے تمام مواد کا ختم ہو جانا اور اُس سے نسوانی ہارمونز کے رساؤ میں کمی کا واقع ہونا ہے۔ ماہواری نسوانی ہارمونز کے رساؤ کے بغیر ممکن نہیں۔

ماہواری کے مکمل طور پر خاتمے سے پہلے اِس میں بے ترتیبی واقع ہونے لگتی ہے۔ اور عام طور پر اس میں بے قاعدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس بے ترتیبی کی وجہ تخم ریزی کے عمل میں ناکامی اور نتیجے کے طور پر نسوانی ہارمونز کے اخراج میں خلل واقع ہونا ہے۔ عورت کا جسم نسوانی ہارمونز کے ختم ہو جانے کی وجہ سے تبدیلیوں کا شکار ہو جاتا ہے' اِسی کو یائسگی کی عمر کہتے ہیں۔

یہ نام رکھنا علمی لحاظ سے خاص درست اور بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اِس مواد کا خاتمہ بانجھ پن یا یائسگی کا سبب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں اور بہت سے عوامل کا جمع ہو جانا موثر ہے' مثلاً حالاتِ زندگی کی باعث نفسیاتی تغیرات کا واقع ہونا۔

اِس عمر میں بچے شادیاں کرنے کے بعد گھر چھوڑ دیتے ہیں اور عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہ جاتی ہے' جو عام طور پر بہت سے مشاغل اپنا لیتا ہے' گھر سے باہر اسکا میل جول بڑھ جاتا ہے اور اب وہ پہلے کی طرح اپنے گھر کو وقت نہیں دیتا۔ مزید یہ کہ اپنی کبرسنی کی باعث مرد کی جنسی فعالیت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اِس عمر میں عورتیں عام طور پر اپنی اندرونی حدّت کے بھڑکنے کی شکایت کرتی ہیں' جو ہر آدھے گھنٹے بعد گھٹن کے احساس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اِس بیماری کے علاج کی ضرورت ہے۔

ضمیمہ (۲)

امریکن یونیورسٹی بیروت کے شعبۂ جراحتِ نسواں کے سربراہ اور لبنان میں نسوانی جراحت کے ڈاکٹروں کی انجمن کے صدر ڈاکٹر کرم کرم کا جواب۔

سوال: جب عورت کی جنسی لذت اوج (intencepleasure) پر پہنچتی ہے' تو کیا اُس سے منی خارج ہوتی ہے؟

جواب: جب عورت کی جنسی لذت اوج پر پہنچتی ہے' تو اُس سے رطوبت رِستی ہے' منی خارج نہیں ہوتی۔ مایع کا پردے سے گزرنا رساؤ (transudate) کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس (ejaculation) کے عمل میں منی ایک خاص تبدیلی کے بعد جمع ہو کر خارج ہوتی ہے۔

عربی میں ''آمناء'' کے معنی مایع کو اچھالنا اور پھینکنا ہیں۔ یہ عمل اُسوقت واقع ہوتا ہے جب مرد کی منی جاری ہوتی ہے۔ یعنی جب منی خارج ہوتی ہے اور مایع ایک فاصلے پر اچھل کر جاتا ہے۔

عورت میں صرف رطوبت رِستی ہے' اچھل کے فاصلہ طے نہیں کرتی۔ رساؤ کی یہ

حالت پورے جنسی عمل میں جاری رہتی ہے۔ یعنی عورت میں کوئی خاص حالت پیدا نہیں ہوتی، جس میں انزال یا ایک عضو سے کسی دوسری جگہ رطوبت جاتی ہو۔ جو چیز عورت سے خارج ہوتی ہے وہ ایسی رطوبت ہے جسے جنسی تحریک کے آغاز ہی سے بچہ دانی کی دیواریں مسلسل خارج کرتی ہیں اور بعد کے مراحل میں عورت لذت کے اوج (orgasm) پر پہنچ جاتی ہے۔

رطوبت کے خارج ہونے کی مقدار لذت کے اوج (orgasm) کے مرحلے میں پہلے سے بڑھ جاتی ہے، اور بچہ دانی کے اندر اور غدودوں سے بھی کوئی چیز بچہ دانی کے اندر یا اُس سے باہر نہیں ٹپکتی۔

یادداشت

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدو جہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
چھ تقریریں ولایت کے موضوع پر	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکر و نظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فقہ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
مہدئ منتظرؑ قیامِ عدل اور غلبۂ اسلام کی امید	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
حضرت علیؑ کی وصیت	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
کلامِ امام حسینؑ کی چند کرنیں	حجت الاسلام محسن غرویان
نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن وسنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
عبادت و نماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
معنوی آزادی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
سیرتِ نبویؐ ایک مطالعہ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جاذبہ و دافعۂ علیؑ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ائمۂ اہلِ بیتؑ فکری و سیاسی زندگی	رسول جعفریان
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)

دار الثقلین

آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ

فقیہ و مجتہد آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ، ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں شہرِ علم و عرفاں نجف اشرف میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے والدِ گرامی آیت اللہ العظمیٰ سید عبدالرؤف فضل اللہ، آیت اللہ محمود شاہرودی، آیت اللہ شیخ حسین حلی، ملا صدرالبازودی، آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیم اور آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم خوئی کے محضرِ درس سے کسبِ فیض کیا۔

آپ نے نجفِ اشرف میں فکری تربیت اور جدید اندازِ تبلیغ کے سلسلے میں پائے جانے والے خلاء کو محسوس کرتے ہوئے فکری اور تربیتی سرگرمیوں کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ ''جماعت العلماء'' کے مجلّے ''الاضواء'' کا آغاز ہوا تو آپ آیت اللہ العظمیٰ شہید سید محمد باقر الصدرؒ اور آیت اللہ شیخ محمد مہدی شمس الدینؒ کے ہمراہ اس مجلّے کی ادارتی ٹیم میں شامل تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس مجلّے کے پہلے سال اس کا اداریہ ''رسالتنا'' کے عنوان سے آیت اللہ العظمیٰ شہید سید محمد باقر الصدر تحریر فرماتے تھے، پھر دوسرے سال سے مسلسل چھے سال تک ''کلمتنا'' کے عنوان سے اداریہ آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ تحریر کرتے رہے۔

آیت اللہ العظمیٰ شہید سید محمد باقر الصدرؒ اور آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ کی یہ رفاقت، ہمراہی اور ہمکاری فکری، تعلیمی اور تربیتی میدانوں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اجتماعی معاملات میں بھی جاری رہی۔

۱۹۶۶ء میں شیعیانِ لبنان کی ایک کثیر تعداد کے اصرار پر آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ، نجفِ اشرف سے لبنان تشریف لے گئے، اور اس وقت سے آج تک آپ وہاں قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر کئی نسلوں کے نوجوانوں کی تربیت کر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہاں کئی فلاحی منصوبے بھی آپ کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں جن میں متعدد ہسپتال، اسکول اور یتیم خانے شامل ہیں۔

اب تک مختلف موضوعات پر آپ کی ۷۰ سے زائد تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں ۲۵ جلدوں پر مشتمل تفسیر ''من وحی القرآن'' کے علاوہ فقہ کے درسِ خارج پر آپ کی تقریرات پر مبنی ۱۰ کتب بھی شامل ہیں۔

آپ کے دینی، تعلیمی، فکری، تربیتی، سیاسی اور فلاحی کاموں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کا مکمل احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ یہاں ہم صرف اسی قدر کہنے پر اکتفا کریں گے کہ آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ ہمارے دور کے انتہائی مستعد اور فعال مجتہد ہیں۔

آپ کا شمار احیائے اسلام کے لئے سرگرمِ عمل اسلامی تحریکوں کے فکری قائدین میں ہوتا ہے۔ صہیونی ایجنٹ اب تک تین مرتبہ آپ پر قاتلانہ حملے کر چکے ہیں۔ دو مرتبہ یہ حملے مکمل طور پر ناکام رہے جبکہ ۱۹۸۵ء میں کئے جانے والے ایک حملے میں آپ مجروح ہوئے۔